لے سانس بھی آہستہ

(ناول)

مشرف عالم ذوقی

© تبسم فاطمہ

نام کتاب : لے سانس بھی آہستہ (ناول)
مصنف : مشرف عالم ذوقی

پتہ : D-304 تاج انکلیو، گیتا کالونی، دہلی۔ 110031
Ph: 9873757095
Email: zauqui2005@gmail.com

تعداد : 400
کمپوزنگ : سمیع اللہ قنوجی
زیر اہتمام :
مطبع :

ملنے کے پتے

بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ (بہار)
ساشا پبلی کیشن، D-304 تاج انکلیو، گیتا کالونی، دہلی۔ 31

LE SAANS BHI AAHISTA (Novel)
By: ***MUSHARRAF ALAM ZAUQUI***

SASHA PBLICATION
D-304, TAJ ENCLAVE, GEETA COLONY
DELHI-110031

ڈاکٹر محمد حسن

کے

نام

کہ اس صفحہ پر......بس اُنکا......حق ہے......

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کار گہہ شیشہ گری کا

— میر تقی میر

پہلا حصہ

کاردار خاندان کے آثار

"پنجرہ ٹوٹ گیا ہے /

پرندہ اڑ گیا ہے /

یونانی لوک کتھاؤں میں ابراکسس نام کے ایک دیوتا کا ذکر ملتا ہے، جسے سورج کا بیٹا کہا گیا ہے۔ سورج کا بیٹا جو تمام اچھی بری، تاریک اور نورانی طاقتوں کا دیوتا ہے۔ اس کا نچلا حصہ سانپ کا ہے یعنی جو زمین کی نشانی کے طور پر ہے۔ لیکن سر، مرغ کا ہے۔ جسے اُگتے ہوئے سورج کی علامت مانا گیا ہے۔

ابراکسس کے مطابق، جائز اور ناجائز سب ایک برابر ہیں اور ہر شخص کو اپنے حساب سے جھوٹ، سچ، غلط، جائز اور نا جائز کی تعریف کرنی پڑتی ہے۔ قدرت کے نظام کو بھلی اور بری باتوں کے درمیان تقسیم نہیں کیا جاسکتا۔ اور—

ارتقاء کے راستے میں اخلاقیات کا کوئی دخل نہیں۔

– ہرمن ہیسے (ڈیمیان)

●●

"کبھی کبھی قدرت کے آگے /

ہم بیحد کمزور ہو جاتے ہیں /

اور — سپر ڈال دیتے ہیں"

(۱)

''پنجرہ ٹوٹ گیا ہے/
پرندہ اڑ گیا ہے

●●

میں نے کھڑکی کھول لی۔ شاید اس سے زیادہ اس وقت میں کچھ کر بھی نہیں سکتا تھا۔ دسمبر کے آخری دنوں کی شام تیزی سے رات میں تبدیل ہو رہی تھی— کھلی کھڑکی سے ٹھنڈی ہوا کے جھونکے جسم کے ریزے ریزے میں داخل ہو چکے تھے...... آنکھیں پرانی یادوں کے جنگل میں کچھ تلاش کرنے کی ناکام کوشش کر رہی تھیں...... ٹھہر ٹھہر کر آدھا ادھورا ایک چہرہ پلکوں کے آگے آ کر کانپ کر رہ جاتا...... اور یہ وہی لمحہ ہوتا جب شریانوں میں گرم گرم خون کے لاوے اچانک اُبلنا شروع کر دیتے...... میری کوشش تھی کہ اس منظر سے خود کو جتنا چاہے، دور رکھ سکوں— مگر کیا یہ ممکن تھا؟

کیا مجھ سے یہ ممکن ہو سکے گا......؟

فضا سرد تھی۔ سامنے ننگے درختوں کی ایک لمبی قطار...... مرغزاروں کی ہری بھری گھاس جیسے دھند کا لباس پہننے کی تیاری کر رہی تھی۔ اف...... مجھے یاد آیا— صبح دس بجے تک گہری دھند نے مجھے بستر سے اٹھنے نہیں دیا تھا— دسمبر کے آخری دنوں کی یہ ٹھنڈ اب اس بڑھاپے میں مجھے پریشان کرنے لگی ہے— پہلے بھی کرتی تھی۔ لیکن اب زیادہ کرنے لگی ہے۔ اس لیے اب رات ہو یا صبح، پوری طرح اپنا خیال رکھتا ہوں— جیسے، بستر پر ہی اٹھنے کے بعد کے سارے سامان تکیے کے قریب رکھے ہوتے ہیں— سفید شال— جسے بدن پر ڈال لیتا ہوں— گرم موزے۔ رات میں بھی احتیاط کے طور پر باتھ روم یا کمرے میں ٹہلتے ہوئے پاؤں میں یہ موزے ضرور ڈالتا ہوں— اور منکی کیپ— جسے پہنتے ہوئے انسان سے اچانک بندر بن جاتا ہوں— عمر کی اس منزل پر پہنچنے کے

بعد جیسے اب یہ معمولی سی احتیاط بھی میرے لیے ضروری ہوگئی ہے— ٹھنڈ سے جسم کو ہر ممکن بچانے کی کوشش کرتا ہوں— ہاں کبھی کبھی چھوٹی چھوٹی سی بد احتیاطی مجھے پریشان کر جاتی ہے— جیسے تیز تیز کھانسی کا اٹھ جانا— سینے کے پاس تکلیف کا محسوس ہونا— سرد موسم میں اس ڈراؤنے خیال کا حاوی ہونا کہ کہیں بلڈ پریشر ضرورت سے زیادہ نہ بڑھ جائے۔ میرے کئی دوستوں کو اٹیک باتھ روم میں ہی آئے تھے۔ اس لیے خاص کر باتھ روم جاتے وقت پوری طرح خود کو گرم لباس کی قید میں رکھتا......

سورج دھند میں چھپنے کی تیاری کر رہا تھا— درختوں کی نہ ختم ہونے والی قطار پر، چھائی ہوئی دھند نے ماحول کی دلکشی میں چار چاند لگا دیئے تھے— مگر رہ رہ کر وہ چہرہ میرے خیالوں میں برق کی طرح کوندر ہا تھا......

پہلا چہرہ ایک مرد کا تھا۔ ایک بیحد عام سا معصوم سا مرد، جسے کسی بھی گھر میں آرام سے دیکھا جا سکتا ہے۔ اخبار پڑھتا ہوا، آئینہ میں اپنی ٹائی درست کرتا ہوا۔ صبح کے وقت دالان یا گھر کے باہری حصہ میں چہل قدمی کرتا ہوا...... یا بیحد شرافت سے، کسی سے گفتگو کرتا ہوا—

دوسرا چہرہ ایک چھوٹی سی معصوم سی بچی کا تھا۔ بے حد معصوم سی چھوٹی سی بچی کا......

لیکن آخران دونوں چہروں میں ایسا کیا تھا، جو مجھے خوف میں مبتلا کر گئے تھے—؟ ایک ایسے خوف میں کہ دسمبر کے آخری دنوں کی یہ سرد شام میرے پورے وجود میں آگ کے بڑے بڑے انگارے رکھ گئی تھی......

شاید میں جل رہا تھا......

یا پھر شاید میں کانپ رہا تھا......

یا پھر شاید اپنے اس وقت کے احساس کو میں کوئی نام دینے سے قاصر تھا......

دو چہرے— اور قدرت نے ان دونوں چہروں کے تعاون سے ایک ایسی کہانی لکھی تھی، جو شاید اب تک کی دنیا کی سب سے بھیانک کہانی تھی—

یاسب سے بدترین کہانی—

●●

کھلی کھڑکی سے آتی ہوئی سرد ہوا کے جھونکے بدن میں طوفان برپا کررہے تھے۔ یقیناً یہ دروازہ کھلنے کی آہٹ تھی۔ میں جیسے اس ایک لمحے میں خیالوں کی قیامت خیز یا پرفریب دھند سے باہر نکل آیا تھا—

یہ سارہ تھی......سارہ کا کردار......سترہ سال کی میری پوتی۔ جو شاید دیر سے میرے الجھن بھرے چہرے کو دیکھ رہی تھی...... دڈّو اس وقت کھڑکی کے پاس—؟ ماجرا کیا ہے۔ پھر سارہ نے کتنے ہی سوال خود سے کیے ہوں گے۔ کمرے میں آتے ہی سارہ کی نظر سب سے پہلے میز پر رکھے اس لفافے پر گئی، جسے صبح ہی لے کر وہ میرے پاس آئی تھی—سارہ کو حیرت تھی۔ لفافہ اب تک کھولا کیوں نہیں گیا—؟ دڈّو تو خط ملتے ہی سب سے پہلے چاک کر کے اسے پڑھتے ہیں۔ پھر کوئی دوسرا کام کرتے ہیں۔ اس نے لفافہ اٹھایا— غور سے لفافہ کو دیکھا۔ اب وہ پرامید تھی' جیسے دڈّو اور ان کی الجھنوں کا ایک راستہ اس خط سے بھی ہو کر جاتا ہے......لفافہ اس نے دوبارہ میز پر رکھ دیا۔ چلتی ہوئی کھڑکی کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی—

کتنی ٹھنڈ ہے دڈّو......

ہاں......

کھڑکی کیوں کھولی......؟

بس، دل چاہ رہا تھا......

نہیں— کوئی اور بات ہے—

کوئی بات نہیں ہے—

میں نے کہا نا، کوئی اور بات ہے......

کوئی بات نہیں ہے—

کوئی تو بات ضرور ہے دڈو......

اچھا کیا بات ہو سکتی ہے—؟

پہلے تم بتاؤ۔ تم نے وہ خط کیوں نہیں کھولا......؟ سارہ میری آنکھوں میں جھانک رہی ہے۔ ہوا کا ایک سرد جھونکا میرے چہرے سے ٹکرایا...... کھڑکی بند کردی— مجھے احساس تھا، سارہ کی گہری آنکھیں بغور میری طرف دیکھ رہی ہیں...... مگر میں اسے کیا بتاؤں— کیا جواب دوں—

وہ لفافہ کیوں نہیں کھولا؟

خط کیوں نہیں پڑھا—؟

اتنی ہمت نہیں ہے مجھ میں...... وہ دو چہرے— وہی دو چہرے اچانک میری آنکھوں کی پتلیوں پر چھا جاتے ہیں— اور جیسے کسی آسیبی کہانی کا کوئی بیحد خوفناک صفحہ کھل جاتا ہے— لیکن میری بھی کیا غلطی...... میں کہیں نہ کہیں اس بے حد خوفناک اور چونکا دینے والی کہانی کا ایک حصہ رہا ہوں...... سچ، جھوٹ اور اخلاقیات کے وہ صفحے، جو آنکھیں کھولنے کے بعد شاید ہر انسان کا مقدر بن جاتے ہیں— پیدائش کے بعد سے ہی جیسے Ethics، اخلاقیات یا نیتی شاستر کے، ہزاروں سانپوں کے درمیان سے گزرنا پڑتا ہے— گناہ اور ثواب...... جائز اور ناجائز— لیکن جیسا کہ ابراکسس نے کہا— سچ اور جھوٹ کی اپنی تعریفیں ہوتی ہیں۔ ٹھیک ویسی ہی تعریف جائز اور ناجائز کی بھی ہے۔ ممکن ہے اخلاقیات کے جس باب میں، کسی کے لیے جو ناجائز ہو، وہ کسی دوسری جگہ، کسی دوسرے ملک، کسی دوسری کائنات میں جائز ہو— جیسے کبھی کوئی ایک تعریف کسی کے لیے بھی مطلق سچ نہیں ہو سکتی— مثال کے لیے جیسے جنگ کے دنوں میں کسی دوسرے ملک کا فوجی یا سپاہی جب ہمارے ملک میں گرفتار ہوتا ہے تو وہ دشمن کہلاتا ہے۔ جبکہ یہی دشمن، اس کے اپنے ملک کے لیے ایک وفادار سپاہی کا درجہ رکھتا ہے—

کبھی کبھی قدرت کے آگے ہم بیحد کمزور ہو جاتے ہیں......

اور سپر ڈال دیتے ہیں——

سارہ میری طرف دیکھ رہی ہے۔ کبھی آپ کو اتنا پریشان نہیں دیکھا ڈڈو۔ بات کیا ہے......؟

مسکرانے کی کوشش میں جیسے میری آنکھیں صاف چغلی کھا جاتی ہیں۔ کیسے کہوں کہ میں اخلاقیات کی جس نئی اندھیری سرنگ سے گزر رہا ہوں، تم وہاں دیکھنے اور جھانکنے کی ہمت بھی نہیں کر سکتی—— سارہ، برسوں پہلے کہیں، کسی خطے میں ایک عجیب سی کہانی شروع ہوئی تھی۔ جس نے شاید لفظوں کے معنیٰ ہی بدل ڈالے—— زندگی میں کتنی ہی آسیبی اور ڈراؤنی کہانیاں پڑھی ہیں۔ لیکن تب نہیں جانتا تھا کہ اسی زندگی کی کوئی کوئی کہانی کسی بھوت پریت اور جن کی کہانیوں سے بھی زیادہ خوفناک ہو سکتی ہے......!

اسی زندگی کی کہانی—— رشتوں کی کہانی—— کبھی کبھی رشتے الجھ جاتے ہیں اور ایسا لگتا ہے جیسے قدرت نے کوئی بے رحم مذاق کیا ہو——

آنکھوں کے آگے عمر کی سبز گھاس پر دوڑتے ہوئے ہزاروں گھوڑے—— بچپن سے لے کر اب تک کی زندگی کے تمام سفید و سیاہ رنگ میری آنکھوں کی پتلیوں پر روشن ہیں۔ ان آنکھوں نے کتنی جنگیں دیکھی ہیں۔ کیسے کیسے لوگوں سے میرا واسطہ پڑا ہے۔ ہزاروں طرح کے لوگ—— بچے سے بوڑھے تک۔ جلے ہوئے جسم سے گولیوں سے چھلنی سینے تک—— کیسی کیسی لاشیں ان آنکھوں نے دیکھی ہیں۔ کیسی کیسی چیخیں اور کراہیں سنی ہیں۔ زندگی کے اس لمبے سفر میں کیا کچھ نہیں دیکھا—— اپنوں کو مرتے ہوئے—— چین کے حملے سے پاکستان کی جنگ—— دہشت پسند کارروائیوں سے لے کر 9/11 اور 26/11 کے دل دہلا دینے والے واقعات۔ سنامی سے لے کر گجرات بیکری حادثے تک......واقعات اور حادثات کی ایک نہ ختم ہونے والی تفصیل......ایک سے بڑھ کر ایک خوفناک کہانیاں—— بھیانک داستانیں۔

لیکن کیا کوئی داستان یا کہانی اس سے زیادہ بھیانک ہو سکتی ہے——؟

'لو' منکی بن جاؤ ددّو۔ ٹھنڈ بڑھ گئی ہے.....' سارہ نے بستر سے منکی کیپ اٹھا کر مجھے پہنا دی۔

'کل پتہ ہے' رات میں گھوڑے کے گرنے کی آواز آئی تھی..... سارہ میری خاموشی کو توڑنے کی کوشش کر رہی ہے— یہاں پر کافی ڈھلان ہے۔ ہے نا.....؟ تم ہی تو بتاتے تھے ددّو کہ یہاں اکثر گھوڑے پھسل کر یا تھک کر گر جاتے ہیں.....

بکواس.....گھوڑے نہیں گرے تھے.....

گرے تھے ددّو.....

اور تم نے اس کی آواز سنی تھی.....؟

ہاں۔ وہ گرتے ہوئے بھی ہنہنا رہے تھے.....

میرے چہرے پر ہلکی سی چمک نمودار ہوئی تو سارہ ہنس پڑی۔ اب دیکھو۔ تم کتنے اچھے لگ رہے ہو ددّو.....

کانوں میں بہت عرصہ پہلے پڑھی ہوئی ہرمن ہیسے کے ناول ڈیمیان کے لفظ حرکت کرتے ہیں۔ 'سنو سنکلیر .....شاید تمہیں ایک بار پھر میری ضرورت پڑے— اگر تم نے مجھے پھر بلایا تو میں یوں گھوڑے کی طرح سرپٹ تمہارے لیے بھاگا چلا آؤں گا.....نہیں تم غلط سوچ رہے ہو سنکلیر — میں نہیں آؤں گا— تم نے خود اپنے ہی اندر کی آواز سنی ہوگی— تم دیکھو گے کہ میں تمہارے ہی اندر ہوں— سنو سنکلیر یہ دنیا ایک چھوٹے سے انڈے کی مانند ہے— انڈا ٹوٹنے والا ہے۔ ایک نئی دنیا سر نکالنے والی ہے۔'

سنّاٹے میں ہوں— مجھے لگا، جیسے میں اپنی ہی آواز کے نرغے میں ہوں۔ میری اپنی آواز.....اور سنکلیر کوئی دوسرا نہیں۔ نور محمد ہے.....نور محمد.....

تو انڈا ٹوٹ چکا ہے..... پرانی دنیا کے خاتمے سے ایک نئی تہذیب اپنا سر نکالنے والی

ہے — مرغی کے چھوٹے چھوٹے بچوں کی طرح......

●●

نور محمد......

پرانی یادوں کی البم سے وہ دھندلی سی تصویر مل گئی ہے، جو نور محمد کی ہے — کون تھا نور محمد؟ اس سے کیا رشتہ تھا میرا۔ شاید اس رشتے کو ابھی، اس لمحے تفصیل سے بتا پانا ممکن نہیں ہے — لیکن شاید میں اس مکمل تجزیہ کے لیے تیار ہوں۔ ایک بچہ اس دنیا میں پہلی بار اپنی آنکھیں کھولتا ہے۔ جیسے وہ ایک نئی دنیا کے آداب و نظام سمجھنے کے لیے اچانک زور زور سے رونے لگتا ہے — پھر تھوڑا سا بڑا ہونے پر اسے اسکول میں داخل کر دیا جاتا ہے — جہاں بے حد ہوش مندی کے ساتھ اسے بتایا جاتا ہے کہ Man is a social animal انسان ایک سماجی جانور ہے۔ وہ آہستہ آہستہ اپنے سماج کی شناخت کرتا ہے۔ مگر اس جانور کو کچھ لمحے کے لیے بھول جاتا ہے، جو اب نصاب کی کتابوں سے نکل کر اس کے جسم میں پرورش پا رہا ہے۔ وقفے وقفے وہ جانور اس کے اندر سے باہر نکلنے کی کوشش کرتا ہے — مگر ہر بار سماجیات کے ریشمی غلاف میں وہ اس جانور کو چھپا لیتا ہے —

مگر کیا سچ مچ وہ اس جانور کو اپنے اندر چھپانے میں کامیاب ہے؟ اخلاقیات اور سماجیات کی ہر کہانی اس جانور سے ہو کر گزرتی ہے — مگر ایک وقت آتا ہے جب مذہب سے لے کر اخلاقیات کی ایک عظیم الشان دیوار ہم اپنے آگے کھڑی کر دیتے ہیں۔ ایک بیحد آسان خط مستقیم پر چلنے والی زندگی، معاشرہ کا خیال — مذہب کا خوف — ایک چھوٹا سا دائرہ — اور اس دائرے میں خود کو سمیٹ کر ہم ایک پوری زندگی گزار دیتے ہیں۔

اور ایسے میں کہیں یہ خیال جاگتا ہے کہ مذہب اور اخلاقیات کی یہ دیوار نہ ہوتی تو......؟ جیسے ابتدائی قدیم معاشرے میں ایک آزادانہ جنسی رویہ پایا جاتا تھا — لیکن ایک مہذب دور میں سانس لینے کے باوجود اگر ایسے رویے کہیں بھی سانس لے رہے ہیں تو کیا اس کا تجزیہ ممکن نہیں —؟

مثال کے لیے جیسے کسی ایک بے رحم لمحے میں وہ ابتدائی قدیم معاشرے کا انسان کسی میں زندہ ہوجاتا ہے...... ایک بھوک جو رشتوں کے فاصلے مٹا دیتی ہے — مہذب ترین دنیا میں ایسی ہزاروں لاکھوں مثالیں آسانی سے دیکھی جاسکتی ہیں۔

ابو بابا چائے لے کر کمرے میں آئے ہیں۔ پتہ نہیں رات کے کتنے بج چکے ہیں۔ گھر کے پرانے خادم ہیں ابو بابا...... کم بولتے ہیں — اور بس اپنے کام سے کام رکھتے ہیں۔ لان کے پاس ایک چھوٹا سا سرونٹ کاٹج ہے — وہیں رہتے ہیں — اپنی بیوی حلیمہ کے ساتھ۔ جو گھر کے کام کاج کی ذمہ داریاں سنبھالتی ہے — اور ابو بابا میری ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ باغبانی کے فرائض بھی انجام دیتے ہیں۔

بغیر کچھ بولے ابو بابا نے چائے کی پیالی میز پر رکھ دی۔

میں نے آہستہ سے پوچھا — سارہ کہاں ہے؟

''پنیوٹر پر......''

ابو بابا کمپیوٹر کو پنیوٹر کہتے ہیں — ایک لمحے کے لیے وہ دوسرے سوال کے لیے رکے۔ پھر لوٹ گئے —

چائے کی پیالی کے ساتھ میں نے میز سے وہ لفافہ اٹھالیا...... جو آج صبح سے مجھے پریشان کیے جا رہا تھا —

●●

سارہ صبح کے ۵ بجے ہی اٹھ گئی تھی۔ اٹھنے کے بعد وہ کچھ دور تک پہاڑیوں کے چکر لگانے چلی جاتی۔ مرغزاروں سے گھری ہوئی حسین پہاڑی — دور تک شاہ بلوط کے پیڑوں کی قطار — اسے گھومنا منا پسند تھا۔ یا یوں کہا جائے کہ بیحد چھوٹی عمر سے اس نے صبح جاگنگ کی عادت ڈال دی تھی۔ عام طور پر اس درمیان سڑک پر چہل پہل کم ہی رہتی ہے۔ لوٹنے کے بعد اس کی مختصر سی گفتگو

ممی اور ڈیڈی سے ہوئی۔اس نے دوّو کی طبیعت کے بارے میں بتایا— کچھ دیر کمپیوٹر پر بیٹھی۔ پھر ابو بابا کے پاس چلی گئی جو اس وقت باغ میں پھولوں کو پانی دینے اور کیاریوں کو ٹھیک کرنے میں مصروف رہتے ہیں۔

میں نے ایک نظر سارہ اور ابو بابا کو باتیں کرتے ہوئے دیکھا۔مگر اس وقت میں نور محمد کے خیالوں میں گھرا ہوا تھا۔ظاہر ہے میں خط پڑھ چکا تھا۔اور خط کا اک ایک جملہ دھماکہ بن کر میرے کانوں میں مسلسل گونج رہا تھا۔

''اس کہانی کی شروعات آپ نے کی تھی۔انجام بھی آپ لکھیں گے۔آپ کو لکھنا ہی ہوگا۔ ایک بار میرے پاس آنا ہوگا......میں آپ کا منتظر ہوں......''

ہوا میں خنکی ہے— ٹھنڈ زیادہ نہیں ہے مگر صبح سویرے کا یہ موسم مجھے عام طور پر پسند ہے—شاید میں اپنا دھیان نور محمد سے ہٹانا چاہتا ہوں۔مگر کیا یہ ممکن ہے—؟

ابو بابا......ایک کپ چائے ملے گی......؟

ہری بھری گھاس پر پلاسٹک کی کرسیاں رکھی ہیں۔ایک پر بیٹھ جاتا ہوں— سوچتا ہوں' سارہ اگر ان چند دنوں کے لیے میرے پاس نہ آئی ہوتی تو......؟ تو شاید میں اور زیادہ مخبوط الحواس ہو جاتا۔مگر ابھی کون سا کم ہوں— رائیڈر س ہیگررڈ کے قلم سے نکلی کہانی سے زیادہ ایک حیران کرنے والی کہانی نے نوزائیدہ بچے کی طرح اپنے ننھے ننھے پاؤں کھول لیے تھے......

کیا مجھے نور محمد کے پاس جانا چاہئے......؟

جانا تو پڑے گا۔

لیکن اس سے کہوں گا کیا......؟

سارہ قریب آ کر ہنستی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئی ہے۔

دوّو۔آپ نے چائے پھر ٹھنڈی کر دی......

چائے آگئی ہے......؟

لو......کب کی ابو بابا دے گئے۔ وہ دیکھو— ابو بابا مسکرا رہے ہیں......

میں نے گھوم کر دیکھا۔ پودوں میں پانی ڈالتے ہوئے ابو بابا کے چہرے پر ایک معصوم سی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی...... مجھے اپنی دماغی کیفیت پر افسوس آیا۔ گھڑی دیکھی......یعنی پورے پندرہ منٹ تک میں مسلسل نور محمد کے بارے میں سوچتا رہا تھا۔ بچپن میں یا کالج کے دنوں رائیڈر رس ہیگر رڈ کے پراسرار ناولوں کا میں عاشق تھا— اور اب اُس کے ناولوں کے مطالعہ سے کہیں زیادہ پر اسرار ایک دنیا میرے سامنے تھی۔ مگر ایک سچی دنیا— عام انسانوں کی دنیا— بھلے اور شریف لوگوں کی دنیا— شریف لوگ، جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ خدا ہمیشہ ایسے ہی سچے اور شریف لوگوں کا امتحان لیتا ہے— شریف اور بیحد شرمیلے لوگ— جو ہر کسی سے اپنا دکھ بھی نہیں بانٹ سکتے۔ مگر خدا ہر بار اپنے امتحان کے لیے ایسے ہی لوگوں کا انتخاب کرتا ہے—

سارہ کے ہاتھوں میں جانے کہاں سے ایک چھوٹی سی کنکری آگئی۔ کنکری اس نے ہاتھ آگے کر کے اچھال دیا......

اب میرے چونکنے کی باری تھی— 'یہ کیا کیا؟ کسی کو چوٹ لگ سکتی تھی......'

'نہیں لگ سکتی تھی۔ وہ ہنس رہی تھی— ابو بابا وہاں ہیں۔ حلیمہ بوا کچن میں۔ اور یہاں دور تک کوئی نہیں......اور تم اب پہلے والے ددّو بھی نہیں رہے— پہلے کتنا کھیلتے تھے میرے ساتھ۔ یاد ہے ددّو۔ کرکٹ بھی کھیلا تھا...... والی بال بھی...... کیرم بھی— اور...... لیپ ٹاپ پر ویڈیو گیم بھی......'

'وقت بدل جاتا ہے سارہ......'

'نہیں بدل جاتا......'

'بدلتا ہے—' میں اپنی بات پر زور دے کر کہتا ہوں۔ 'وقت کے ساتھ کھیل بھی بدل جاتے ہیں۔ تمہارے بھی تو کھیل بدل گئے— کھیل کی جگہ ہاتھوں میں موبائل آگیا—'

'موبائل رکھنا کھیل نہیں ہے۔'

'میرے لیے کھیل ہے۔'

'بس۔تم ہو ہی پرانے زمانے کے......'

''اچھا......تو میں پرانے زمانے کا ہو گیا— مگر موبائل تو میرے پاس بھی ہے......'

سارہ نے میری آنکھوں میں جھانکا۔ایک چمک جاگی تھی اس کی آنکھوں میں—اچھا— تم کہتے ہو وقت کے ساتھ کھیل بھی بدل جاتے ہیں تو کوئی نیا کھیل کھیلو نا میرے ساتھ......''

ایک لمحے کے لیے ٹھہر گیا ہوں— جیسے نور محمد سے چلتی ہوئی کہانی اخلاقیات کے بوسیدہ صفحے تک آ کر منجمد ہو گئی ہو—ایک چیز جو سارہ کے لیے جائز نہیں، وہ میرے لیے جائز—ایک چیز جو نور محمد کے ساتھ جائز، میرے لیے ہولناک سے زیادہ عبرتناک— کھیل مل گیا تھا—میں نے ہنستے ہوئے کہا—

'اب تم سترہ کی ہو گئی ہو...... ہے نا......'

'اس میں بھی کوئی شک ہے ددّو۔'

'تو جانتی ہو گی۔Legal اور Illegal کیا ہے......؟'

'ہاں—جائز اور ناجائز—' اس نے زمین سے ایک کنکری پھر ہاتھوں میں اٹھائی تھی— اسی لیے تو یہاں بھاگ کر آ جاتی ہوں۔وہاں تو ممی جینا دوبھر کر دیتی ہیں۔اُنہیں لگتا ہے......میں جو کروں گی غلط کروں گی۔اتنا فاصلہ کیوں ہے ددّو—اتنا بڑا جنریشن گیپ— ممی لوگ بدلتے وقت کی آہٹ کیوں نہیں سنتے— کبھی کبھی لگتا ہے ایک مہذب سوسائٹی میں بھی لڑکی ہو کر پیدا ہونا کسی جرم سے کم نہیں۔یہاں مت جاؤ۔وہاں مت جاؤ۔اسکول جانے کے لیے اتنا فیشن کیا ضروری ہے— کسی سہیلی کے یہاں چلی گئی تو آفت۔موبائل پر زیادہ گفتگو کر لی تو جینا مشکل۔چھت پر چلی گئی تو دو منٹ بعد ممی بھی چھت پر۔یہاں کیا کر رہی تھی......؟ یہاں ممی کے لیے چھت پر آنا جائز— میرے لیے ناجائز۔ممی رشتہ داروں سے گھنٹوں موبائل پر گفتگو کر سکتی ہیں۔جائز—میں کسی دوست

سے کروں تو ناجائز...... کیوں دڈّو — ؟

'بس یہی گیم ہے —' میں زور سے ہنسا — ابھی جو کچھ تم نے کہا وہی گیم ہے — تمہارے ہی سوال سے شروع کرتے ہیں۔ تم چھت پر گئی اور ممی چھت پر آ گئیں۔ رائٹ......'

'ہاں......'

'ممی کیوں آئیں......؟'

'شک...... کہ میں کسی سے بات تو نہیں کر رہی۔ کسی سے کچھ چل تو نہیں رہا...... یعنی......'

'ال لیگل...... میں مسکرایا — لیکن ممی آ سکتی ہیں۔ کپڑے پسارنے یا کسی بھی کام سے...... لیگل — کوئی شک نہیں — کسی شک کی گنجائش نہیں......'

ہاں......

تمہارا موبائل پر بات کرنا......؟

سارہ زور سے ہنسی — میرے لیے آب ویسلی ال لیگل۔

'ممی کے لیے لیگل — اب آگے...... ایسے کچھ پوائنٹ سوچو......'

سارہ کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ اسے جانے انجانے ایک دلچسپ کھیل مل گیا تھا —

'آتنک وادی — وہ زور سے تالیاں بجا کر ہنسی — میرے ملک کے لیے ناجائز — مگر جس ملک نے بھیجا — اس کے لیے جائز۔ وفادار۔

'اسی طرح ملک کے فوجی سپاہی...... اور آگے......

'یعنی میں اگر Pregnant ہو جاتی ہوں — شادی سے پہلے...... روانی میں بولتی ہوئی اچانک اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ میرا مطلب ہے کوئی لڑکی جس کی شادی نہیں ہوئی — ال لیگل۔ لیکن شادی کے بعد یہی چیز سارے گھر کی خوشی بن جاتی ہے......

سارہ کی نظریں جھکی تھیں...... میرے اندر کوئی سنّاٹا نہیں تھا۔ یہ نسل خود کو پہچانتی ہے۔ اس لیے کہیں بھی اپنی کوئی بھی بات سامنے رکھنے سے نہیں گھبراتی......

اس کا مطلب ایک ہی چیز۔ ایک ہی وقت میں جائز اور ناجائز دونوں ہوسکتی ہیں...... کیوں سارہ؟‘

’ہاں ددّو......‘

’یعنی جو تمہارے لیے ابھی ناجائز ہے۔ وہ کسی کے لیے جائز......‘

’ہاں ددّو......‘

میں چپ تھا۔ والیٹر سے روسو تک انسانی نفسیات کی ایک ایک گرہیں میرے آگے کھل رہی تھیں۔ جائز اور ناجائز کی اس انوکھی تقسیم نے میرے پاؤں جکڑ رکھے تھے— کچھ ایسے حیران کرنے والے واقعات بھی آنکھوں کے آگے روشن تھے، جہاں نگاہیں پہنچ کر بھی جل جاتی ہیں— جیسے کالج کے دنوں میں سنا ہوا ایک واقعہ— ایک عورت کو بچہ ہوا تھا۔ سینے میں دودھ اترا ہوا تھا— یہی وہ وقت تھا جب اس کا شوہر اسے چھوڑ کر چلا گیا— شہر کی حالت اچھی نہیں تھی۔ فساد پھوٹ پڑا۔ اس دن اس عورت کے گھر پانی کا ایک قطرہ بھی نہیں تھا۔ اچانک دروازے پر کسی کے گرنے کی آواز ہوتی ہے۔ بوڑھی ماں اور عورت دروازہ کھول کر دیکھتے ہیں۔ ایک شخص ہے، جسے گولی لگی ہے...... بیہوش ہے...... دونوں اسے کھینچ کر اندر لاتے ہیں...... عورت پانی تلاش کرتی ہے۔ مگر گھر میں پانی کا ایک بھی قطرہ نہیں۔ وہ گھبرا کر بوڑھی ماں کو دیکھتی ہے اور تجربہ کار ماں انسانیت کا انوکھا فیصلہ سناتی ہے— ’وہ کر جسے انسانی قانون اور مذہب نے منع کیا ہے— بلاؤز کھول۔ اس کے ہونٹوں پر اپنا دودھ ٹپکا......‘

سماجی آئین سے الگ کی ایک نئی اخلاقیات سامنے آرہی تھی...... انسانوں سے لے کر جنگلی جانوروں تک، نئی اخلاقیات کی ہزاروں مثالیں سامنے تھیں— آسٹریلیا کے حوالے سے ایک خبر آئی تھی کہ ایک شیرنی ایک چھوٹی سی بلّی کی محافظ بن گئی ہے۔ انگلینڈ کے ایک جنگل میں کتّے اور بھالو کو ساتھ کھیلتے ہوئے دیکھ کر ایک فوٹوگرافر نے اپنے کیمرے میں قید کیا تھا۔ دنیا کے سب سے

چھوٹے ماں باپ ۱۵ سال کے بچے تھے— ٹی وی کے روشن اسکرین پر دو چھوٹے بچے اپنے چھوٹے سے ننھے بچے کو دیکھتے ہوئے خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے...... سائبیر ورلڈ، نئی تکنالوجی، بدلتی ہوئی دنیا— بدلتا ہوا نظام— گلیشیر کے پگھلنے اور سائبیریا میں گھاس اگنے تک کی خبروں نے بدلے بدلے موسم کی گواہی دے ڈالی ہے۔

اور یہ خط مجھے ایسے موقع پر ملا ہے جب ماحولیات کو لے کر کوپن ہیگن میں ہونے والا ڈرامہ پوری طرح ناکام ثابت ہو چکا ہے...... انتظار کیجئے۔ اس بیحد بے رحم وقت میں، میں آپ کو ایک ایسی ہی بے رحم کہانی یا کردار سے ملانے لے جا رہا ہوں۔ ممکن ہے، جسے سننے کے لیے آپ کے کان آشنا نہ ہوں۔ یا جسے محسوس کرنے کے لیے آپ کے دل کی حرکتیں رک جائیں۔ یا جسے آنکھوں کے پردے پر دیکھنے کی عجلت آپ کی آنکھوں کی بینائی چھین لے—

لیکن آپ کو اس کے لیے تھوڑا سا انتظار کرنا ہوگا......

(۲)

ایک بیحد سہمی ہوئی خوفزدہ کرنے والی صدی کے دس سال گزر گئے تھے۔ دس بھیانک سال— جس نے ہزاروں خوفناک واقعات سے صدی کے سینے میں سارترے کے Iron in the soul کو رکھ دیا تھا— (کہیں ایک اور کہانی لکھی جا رہی تھی— جو شاید ان کہانیوں سے کم بھیانک نہیں تھی۔ جس کا تذکرہ آگے آئے گا۔ مگر اس کہانی تک پہنچنے کے لیے ان دس برسوں کے تکلیف دہ سفر سے گزرنا زیادہ موزوں معلوم ہوتا ہے—

انسانی زندگی کے ساتھ تاریخ کی وابستگی کی کہانی بہت پرانی ہے— تاریخیں کتنی بھی لہولہان سہی، لیکن ہم ان سے دامن بچا کر اپنے حال کا تجزیہ نہیں کر سکتے— اس لیے مختصر میں ہی سہی

اس بدترین تاریخ کا تجزیہ یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے— شاید ہم نے اس بیحد ڈراؤنی صدی سے ایسی امید نہیں کی تھی— ساری دنیا میں بھوک مری اور غریبی لوٹ آئی۔ تیل کی قیمتیں آسمان چھو گئیں۔ شیئر بازار لڑھک کر گر پڑا۔ ہزاروں بینکوں کو دیوالیہ قرار دے دیا گیا۔ ابوذہبی اور دبئی جیسے جدید مراکز ہل گئے۔ امریکی کرنسی گریٹ ڈپریشن کا شکار ہوئی۔ ماحولیات کے تحفظ کے لیے نئے نئے ماڈل بنائے گئے جو ناکام رہے— انٹارٹیکا کے بڑے بڑے گلیشیر سمندر میں گم ہو گئے— سر جوڑتے ہوئے دنیا کے تمام بڑے سائنسدانوں نے فیصلہ سنایا۔ 'انسانی ترقی اور کامیابی کی کہانیاں ہی دراصل انسانی بربادی کی بھی اصل وجہ ہیں'۔ ایک طرف دہشت پسندی ہے اور دوسری طرف مہاماری— سوائن فلو اور سارس جیسی نئی بیماریوں سے لڑتے ہوئے لوگ— کامیابی کا ہر نیا قدم ہمارے لیے ایک نئی بیماری لے کر آتا ہے۔ ملیریا ہر ۳۰ سکنڈ میں ایک بچے کی جان لے رہا ہے۔ روزانہ 1500 سے زیادہ عورتیں بچہ پیدا کرنے کے دوران مر جاتی ہیں۔ شوگر، کینسر، ہائی پرٹینشن، بلڈ پریشر، ایڈز، ہارٹ اٹک— 9/11 سے گجرات اور 26/11 تک ایک خوفزدہ کرنے والی دنیا ہمارا استقبال کرتی ہے— بین الاقوامی معاہدے، سمجھوتے، قوانین، قواعد و ضوابط سب کاغذ پر رکھے رہ جاتے ہیں اور ایک سنگین زندگی نئی بیماریوں اور نئے وائرس کے ساتھ ہمارے سامنے آجاتی ہے—

●●

پروفیسر نیلے ہمارے پڑوس میں ہیں۔ کافی دنوں تک امریکہ میں رہے۔ اپنے بیٹے کے پاس۔ پھر یہاں آ گئے۔ جیسے میں آ گیا— اور یہاں ایک خوبصورت سا کاٹیج بنا لیا۔ اب یہاں وہ اپنی بیوی کے ساتھ رہتے ہیں۔ اس دن ذہن کافی پریشان رہا۔ سارہ سے ملنے گیا تو وہ کمپیوٹر سے چپکی ہوئی تھی۔ اچانک مجھے دیکھ کر وہ ذرا سا خوفزدہ ہوئی تھی۔ لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے اپنے احساس پر قابو پا لیا۔ میرے لیے یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ وہ کسی ایسے سائٹ کو دیکھ رہی تھی، جسے میری

موجودگی نے کسی حد تک ڈسٹرب کردیا تھا۔ ان باتوں کو سمجھنے کے لیے یا اس نادان عمر کے تجزیہ کے لیے میرے پاس بھرپور جواب موجود ہے۔ جیسے آپ لاکھ منع کریں، آپ ان بچوں کے تجسس کو روک نہیں سکتے۔ جب ساری دنیا اور دنیا کی تہذیبیں ان کے سامنے ہیں تو وہ اپنے تجسس کے پرندے کو ذرا سا آزاد کرتے ہوئے اسے سمجھنا بھی چاہیں گے۔ مثال کے لیے جسم۔ جسم کی بھوک کو۔

'میں ذرا باہر جارہا ہوں— تمہیں کچھ ضرورت ہو تو حلیمہ سے مانگ لینا۔'

اس کے بعد میں ٹھہرا نہیں— گرم شال لپیٹ لی تھی۔ سر پر منکی کیپ چڑھا لی۔ پورٹیکو سے گاڑی نکالی— اس عمر میں بھی مجھے ڈرائیونگ کا نشہ ہے۔ شوق کبھی نہیں مرتے— اور مجھے احساس ہے، شوق کو مرنا بھی نہیں چاہیے— آپ کے اندر کا تجسس اور بے چینیاں سرد ہو جائیں تو آپ ایک جھٹکے میں بوڑھے ہو جاتے ہیں۔ اس لیے اس عمر میں بھی ایڈونچر یا اپنے اندر کے رومانی احساس کو میں نے مرنے نہیں دیا ہے......

پروفیسر نیلے گھر کے باہر لان میں کرسی ڈالے اخبار پڑھ رہے تھے۔ میز پر خالی چائے کی دو پیالیاں پڑی تھیں— یعنی کچھ دیر پہلے یہاں مسز نیلے بھی تھیں......

'آؤ چائے پیتے ہیں۔ میں تو چائے پی چکا......'

'میں بھی چائے پی کر ہی آرہا ہوں— آج ذرا سیر کا موڈ ہے۔'

پروفیسر نیلے ہنسے...... سمجھ گیا۔ اسی لیے واک کرتے ہوئے نہیں آئے— گاڑی لے کر آئے ہو— ارے بھئی— ان پہاڑیوں پر زندگی کا اپنا مزہ ہے— اور یہ مزہ بڑھاپے میں ہی اٹھایا جا سکتا ہے۔ کیوں کاردار......؟

'بالکل سہی— سنتے آئے تھے۔ پہاڑوں کی زندگی بالکل بے جان سی ہوتی ہے۔ پہاڑوں کی طرح— لیکن لوگوں نے پہاڑوں کے اندر کی روحیں نہیں دیکھیں— ہر پہاڑ کچھ نہ کچھ بولتا ہے— شاید سینکڑوں ہزاروں برسوں کی داستانیں ان پتھروں میں جانے کب سے دفن ہیں۔

پروفیسر نیلے نے ٹھہاکا لگایا— پہاڑ بولتے ہیں۔ لیکن سب کے لیے نہیں— ان کے

لیے جو سننا چاہتے ہیں— جیسے یہاں کے لوگوں کو دیکھو۔ آرام سے چڑھائیاں چڑھتے ہوئے۔ میلوں کا سفر پیدل طے کرتے ہوئے— ہم دو قدم چلیں تو سانس پھول جاتی ہے۔ خیر اب میں بھی اس کا عادی ہو گیا ہوں— مجھے ان وادیوں میں سیر کرنے میں ایک عجیب سا سکون ملتا ہے۔ خاص کر رات کے اندھیرے میں، ان پہاڑوں کی دھڑکنوں کو محسوس کرو۔' پروفیسر نیلے ہنس رہے تھے۔ کبھی کبھی جی چاہتا ہے، ان بے جان پتھروں سے خوب خوب باتیں کروں۔ مگر— لوگ پاگل نہ سمجھ لیں، بس یہ سوچ کر ڈر جاتا ہوں—

میں نے غور سے پروفیسر نیلے کے چہرے کا جائزہ لیا۔ وہ گہری سوچ میں تھے— شاید اس وقت بھی، بے جان بولتے پہاڑ ان کی نظروں کے سامنے تھے۔

''تو چلیں۔ آپ کو اپنا وعدہ یاد ہے......'

'چلیے......'

لگ بھگ ایک گھنٹے کے سفر کے بعد پروفیسر نیلے نے ہاتھ کا اشارہ کیا۔

'کاردار — گاڑی یہاں روک لیجئے۔ یہ میری پسندیدہ جگہ ہے — میرے ساتھ آیئے۔'

درختوں سے ٹوٹ ٹوٹ کے ہزاروں پتّے، پتھریلی زمین پر بچھے ہوئے تھے۔ میں نے سڑک کے ایک طرف گاڑی پارک کر دی۔ سرسبز سنگلاخ راستوں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ— چاروں طرف انتہائی دلکش پہاڑیوں سے ہو کر نظر آنے والا نیلگوں آسمان کا سمندر۔ مظاہر قدرت نے اپنا خزانہ لٹایا تھا۔ ہرے ہرے پتوں کے جھنڈ سے نیلے نیلے آسمان کی وسعتوں کو دیکھنا، مجھے ہمیشہ سے حیران کرتا آیا ہے۔ نیچے گھنیری وادیاں— خودرو جھاڑیاں— خودرو پھول......شاخوں سے الجھی ہوئی شاخیں...... پرندوں کے بولنے، چہچہانے کی آوازیں......

'بھول جاؤ کہ کبھی کوئی تہذیب بھی تھی......' پروفیسر نیلے ایک اونچی سی پہاڑی پر چڑھ

گئے — یہاں صرف قدرت ہے — میں یہاں آ کر بھول جاتا ہوں کہ میں انسان بھی ہوں۔ یا میرا کبھی کسی انسانی تہذیب سے واسطہ بھی رہا ہے — یہ میرے لیے کسی ورجن ویلی کی طرح ہے — یہاں اس سنّاٹے، خوشبو اور تڑپ کو محسوس کرو — جیسے کوئی حسین کنواری دوشیزہ انگڑائیاں لے رہی ہو......ڈرومت یہاں آؤ کاردار۔

پروفیسر نیلے نے میرے ہاتھوں کو تھام لیا تھا۔

'ڈرومت — یہاں اوپر آجاؤ۔'

میں نے ان کے ہاتھوں کو تھام لیا — سچ مچ یہاں انسانی تہذیبیں نہیں، صرف قدرت سانس لیتی ہے۔ ابھی بھی جیسے ہزاروں ایسی وادیاں انسانوں کے بے رحم ہاتھوں سے بچی ہوئی ہیں۔ ارتقاء اور سائنسی ایجادات کی ریس میں دوڑتے انسانوں نے ایسی ہزاروں ورجن ویلی کی عصمت لوٹنے کی ناپاک کوشش ابھی نہیں کی ہے۔ بس کبھی کبھی سڑک پر بھاگتی اکادکّا گاڑیاں۔ سبز گھاسوں اور جنگلی پھولوں کی خوشبو —

ہم دونوں وہیں پہاڑی پر بیٹھ گئے۔

'تہذیبیں مرنے کے لیے ہوتی ہیں۔ ایک تہذیب جہاں ختم ہوتی ہے' دوسری تہذیب وہیں سے سانس لینا شروع کرتی ہے۔ ہر تہذیب ایک دوسرے سے مختلف — ہڑپا، موہن جداڑو سے قدیم مصر، بیبی لون، یونان، روم کی تہذیبوں کے اوراق دیکھ لو — لیکن یہاں ان پہاڑوں کی اپنی تہذیب ہوتی ہے۔ جو کبھی نہیں بدلتی۔'

پروفیسر نیلے مسکرائے — کیا تمہارا جدید سائنس ایک چھوٹا سا سبز پتہ بنا سکتا ہے —؟ وہ ہنس رہے تھے۔ نہیں بنا سکتا۔ جینوم اور ڈی ان اے کے اس عہد میں وہ ان ہری بھری شاخوں اور پتّوں کو مسل کر ادویات ضرور تیار کر سکتے ہیں۔ جانے کیوں، شروع سے ہی انسانوں نے اپنی ترقی کے لیے ایک ہی راستہ چنا — قدرت سے کھیلو — قدرت کے خزانے کو لوٹو — ترقی کا ہر راستہ اس قدرتی خزانے سے ہو کر جاتا ہے —'

میرے سامنے نور محمد کا معصوم چہرہ تھا— 'ابھی آپ تہذیبوں کی باتیں کر رہے تھے پروفیسر......؟'

'ہاں— تہذیبیں مرنے کے لیے ہوتی ہیں۔ کوئی کوئی تہذیب بہت جلد مر جاتی ہے— پھر ایک نئی تہذیب سر اٹھاتی ہے۔ ان تہذیبوں میں جینے کے لیے' ہم اپنی آسانی اور سہولت کے حساب سے اپنے مذہب چن لیتے ہیں۔ اصول اور قوانین بنا لیتے ہیں۔ یہ سب اپنی سہولت کے حساب سے کاردار— انسانی رشتے بھی اسی سہولت کی دین ہیں۔ جنہیں بیحد مہذب ہوتی دنیا میں ہم اپنے حساب سے بناتے اور توڑتے رہتے ہیں— یہ رسم ورواج— شادی بیاہ، بندھن...... ممکن ہے یہ تہذیب ختم ہو جائے تو نئی تہذیب ان سب کی نئی تعریفیں اپنے حساب سے یا اپنی سہولت کے حساب سے لکھنے لگیں۔ ممکن ہے کل کی تہذیب میں نومولود بچے کی اپنی دنیا ہو— جیسے اس کے آزاد ماں باپ کی— وہ بچہ آنکھیں کھولتے ہی اپنی آزاد سلطنت کا وارث بن جائے......'

پھر اس بچے کا مستقبل؟ میری آنکھوں کے آگے کا سایہ گھنا ہو گیا تھا—

"مستقبل وہ بچہ خود طے کرے گا۔ ممکن ہے، کل کی تہذیب میں پیدا ہوتے ہی بچوں کو کوئی قانون، کوئی ان جی او یا پھر کوئی سوسائٹی اپنا لے— ممکن ہے نئے بچوں کے لیے باقاعدہ کوئی نیا انتظام ہو— ہم جو کچھ دیکھتے ہوئے اور سیکھتے ہوئے بڑے ہوتے ہیں، وہی ہماری پہچان بن جاتی ہے کاردار— بچپن سے سنسکرتی، اخلاق، اور تہذیب کے اتنے گھول ہمیں پلائے جاتے ہیں کہ ہم انہیں ہی سچ سمجھ بیٹھتے ہیں— اور اس میں، تمہیں شک نہیں ہونا چاہئے کہ آگے آنے والے سو برسوں یا ہزار برسوں میں یہ تہذیبیں ایک نئی کروٹ لیں گی— ممکن ہے تب......

پروفیسر نیلے لمحہ بھر کے لیے خاموش ہوئے تھے......

'تب......؟'

وہ ہنس رہے تھے— رشتے ہی نہ رہیں۔ مشین ہوتے انسانوں میں ویسے ویسے بھی رشتے کہاں ہوتے ہیں۔'

پروفیسر نیلے مجھے غور سے دیکھ رہے تھے — جیسے ڈارون کا نیا انسان میرے بندر نما چہرے میں اپنے رنگ بدل رہا ہو......

وہ ہنس رہے تھے......

یقیناً اس ہنسی میں قدرت کے حسین خزانے کو دخل تھا، مگر جانے کیوں اس وقت اس ہنسی کی زد میں، میں تھا...... 'مشین ہوتے انسانوں میں ویسے بھی رشتے کہاں ہوتے ہیں — ' فضا اچانک ساکت ہوگئی۔ پروفیسر کے لفظ میرے کانوں میں گونج رہے ہیں......

'چلو......آؤ......بیٹھے بیٹھے تھک گئے۔ اب کچھ سیر ہو جائے......'

پتھر کے بڑے سے ٹکڑے سے اترتے ہوئے پروفیسر نیلے نے پھر اپنی پتلیوں کو نچایا۔ اس بار وہ سنجیدہ تھے —

'عرصہ پہلے ڈارون نے اوریجن آف اسپیز لکھ کر کہتے ہیں مذہب کو چیلنج کیا تھا — اور چرچ میں کھلبلی مچ گئی تھی — پوپ نے ڈارون کے خلاف فتوے صادر کر دیئے۔ اس کی تصویروں کو کالکھ پوت دی گئی — پروفیسر نیلے رکے — یہ چیلنج مذہب کو نہیں تھا کاردار — تمہاری تہذیب کو تھا......تہذیب سے جڑی تمہاری اپنی اخلاقیات کو ایک چیلنج تھا، جسے محض تم نے اپنی آسانی کے لیے اپنے معاشرے میں پناہ دی ہوئی ہے۔'

وہ مسکرائے — 'کتنی عجیب بات کاردار......ڈارون بائبل کے مقدس صفحوں کو پڑھتا ہوا جوان ہوا۔ پھر جلد ہی اولڈ ٹیسٹامنٹ کے اوراق اسے جھوٹے لگنے لگے اور وہ ارتقاء کی تھیوری پر کام کرنے لگا۔ اور آہستہ آہستہ ایک نیا تہذیبی اُفق اس کی آنکھوں کے پردے پر ابھرنے لگا۔ اور شاید اسی لیے اس نے قدرت کا انتخاب کیا۔'

پروفیسر نیلے کی آنکھیں فخر سے دور تک پھیلے پہاڑوں کا جائزہ لے رہی تھیں...... 'ہر جائز اور ناجائز کا فیصلہ یہی قدرت کرتی ہے۔ ہم کون ہوتے ہیں تہذیبیں گرانے والے — کتّے آج سے ہزاروں سال پہلے بھیڑیئے تھے......السیشین سے پامیرین اور بلّی کے چھوٹے چھوٹے بچوں تک

Breading کے ہزاروں واقعات ہیں......

کچھ سوچ کر پروفیسر زور زور سے ہنسے......

'ہمارے یہاں پنر جنم کو مانا جاتا ہے۔ اگر ایسا کوئی پنر جنم ہے تو ممکن ہے میں اگلے جنم میں کسی سؤر کے چہرے کے ساتھ پیدا ہوؤں۔ تب تم یقیناً کسی السیشین کے چہرے کے ساتھ میرے پڑوسی رہو گے۔'

••

حلیمہ نے دال جلا دی تھی......ابو بابا اس پر برس رہے تھے......

'تمہارا دھیان کہاں رہتا ہے۔ صاحب کچھ بولتے نہیں، اس کا کیا مطلب ہے— دھیان تو رکھنا چاہیے تمہیں......'

سارہ نے سمجھایا— 'ہمیشہ تو نہیں جلتی نا......کبھی کبھی غلطی سے ہو جاتی ہے......'

'یہ غلطی ہے—' آج وہ حلیمہ سے کچھ زیادہ ہی ناراض لگ رہے تھے......'

'آپ کافی دیر سے انہیں ڈانٹ رہے ہیں۔ اب بس بھی کیجئے—' سارہ مسکرا رہی تھی......

مجھے اس لڑنے جھگڑنے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں کمرے میں آ گیا۔ بستر کے ساتھ ہی ایک پرانا آدم قد آئینہ بھی تھا......میں نے اپنے چہرے کو دیکھا اور چونک گیا......

میرے چہرے کی جگہ ایک السیشین نے لے لی تھی......

••

سارہ سو گئی تھی۔

سارہ کے جسم پر چادر برابر کرنے کے بعد میں اپنے کمرے میں لوٹ آیا تھا۔ جی چاہا کہ

آگے بڑھ کر ٹی وی کھول لوں۔ لیکن اب خبروں سے وحشت ہونے لگی ہے......

نور محمد ایک بار پھر میرے سامنے تھا۔ اور مجھے یہ بتانے میں کوئی پریشانی نہیں کہ ڈارون سے روسو، والیٹر اور ہنگٹن تک میں ابھی بھی اپنے اخلاقیاتی نظریے سے لڑ رہا تھا۔

کون بناتا ہے یہ نظریہ — ؟ جب ایک نظریہ سچ ہے تو پھر اختلاف کی گنجائش ہی کیوں پیدا ہوتی ہے؟ کیا اخلاقیات ہر بار ہمارے لیے ایک چیلنج ہیں؟ کیا وقت اپنے حساب سے اپنی اخلاقیات کی تھیوری پیش کرتا ہے — ؟ کیا آج کی ساری بحث صرف اور صرف اخلاقیات تک سمٹ کر رہ گئی ہے — ؟ گلوبل دنیا اور گلوبل وارمنگ کے اس دور میں الگ الگ اخلاقیات کے عفریت ہمیں حصار میں لیے کھڑے ہیں...... کہ پہلے ہم سے الجھو...... اور جیسا کہ اندنوں مغرب کے بارے میں کہا جا رہا ہے کہ مغرب کے بنیادی مسائل نہ تو معاشی ہیں اور نہ ہی آبادی کا بڑھنا — بلکہ اصل مسئلہ ہے — اخلاقیات کا گم ہو جانا — ثقافتی خودکشی — اور انہی سب سے ایک نہ ختم ہونے والا سیاسی بحران پیدا ہو گیا ہے — ایک طرف دہشت پسندی اور القاعدہ تہذیب ہے جس کی جڑیں بنیاد پرستی سے زیادہ دہشت پسندی میں کھڑی ہیں......

میں ریک سے ایک کتاب نکالتا ہوں۔ دی کلیم آف سویلائزیشن۔ صفحے پلٹتے ہوئے ٹھہر جاتا ہوں —

مخالف تہذیبوں کے درمیان عالمی جنگ کے خطرات کے امکانات سے بچنے کی کیا صورت ہو سکتی ہے — ؟ کیا دنیا کے حکمراں اس کی تہذیبی فطرت کو قبول کرنے اور اُسے بچانے کے لیے تیار ہیں — اندھیرے سے جنم لینے والی ایک نئی دنیا ہے — معاشرتی تبدیلیوں کی دھند میں شناخت گم ہوتی جا رہی ہے۔

اور دوسری طرف قدرت ہے — قدرت جو اپنے انوکھے کھیل، کھیلنے میں مصروف ہے —

نور محمد کا خط ایک بار پھر میرے ہاتھوں میں ہے......

'بچپن سے سنتا آیا تھا، ہم سب قدرت کے ہاتھوں کی کٹھ پتلیاں ہیں۔ پہلے مجھے یہ صرف محاورہ لگتا تھا۔لیکن اب نہیں— مجھے لگتا ہے۔ ریموٹ کنٹرول قدرت کے ہاتھوں میں ہے۔ وہ ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دیتی ہے— جیسے ہم ٹی وی کے سامنے ریموٹ گھماتے ہوئے ناپسندیدہ سے پسندیدہ پروگرام کی طرف لوٹتے ہیں— قدرت سارا تماشہ دیکھتی رہتی ہے— اور اچانک ریموٹ کا ایک بٹن دبا دیتی ہے......

کیا آپ نے یہ دھماکہ سنا؟

شاید آپ اس دھماکے کو سن سکتے ہیں—؟

میں یہ نہیں کہوں گا کہ مجھے آپ کی ضرورت ہے۔لیکن شاید آپ آسکیں تو میں آپ کو قدرت کی سفاکی اور بے رحمی کا ایک نمونہ دکھانا چاہتا ہوں— میں یہ چھپاؤں گا نہیں کہ میں بہت پریشان ہوں—اور یہ بھی نہیں کہ میں آپ کا انتظار کر رہا ہوں......

میں کھڑکی پر آگیا ہوں—

آج آسمان صاف ہے۔ نیلے آسمانی چادر پر کانپتا ہوا ایک روشن چاند—

ہوا تیز ہوگئی ہے— کتنی ہی آوازیں ہیں جو میرے کانوں میں گونج رہی ہیں......

اس وقت میں ماضی کی خوفناک ٹرین میں اکیلا ہوں۔اور ہزاروں پرچھائیاں مجھے گھیر کر بیٹھ گئی ہیں۔

●●

غلامی سے
فیوڈل سسٹم کی طرف

خلافت تحریک سے
سو راج
اور آزادی تک
تہذیبیں ہماری پرورش کر رہی تھیں /
یا پھر
آزادی کے بطن سے
ایک نئی تہذیب سانس لینے والی تھی /
ایک ڈراؤنی تہذیب

●●

وہ بے حد ڈراؤنا پرندہ تھا
لیکن مجھے یقین تھا
اس تہذیب سے
ایسے ہی ڈراؤنے پرندے جنم لیں گے

(۱)

بلند شہر (یوپی)

۱۴/اگست، ۱۹۴۷ء رات گیارہ بجے—

ابھی ملک کو آزاد ہونے میں پورے ایک گھنٹہ کی تاخیر تھی—اور ٹھیک یہی وقت تھا، اور جیسا کہ مجھے بتایا گیا، میں نے اس عالم فانی میں قدم رکھا—باہر جشن کی تیاریاں عروج پر تھیں۔ سارا شہر جگ مگ، جگ مگ کر رہا تھا...... یقیناً ملک کے دو حصے ہونے کا دکھ بھی شامل تھا۔ مگر برسوں کی غلامی سے آزاد ہونے کے احساس نے لوگوں میں نیا جوش و خروش بھر دیا تھا...... اور جیسا کہ ابّا ہنستے ہوئے بتاتے ہیں— کم بخت نے ایک گھنٹہ بھی انتظار نہیں کیا۔ ارے کم سے کم آزاد ملک میں تو آنکھیں کھولتا—

'پھر سے اللہ کی ناشکری—' دادا ٹھہا کا مار کر ہنس پڑے—اللہ کا شکر ادا کر—بلند شہر کی اس بلند حویلی کو اس کا وارث مل گیا—اور وہ بھی تب، جب تیری عمر ۴۵ سال کی ہوگئی ہے۔ ہم تو نا امید ہوگئے تھے۔ لیکن اللہ سچ مچ بڑا کارساز ہے...... دیکھ اس نے دعائیں قبول کرلیں—اور وہ بھی ایسے وقت جب ملک کو بدترین غلامی سے آزادی کا تحفہ ملا ہے۔ سن وسیع—اس کی قدر کر—یہ آزادی کا تحفہ لے کر آیا ہے—'

کہتے ہیں ایسا بولتے ہوئے دادا کو تیز تیز کھانسی کا دورہ پڑا تھا—اور ٹھیک یہی وقت تھا جب گلاس میں پانی لے کر آتے ہوئے ابّا کو ٹھوکر لگی تھی—

'وسیع سنبھل کر—اب اتنی بھی جلد بازی اچھی نہیں۔'

اور جیسا کہ مجھے بعد میں بتایا گیا، سارے شہر میں روشنی کے دیئے جگ مگ کر رہے تھے۔ آسمان سے آتش بازیوں اور پٹاخوں کی تیز آواز سنائی دے رہی تھی...... بلند شہر کی اس بلند حویلی میں جشن چراغاں کا اہتمام کیا جارہا تھا—ابّا گھٹنے کی چوٹ کو لے کر دکھی تھے۔

'کم بخت نے آتے ہی چوٹ لگادی......'

دادا منہ پھیر کر ہنس رہے تھے۔ ۴۵ سال کے بیٹے کی اس کرتوت پر وہ اسی انداز سے ہنس کر اپنی خوشی ظاہر کیا کرتے تھے۔

میں آزادی سے ٹھیک ایک گھنٹے پہلے پیدا ہوا—

ایک غلام تہذیب میں—اور اس کے ٹھیک ایک گھنٹے بعد ایک آزاد مملکت یا آزاد تہذیب میں پھینک دیا گیا تھا—

ابّا کی مکمل زندگی ہنگامے سے بھری رہی—اس وقت کی بہت سی یادیں مجھ میں ایک درد، ایک جنون جگا دیتی ہیں—بلند شہر کی جس بلند حویلی پر دادا اور ابّا کو ناز تھا۔ اس کے کنگورے گر گئے تھے۔ حویلی کی شان رخصت ہو رہی تھی—اندھیرے در و دیوار، بڑے بڑے خوفناک کمرے—اور اس پوری حویلی پر پردادا کی سلطنت قائم تھی—جو پل میں تولہ پل میں ماشہ تھے۔ ناراض ہوئے تو ہٹلر کی طرح خطرناک—مسکرائے تو ایک دم کسی ننھے بچے کی طرح شرارتی مسکراہٹ کے ساتھ—

مجھ سے سات سال پہلے بھی ایک بھائی ہوا تھا۔ مطیع الرحمٰن کا ردار—لیکن محض دو سال کی عمر اس کے نصیب میں لکھی تھی۔ نمونیہ ہوا اور کچھ ہی دنوں بعد انتقال بھی—دادا اس صدمے کو سہہ نہیں پائے تھے۔ کافی دنوں تک لوگوں سے منہ چھپائے رہے۔ جیسے خود کو موردِ الزام ٹھہرا رہے ہوں—یا پھر نصیب کے لکھے پر آزردہ کہ بلند شہر کی اس بلند حویلی کو کیا اب کوئی وارث نہیں ملے گا—؟ اس لیے اتنے برسوں بعد میری پیدائش بلند حویلی کے لیے خوشیوں کی سوغات لے کر آئی تھی—دادا نے فوراً وضوء بنایا—نماز کے لیے کھڑے ہو گئے—اللہ کے حضور میں دعا کے لیے ہاتھ پھیلایا—اور زور زور سے دربار الٰہی میں روتے ہوئے اس کے احسان عظیم پر شکر کا اظہار کرتے رہے—'تو رب العالمین ہے—رحمٰن و رحیم ہے—رحمٰن و رحیم والے جملے پر مسکرائے۔ دعا ختم کی—آواز لگائی۔ وسیع—چل مٹھائی کے لیے آواز لگا—پوتے کا نام مل گیا۔ اور دیکھ—نام بھی کیسے ملا۔ دعا کرتے ہوئے اللہ نے نام بھیج دیا—رحمٰن—یہ عبدالرحمٰن کا ردار ہے—

اور جیسا کہ بتایا گیا، مجھے گود میں لیے ہوئے دادا کی آنکھیں جل تھل تھیں— ٹپ ٹپ آنسو گرے جا رہے تھے......

●●

صدیوں کی غلامی کے بعد آزادی کا یہ احساس خوشگوار تو تھا لیکن یہ نئی آزادی ہزاروں مسائل لے کر آئی تھی— شروع شروع میں دادا ابّا کے لیے یہ سمجھنا مشکل تھا کہ کون سا شہر ہندستان کا ہے اور کون سا پاکستان کا۔ وہ اکثر ابّا سے لڑتے ہوئے پائے جاتے کہ ایک گجرات یہاں ہے تو پاکستان میں کون سا گجرات ہے؟ پھر اگر پنجاب یہاں ہے تو پاکستان کا پنجاب کون سا ہے— وہ کافی دنوں تک یہ ماننے کو تیار نہیں تھے کہ لاہور اب ہندستان کا حصہ نہیں رہا— وہ اپنے بیحد خاص لب ولہجہ میں ہنس کر ابّا سے کہتے تھے......

'تم ہمیں پاٹھ مت پڑھاؤ— سب پتہ ہے۔ تم تو ٹھہرے مسلم لیگی......'

ابّا کو اس مسلم لیگی کہنے سے چڑھ ہوتی—

'بس آپ ہی نہیں گئے۔ سارے پاکستان چلے گئے—'

'جانے دو۔ بھائی ہم تو نہیں جائیں گے— یہیں پشتوں کی ہڈیاں دفن ہیں۔ اب ایک دو گز زمین اپنی بھی— اب اس بڑھاپے میں پاکستان جا کر کیا کریں گے......'

ابّا حضور، وسیع الرحمٰن کا ردار نے نوجوانی میں مسلم لیگ کو جوائن کر لیا تھا— دادا اس کے سخت خلاف تھے۔ وہ اپنی زمین، اپنی جاگیروں میں خوش تھے۔ لیکن کہاں کی جاگیریں— گزرتا ہوا وقت اپنے ساتھ ساتھ ان جاگیروں کو بھی سمیٹ کر لے گیا تھا—

دراصل اب میں اس پورے نظام کا تجزیہ کر سکتا ہوں— بلند شہر کے اس محلے میں دو تین بڑی بڑی حویلیاں یا کوٹھیاں تھیں۔ وقت کے ساتھ ان کوٹھیوں اور کوٹھیوں میں رہنے والوں کی تقدیروں کو گرہن لگ چکا تھا— یہ مکین بھی جانتے تھے کہ آزادی کا نیا سویرا ان سے بہت کچھ چھیننے

والا ہے— آزادی کے ساتھ ہی بلند شہر کا ماحول بھی بدل گیا تھا۔فرنگی ریسیڈینس خالی کر دیئے گئے تھے۔اوپیرا، کلب ہاؤس بند تھے— سڑکوں پر گھومتی ہوئی فرنگی میمیں واپس اپنی دنیاؤں میں لوٹ چکی تھیں اور کچھ لوٹنے کی تیاریاں کر رہی تھیں— فاقہ کش ہونٹوں پر بھی آزادی کے ترانے تھے مگر آنکھیں فکر میں الجھی— کہ کیا انگریزوں کے بعد ہندستانی دماغ حکومت چلانے میں کامیاب تو رہیں گے—؟ جیسے دادا کا نظریہ بالکل صاف تھا—

جو فرنگی کر گئے وہ یہ ہندستانی کیا خاک کریں گے......ابّا کو اس نظریہ میں غداری کی بو آتی تھی—

'بس اسی لیے— انگریز یہاں اتنی صدی تک حکومت کر گئے۔اسی سوچ کی وجہ سے— ارے بھئی نئی سرکار ہے۔مشکلیں آئیں گی مگر انہیں کام تو کرنے دیجئے—

'یہ دوگز کا لنگوٹ باندھنے والے......'

دادا کا اشارہ گاندھی جی کی طرف ہوتا۔لیکن ان کی ہنسی ابّا کو سنجیدہ کر دیتی—

'اسی دوگز کے لنگوٹ نے آپ کی یہ آزادی آسان کر دی— ورنہ انگریزوں کی غلامی میں پڑے رہتے......

'یہ ایسا برا بھی نہیں تھا—'

'تو اچھا بھی نہیں تھا— غلامی ہمیشہ سے بری ہوتی ہے۔'

'وہ حکومت کرنا جانتے تھے۔'

'تو آپ بھی سیکھ جایئے—' ابّا غصے میں کہتے— بس غلامی— مسلمانوں کے مذہبی رہنماؤں کی ہمیشہ یہی کوشش رہی کہ غلامی کبھی ختم ہی نہ ہو— اور یہی آپ سوچتے ہیں۔'

'اب اس میں مسلم رہنما کہاں سے آ گئے—'

'آپ لائے—'

'میں لایا......' دادا کا چہرہ غصہ میں لال ہو جاتا...... ابّا معلومات کی توپ لے کر بیٹھ

جاتے — قرونِ وسطیٰ کے بادشاہوں نے فوجی جاگیرداری کا جو نظام قائم کیا تھا اس کی بدولت مسلم مزارعوں کی نیم غلامی نے جنم لیا...... یہ لوگ سالہا سال جاگیردار کی زمینوں پر کام کرتے تھے — ہل چلاتے تھے — اور ان کی بنیادی ضرورتیں جاگیردار پوری کیا کرتا تھا — اور وہ بس انہیں اتنی خوراک دیا کرتا کہ یہ لوگ ہمیشہ اس کے غلام بنے رہیں۔

دادا غور سے ابّا کی باتیں سنتے۔ بھنویں تن جاتیں۔ وہ سمجھ جاتے کہ ابّا گفتگو کا اونٹ کس جانب موڑنا چاہتے ہیں۔

'اور جاگیردار ایسے غلاموں سے نہ صرف کھیتوں میں کام لیا کرتے بلکہ وہ ان سے خوب محنت کرواتے — مزارعوں کی بیویاں بھی جاگیرداروں کی حویلیوں میں کام کرتیں — اور زیادہ تر ان کی ہوس کا شکار بھی ہوجاتیں — غلاموں کی روح تک مقروض ہوجاتی — ادھر قرض چڑھتے رہتے۔ سود اتنا بڑھ جاتا کہ اس کی ادائیگی ممکن نہیں ہو پاتی — مزارع کے مرنیکے بعد قرض کی یہ ادائیگی اس کے بیٹے پر واجب ہوتی — پھر نسل در نسل غلامی کا یہ سلسلہ چلتا رہتا —

ابّا سنجیدہ ہوجاتے — انگریز دراصل ہم ہندستانیوں کے ساتھ یہی کررہے تھے — رنج اس بات کا تھا کہ مٹھی بھر ہوتے ہوئے بھی ہم ان کے لیے محض ایک مردہ مزارع سے زیادہ نہیں تھے — اور وہ ہمارے ہی ملک، ہماری ہی زمین پر ہمارا استعمال کررہے تھے......

'لاؤ بھائی حقہ — '

دادا ایسے موقع پر حقہ کی تان چھیڑ دیتے — حقہ لایا جاتا — گہرا کش کھینچتے ہوئے وہ بے خودی میں بڑبڑاتے۔

'بھائی — اچھا برا کیا ہے — تم جانو۔ مگر ہمیں ان فرنگیوں سے کبھی کوئی تکلیف نہیں ہوئی — '

'آپ کو تکلیف ہوتی بھی کیسے — وہ جاگیریں دے رہے تھے۔ آپ لے رہے تھے — اور بھول بیٹھے تھے کہ فرنگی آپ کی روحوں کو بھی مقروض کرتا جارہا ہے......'

●●

انیسویں صدی میں یوروپ کے صنعتی انقلاب کے بعد جاگیردارانہ نظام کو زوال آیا اور اس جگہ اچانک سرمایہ دارانہ نظام نے لے لی۔ بدقسمتی سے ہندستان اور اس سے تقسیم ہوا پاکستان اس نظام سے خود کو الگ نہیں کر سکا— دراصل یہ وہی نظام تھا جو ایک لمبے عرصے تک جدید حکومتوں کے قیام سے پہلے یوروپ اور ایشیاء کے اکثر ملکوں میں رائج تھا— اس نظام کی اپنی خوبیاں تھیں۔ بادشاہ وقت خدمات کے نتیجے میں زمینیں اور جاگیریں عطا کیا کرتے تھے— یہ جاگیردار اپنی خود کی ایک بڑی دنیا آباد کر لیتے۔ جاگیر میں رہنے والوں سے محنت کراتے۔ زمین کا لگان وصول کرتے اور لگان کے کچھ حصے بادشاہ تک جاتے— آزادی کے نئے سورج میں یہ جاگیردارانہ نظام گم تھا— اب سرمایہ داری تھی۔ نئے وقت کی آہٹ تھی...... ابّا حضور وسیع احمد کار دار نئے وقتوں کی ان آہٹوں پر کان لگائے تھے۔ مگر مشکل یہ تھا کہ حالات اور نئے وقت سے سمجھوتہ کرنے کے لیے تیار نہیں تھے—

اِدھر نئی آزادی اپنے ساتھ نفرتوں کا غبار بھی لائی تھی۔ چاروں طرف فرقہ وارانہ فساد ہو رہے تھے— ابھی تک ملک کی ایک بڑی آبادی ایک الگ پاکستان کے قیام کو قبول نہیں کر پائی تھی— ہندو مسلمانوں سے ناراض تھے— اور یہاں سے نہیں جانے والے مسلمان اپنے عقیدے پر قائم کہ وہ ہمیشہ سے وطن پرست رہے ہیں۔ وہ چند ناسمجھوں کی طرح پاکستان جانے کے حق میں نہیں ہیں— لیکن یہ بھی سچ تھا کہ ملک کے مختلف حصوں میں بھڑکتے آگ کے شعلوں میں یہ اعتقاد زخمی ضرور ہو رہا تھا— ایک نیا سورج— ایک نیا ملک— ایک نفرت بھری نئی تہذیب، نئی عبارت لکھنے کی تیاری کر رہی تھی......

اور اسی نفرت بھری تہذیب میں، میں پاؤں پاؤں چلتا ہوا بڑا ہونے کی تیاری کر رہا تھا—

●●

(۲)

وقت کی آندھی دادا جان کو بھی اڑا کر اپنے ساتھ لے گئی۔ ایک شب جو سوئے تو پھر سوئے رہ گئے— صبح اُن کی موت کا پتہ چلا۔ دادا جان کے انتقال سے جاگیردارانہ نظام کا آخری بت بھی ٹوٹ گیا۔ اب ساری ذمہ داری ابّا جان پر تھی— مگر ابّا جان کے کندھے بھی وقت سے پہلے ہی کمزور ہو چکے تھے— بلند حویلی کے در و دیوار خستہ اور اپنی چمک کھو چکے تھے۔ دادا جان آزادی کے نئے سویرے سے خوش نہیں تھے۔ یا اُنہیں اس بات کا شدت سے احساس تھا کہ ماحول بدل رہا ہے۔ یا نئی آزادی نے اچانک جاگیردار اور مزارع سب کو ایک زمین پر لا کر کھڑا کر دیا ہے— وہ بدلتے وقت کی اس آہٹ سے خوفزدہ تھے۔ اور دبی زبان میں ابّا حضور کو سمجھایا کرتے......

'سب چھوٹے بڑے ہو جائیں گے۔ جو کل تک ہمارے سامنے کھڑے ہونے کی ہمت نہیں کرتے تھے' دیکھو آج کیسے سینہ تان کر چل رہے ہیں۔ یہی آزادی کی سوغات ہے۔ جس نے بڑے چھوٹے کے فرق کو ہی ختم کر دیا ہے— اس آہٹ کو سنو وسیع، ورنہ یہ برا وقت تمہیں نگل جائے گا—'

ابّا قرآن شریف اور حدیث لے کر بیٹھ جاتے— ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز— کہاں ہے کوئی چھوٹا یا بڑا؟ جو محنت کرے گا، فصل اسی کی ہے—'

'کر سکو گے محنت؟'

'کیوں نہیں—'

'سوچ لو— اسی جاگیردارانہ نظام میں پلے بڑھے ہو۔ سونے کا چمچہ لے کر—'

'اب اس چمچے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔'

'کہنا آسان ہے— کرنا مشکل—'

'میرے لیے کوئی مشکل نہیں ہے۔'

'پرانی یادیں بھولی نہیں جاتیں— نئے مسائل بہت دکھ دیں گے۔ ٹھہر ٹھہر کے پرانی

یادیں چوٹ پہنچاتی رہیں گی۔'

'دیکھا جائے گا—'

'حکومت کرنے والے رہے ہو— ابھی بھی کون سی حکومت چلی گئی۔ گھر میں یہ حکومت اب بھی ہے۔ نوکر چاکر— پانی بھرنے والا بھشتی۔ کتنے ہی خاندان ہیں جو اس کاردار گھرانے سے وابستہ رہے۔ ہم نے انہیں بھر بھر جھولیاں خیرات بانٹیں—

'خیرات نہیں— محنت کی کمائی—'

'یہ تمہاری سمجھ پر منحصر ہے۔ میرے لیے خیرات— جو آیا خالی ہاتھ نہیں گیا— ہم دینے والے ہاتھ رہے ہیں۔'

'لیکن یہ دینے والے ہاتھ تو کب کے کٹ گئے—' ابّا بھی کب ہار ماننے والے تھے— اب یہ دینے والے ہاتھ نہیں ہیں۔ کمزور ہاتھ ہیں—'

'تمہارے ہوں گے۔ میرے ہاتھ تو اب بھی مضبوط ہیں۔ اچھا ہے جو اس منحوس وقت کے ستم دیکھنے سے پہلے ہی آنکھیں بند ہو جاتیں' دادا جذباتی ہو جاتے—

ابّا کا ایک ہی جواب تھا— آخر وقت کو بدلنے کا حق حاصل کیوں نہیں ہے؟ کیوں غلامی پسند ہے آپ کو— اب کوئی غلام نہیں— فرنگیوں نے آپ کو وفاداری کے بدلے سہولتیں دیں— لیکن ذہن کو غلام بنا دیا— اس آزاد فضا میں اس ذہن کو آزاد کیجیے ابّا حضور— نیا سورج ہے۔ نیا سویرا ہے— اس سویرے کو خوش آمدید کہیے— اب یہاں سب کو کچھ نہ کچھ کرنا ہوگا— ملک کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنا ہوگا۔'

'کہہ تو ایسے رہے ہو جیسے اس ملک سے جو مانگو گے' مل جائے گا۔ ابّا جناح کی مثال دیتے تھے۔ کیوں الگ ہوا پاکستان۔ تم بھی تو یہی کہتے تھے جو قائداعظم کہہ رہے تھے۔ یعنی جو قوم آپ کے ہاتھ سے ایک گلاس پانی نہیں پی سکتی، وہ آپ کو آپ کا حق کہاں دے سکتی ہے—'

'حق ملے گا—'

'نہیں ملے گا— میری بات یاد رکھنا،' دادا حضور کی آنکھوں میں نمی لہراتی— 'تم زندگی بھر پاکستان کا طعنہ سنتے رہو گے۔ یہاں کی نسلیں پاکستان کے طعنے سنتی ہوئی بڑی ہوں گی۔ تمہیں کیا لگتا ہے، تمہارے ملک کے لوگ کبھی یہ حادثہ بھول پائیں گے کہ ایک دن تم لوگوں نے اسی ملک سے اپنا ایک ملک الگ کر لیا تھا— پاکستان۔ نیا ملک، جہاں سارے مسلمان ایک ساتھ رہیں گے۔ تمہیں کیا لگتا ہے آنے والے وقتوں میں تمہیں اس جرم کے لیے معاف کر دیا جائے گا—؟ نہیں میاں کاردار— قطعی نہیں۔ یہ دنگے دیکھ رہے ہو۔ ابھی تو نفرت کی شروعات ہے۔ ابھی تو نفرت کی یہ تہذیب شروع ہوئی ہے۔ آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا— سچ کہوں تو میں بھی پاکستان جانے کے حق میں تھا۔ مگر میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ شاید وہاں اس سے زیادہ پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑے۔ کئی بار میرے ارادوں نے مجھے کمزور کیا، کہ تم ٹھیک کہتے ہو— پاکستان چلا جانا ہی ٹھیک ہے۔ سب جا رہے ہیں۔ کہہ سکتے ہو، کہیں نہ کہیں وہ آسائشیں اور سہولتیں بھی تھیں، ہم جن میں جینے کے عادی ہو چکے ہیں۔ اس لیے پاکستان نہیں گیا— یہ حویلی— یہ گھر' گھرانہ— یہاں کی مٹی، یہاں کی خمیر نے روک لیا مجھے— لیکن اب دوبارہ تمہیں لے کر یہ شک میرے رگ و پے میں سرایت کرتا جا رہا ہے کہ یہاں سے نہیں جا کر میں نے کوئی بھول تو نہیں کی وسیع کاردار؟ ہم تو اپنی عمر گزار چکے— مگر اب تم ہو۔ تمہارے بعد کی نسلیں ہیں۔ یہ سوچ سوچ کر دل ڈرتا ہے کہ آنے والے وقتوں میں بار بار تمہیں تقسیم کے نام پر شرمندہ ہونا پڑے گا— تمہیں بار بار اپنی صفائی دینی ہوگی— اور اس طرح یہ ملک، یہ خطہ، یہ زمین تمہاری ہو کر بھی تمہاری نہیں ہوگی— اور کتنی عجیب بات— اپنے ملک کو اپنا ملک کہنے کے لیے بھی تم صفائی دو گے— جیسے اپنے گھر کو اپنا گھر بتانے کے لیے— اور اسی صفائی دینے میں تمہاری عمر نکل جائے گی......'

'ایسا نہیں ہوگا—'

ابّا کے لفظ کمزور تھے۔ وہ اپنے کمرے میں لوٹ آئے— مگر دادا جان کے لفظوں کی سچائیاں زندہ تھیں۔ وہ ان سچائیوں کو نئے ماحول میں مسلسل پھلتے پھولتے ہوئے دیکھ رہے تھے—

بدلتے وقت کی آہٹ مل چکی تھی— مگر ابّا جان عمر کی اس منزل پر تھے جہاں جوش وخروش کی بنیادیں ہل چکی ہوتی ہیں۔ کچھ زیادہ کرنے کا جذبہ سو چکا ہوتا ہے۔ انہوں نے بہت ہاتھ پاؤں مارے مگر خود کو نئے ماحول کے سانچے میں ڈھال نہیں سکے— دادا حضور کی زندگی تک کتنی ہی جاگیریں بک چکی تھیں— ابھی بھی کھیت بدھار تھے— زمینیں تھیں۔ آم کے باغات تھے— سبزی منڈی کا گولہ تھا جہاں سے مال گزاری آتی تھی— مگر بدلتے وقت کے ساتھ ان لوگوں نے ہاتھ کھڑے کرنے شروع کر دیئے— سبزی منڈی کے گولہ سے پیسوں کا آنا بند ہو گیا— دیکھتے ہی دیکھتے آس پاس نئے نئے مکانات کھڑے ہونے شروع ہو گئے۔ دکانیں بڑھ گئیں۔ دلّی سے قریب ہونے کی وجہ سے یہاں بھی ترقیاتی کاموں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہوا— تہذیب کی نئی آندھی میں پرانے درخت اکھڑنے لگے تھے— اوران کی جگہ نئے درخت لے رہے تھے۔

شاید یہی زمانے کا اصول تھا—

ابّا حضور اس سچ کو سمجھتے ہوئے بھی مجبور تھے—

میں نے ہوش سنبھالا تو بلند شہر کی اس بلند حویلی کے در و دیوار پوری طرح اپنی آن بان شان کھو چکے تھے— مگر کسی طرح اس شان کو قائم رکھنے کی کوشش جاری تھی۔ نوکر چاکروں کی فوج ہٹا دی گئی— باہر جو جگہ ان کے رہنے کے لیے دی گئی تھی، اس جگہ تین چار دکانیں نکل آئیں— دکانیں اس طرح نکالی گئیں کہ حویلی کے مین دروازے سے اس کا کوئی تعلق نہ ہو— اور کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ کاردار خاندان اب ان دکانوں کے کرائے کے بھروسے زندہ ہے— پانی بھرنے والے پرانے خادم عبدل بھشتی کو بھی جواب دے دیا گیا— اب لے دے کر ایک خانسامہ تھا، ایک مریم بوا تھیں— اور حویلی کی عزت و ناموس کو بچائے رکھنے کی ذمہ داری ابا حضور کے ناتواں کندھے پر تھی—

میں اسکول میں آ گیا تھا۔ اور شاید آہستہ آہستہ میں نے سب کچھ دیکھنا اور سمجھنا شروع کر دیا تھا۔

●●

(۳)

پڑوس میں ہی نظر محمد کی کوٹھی تھی۔ایک زمانے میں اس کوٹھی کی شان نرالی تھی۔ کہتے ہیں بڑا دروازہ اتنا بڑا تھا کہ ہاتھی گزر جائے— گھر کی عورتوں کو گھومنے کا بیحد شوق۔ ہر وقت پالکی تیار رہتی۔مگر یہ سب باتیں میرے ہوش سنبھالنے سے پہلے کی باتیں تھیں— کوٹھی کو لے کر ہزار طرح کی باتیں مشہور تھیں— جیسے یہ کہ اس کوٹھی میں جنات کا بسیرا ہے۔مگر برا ہو کہانی بنانے والوں کا، کبھی کسی نے کسی آسیب یا جنات کو دیکھا نہیں تھا۔بس سنی سنائی کہانیاں ہی رہ گئی تھیں— نظر محمد گاندھی جی کے مخالفوں میں ایک تھے— ان کا بس چلتا تو وہ کب کا گاندھی جی کو گوڈ سے سے پہلے ہی شوٹ کر چکے ہوتے۔ان کے پاس ہر بات کا ایک ہی جواب تھا۔

ملک تقسیم کیوں ہوا......؟

سب گاندھی نے کرایا—

لیکن گاندھی جی تو مسلمانوں سے بیحد محبت کرتے تھے—؟

ارے ایک نمبر کا ڈھونگی تھا۔ وہ چاہتا ہی نہیں تھا کہ کوئی مسلمان کبھی اس ملک کی کمان سنبھالے۔ دیکھا، نہرو کے ہاتھ میں ملک کی باگ ڈور دے دی۔ جناح کو بھی تو دے سکتے تھے—

'لیکن گاندھی جی نے تو خود جناح کا نام تجویز کیا تھا—'

'ارے سب ڈھونگ— پاکستان بنوانا تھا۔سو بنوا دیا— کہ آدھے اِدھر کٹو۔ آدھے اُدھر کٹو—بس کٹتے مرتے رہو—'

ابّا کو اس بحث میں مزہ آتا تھا۔ وہ نظر محمد کو چڑھانے کے لیے گاندھی جی کی تعریفیں شروع کرتے تو نظر محمد گاندھی جی کی ذاتی زندگی پر حملہ کرنے بیٹھ جاتے۔

'دیکھا نہیں۔ننگا رہتا ہے—'

'وہ اپنا کپڑا خود اپنے ہاتھوں سے بنتے ہیں۔ اپنی گندگی خود صاف کرتے ہیں۔اسی لیے تو

باپو کہلاتے ہیں۔'

'اور آشرم میں —' نظر محمد ایک آنکھ مار کر بولتے — سنی سنائی بات نہیں ہے۔ آنکھوں دیکھی بات ہے — گاندھی جی کے آشرم میں عورتیں ننگی رہتی ہیں۔'

'سب بکواس — گاندھی جی برہم چریہ کا پالن کرتے ہیں — اور اس کے بارے میں سب کچھ اپنے اخبار میں لکھ چکے ہیں۔'

'یہ کیسا برہم چریہ ہے کہ ننگی عورتوں کے ساتھ سو جاؤ۔'

'نظر بھائی — اب ملک آزاد ہو چکا ہے۔ کیوں گاندھی جی کے پیچھے پڑے ہیں آپ......'

'یہ نفرتیں برداشت نہیں ہوتیں وسیع بھائی — ان نفرت بھری آنکھوں کے بارے میں سوچتا ہوں تو فرنگیوں سے زیادہ مجرم گاندھی جی لگتے ہیں۔ پورا ہندستان ان کی بات سنتا تھا — پھر وہ تقسیم کے سوال پر اڑے کیوں نہیں؟ بٹوارہ کیوں پسند کیا؟

'گاندھی جی نے ہمیشہ تقسیم کی مخالفت کی — بلکہ آخر آخر تک وہ اس کی مخالفت کرتے رہے — بھوک ہڑتال پر بیٹھے — آمرن انشن کیا — مگر جب فضا ہی ناسازگار ہو تو کوئی کیا کر سکتا ہے —'

لیکن نظر محمد یہ قبول کرنے کو تیار نہ تھے — آزادی کے بعد کا خونی تماشہ سامنے تھا اور وہ اس کے لیے گاندھی جی کو ہی قصوروار ٹھہراتے تھے —

ابّا کی نظروں میں نظر محمد ان بہت سارے مسلمان لوگوں میں ایک تھے جو گاندھی جی کی مسلم دوستی کو فرقہ پرستی کی عینک سے دیکھتے تھے — لیکن شاید اس نظریہ کے پیچھے آزادی کی ملی سوغات میں اس تحفہ کو دخل تھا جو فرقہ وارانہ دنگے کے جراثیم اپنے ساتھ لے کر آئی تھی — کوٹھی بھی اب ویران ہو رہی تھی۔ نظر محمد کے والد نوجوانی میں ہی انتقال کر چکے تھے — ساری ذمہ داری نظر محمد کے کندھے پر تھی۔ ایک بیٹا تھا نور محمد۔ بیوی ہمیشہ بیمار رہتی تھیں — اور یہ شک نظر محمد کو بھی تھا کہ ان

کی بیوی پر کسی جنّات کا سایہ ہے—

ابا سمجھاتے تھے۔ یہ تمہارا وہم ہے......

'لو— اب جنات کی حقیقت سے تو انکار نہیں کرنے لگے' ارے ان کا تذکرہ قرآن شریف میں بھی آیا ہے—'

'ابّا کمزور پڑ جاتے— لیکن ان کی بیماری کی وجہ کچھ اور ہے— انگریزی دواخانے کھل رہے ہیں۔ آپ کسی اچھے ڈاکٹر سے رجوع کیوں نہیں کرتے......'

'بھیّا۔ کوئی فائدہ نہیں— جس پر جن کا سایہ ہو، بھلا ڈاکٹر کے پاس اس کا کیا علاج ہوگا— جھاڑ پھونک ہی واحد علاج ہے—'

اس لیے بیوی کی صحت کو لے کر وہ ہمیشہ ادھر سے اُدھر چکر لگاتے رہتے۔ کبھی کسی تانترک یا بابا کے پاس— کبھی کسی جنّاتوں والے مولوی کے پاس— نتیجہ یہ ہوا کہ بھوت پریت سے متعلق ہزاروں کہانیاں ان کے پاس جمع ہوگئی تھیں۔ جیسے یہ کہ ملکی چک والے گھر میں ایک حسین خاتون پر جنات کا سایہ تھا— روز اس خاتون کے تکیہ کے نیچے سے سونے کے سکّے نکلتے تھے— ایسی ہزاروں کہانیاں۔ ابّا ان کہانیوں کو سن کر بس مسکرا کر رہ جاتے— لیکن پھر یوں ہوا کہ آہستہ آہستہ وہ ان سے نظریں بچانے لگے۔

'ان دنوں نظر محمد بہت عجیب عجیب سی فرمائش لے کر گھر آنے لگے— ابّا ان فرمائشوں کو سن کر چونک جاتے۔'

'ایک سفید کاغذ چاہیے۔'

ابّا نے سوچا کہ شاید کچھ لکھنے کے لیے کاغذ کی ضرورت ہوگی، اس لیے اندر آئے اور کاغذ لا کر نظر محمد کے حوالے کر دیا۔ نظر محمد نے کاغذ پر ایک نگاہ ڈالی پھر گویا ہوئے۔

'نہیں— اس پر داغ ہے۔ ایسا سفید کاغذ، جس پر کوئی داغ نہ ہو۔'

’ابّا زور سے ہنسے — ارے میاں لکھنا ہی تو ہے۔ اتنا سفید کاغذ کیا کرو گے —‘

نظر محمد کی نظر جھکی تھی — بس ویسا ہی کاغذ چاہئے۔

اس بار ابّا کچھ پریشان ہو کر اندر آئے — ایک سفید کاغذ لیا — اور نظر محمد کی طرف بڑھا دیا۔ نظر محمد نے باریک نظروں سے اس کاغذ کا جائزہ لیا —

’ہاں یہ ٹھیک ہے —‘

’مگر کرو گے کیا؟‘

’ہے کچھ کام......‘

’لیکن صرف ایک کاغذ......‘

’ہاں......‘

’لیکن بھلا ایسا کیا کام آ پڑا —‘

اس بار نظر محمد چپ — کچھ دیر خاموش کھڑے رہے۔ پھر اجازت لے کر چلے گئے — ابّا نے یہ خبر امّی کو سنائی تو وہ اچھل پڑیں۔

ایک سفید کاغذ......؟

ہاں —

جس پر کوئی دھبّہ نہ ہو؟

ہاں —

اور جو پہلے آپ نے کاغذ دیا، اس پر دھبہ تھا۔

ہاں کچھ داغ لگا تھا......

اور آپ نے سن لیا — اور دے بھی دیا......؟

ہاں — کیا کرتا......

کیا کرتا؟ اماں زور زور سے چیخ چیخ کر رونے لگیں۔ ابّا پریشان — اب یہ کیا مصیبت

سامنے آگئی۔

امّاں روتے ہوئے کہہ رہی تھیں — ارے اس کلموہے کو کیڑے پڑیں — یہاں تو اپنی بس ایک اولاد ہے۔ وہ عمل کرنے بیٹھا ہے۔ بیوی پر جنّات کا سایہ ہے۔ وہ اس کا توڑ کرے گا — اسی لیے اس نے ایک ہی سفید کاغد کی مانگ کی —

تمہارا دماغ خراب ہوگیا ہے۔ ابا زور سے چیخے —

'میرا دماغ نہیں خراب ہوا ہے۔ میں نے ہزار بار کہا تھا۔ اس کوٹھی سے رشتہ مت رکھیے۔ وہاں بھوت کا سایہ ہے۔ مگر آپ ہیں کہ مانتے ہی نہیں — اور دیکھا، کس ہنسی کھیل میں وہ آپ سے سفید کاغذ مانگ کر لے گیا۔ اب دیکھیے۔ وہ کچھ اور مانگنے آئے گا — مگر خبردار — اب کوئی بھی چیز مجھ سے پوچھے بغیر مت دیجئے گا —'

ابّا کا سر چکرا گیا تھا۔ ساری دنیا نظروں کے آگے گھومتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی — توہمات یا اندھ وشواس کہیں نہ کہیں ہمارے اندر بیٹھے ہوتے ہیں۔ ہم چاہے اُنہیں نہ مانتے ہوں لیکن کچھ ایسی باتیں جو گھر، گھرانے یا بچوں سے وابستہ ہوں، وہاں ہم کمزور ہو جاتے ہیں — لیکن ابّا شرمیلے تھے — شریف انسان عام طور پر شرمیلا ہوتا ہے۔ ابّا کبھی یہ پوچھنے کی ہمت نہیں کر سکے کہ آخر ایک سفید کاغذ منگانے کی ضرورت کیا تھی —

اماں کے شک اور یقین کو اس وقت تقویت ملی جب اچانک رات گئے میری طبیعت خراب ہونے لگی — پہلے سر میں چکر — پھر بخار — سارا جسم بخار سے جل رہا تھا۔ اماں زور زور سے چیخ رہی تھیں — نظر محمد کو سو صلوٰۃ سنائے جا رہے تھے......

'میرے بیٹے کو کچھ ہوا تو میں اس کے خاندان میں کسی کو بخشوں گی نہیں — میرے لاڈلے کو نظر لگ گئی ہے......'

پھر نظر اتاری گئی — لال مرچی جلائی گئی — اور یہ کیا، ذرا بھی مہک نہیں — دیکھا، میں نہ کہتی تھی......اماں کو دوبارہ چیخ و پکار کرنے کا موقع مل گیا تھا —

’نظر لگ گئی ہے میرے بیٹے کو، میرے لاڈلے کو......‘

نظر اتارنے کے بعد اماں میرے سرہانے بیٹھ گئیں۔ دعا پڑھ پڑھ کر مجھے پھونکنے لگیں— ساری رات گھر کے لوگ جاگتے رہے۔ میں ساری رات غنودگی یا نیم بیہوشی کے عالم میں رہا— اور اماں مسلسل مجھ پر دعاؤں کی بارش کرتی رہیں۔ ساری رات ابّا گھر کے آنگن میں ٹہلتے رہے— جیسے اپنی غلطی پر پشیمان ہوں۔ سوچ رہے ہوں کہ کیا سچ مچ آج کے سائنسی دور میں یہ ممکن ہے؟ کیا سچ مچ نظر لگتی ہے؟

لیکن دوسرے دن سے ہی میرا بخار اترنا شروع ہو گیا۔ دوپہر تک بخار اتر چکا تھا۔ اماں کو یقین تھا، دعاؤں سے اور نظر اتار کر انھوں نے نظر محمد کے عمل کی کاٹ کر دی ہے— اُنہیں یہ بھی یقین تھا کہ وہ ہار نہیں مانے گا— وہ ایک بار پھر ان کی چوکھٹ پر آئے گا—

لیکن ابا مطمئن تھے۔ آنے دو۔ اس بار وہ ناامید ہو کر جائے گا۔

●●

ایک آسیب زدہ تہذیب کے دروازے کھلے تھے۔ میرے لیے یہ سب کچھ حیران کرنے والا تھا— کیا اس چھوٹی سی دنیا میں یہ سب بھی ہوتا ہے۔ امّی، ابو کے گفتگو سے نکلنے والے جملے اب میری سمجھ میں آنے لگتے تھے— آسیب، جنات......سایہ......میں تہذیب کے نئے لاؤلشکر پر سوار نئے نئے لفظوں سے متعارف ہو رہا تھا۔

بلند حویلی میں ایک زمانے میں انسانوں سے زیادہ جانوروں کی آوازیں گونجا کرتی تھیں— بڑے ہونے تک میں نے اس گھر میں کئی کتّے دیکھے۔ دو تین پالتو بلّیاں۔ دادا مرحوم کو کبوتروں سے عشق تھا— وہ ہر روز صبح چھت پر کبوتروں کو دانہ کھلاتے۔ پھر انہیں ہاتھ کے اشارے سے آسمان میں اڑا دیتے— شام کے وقت یہ کبوتر دوبارہ اپنی پناہ گاہوں میں واپس آجاتے۔ دادا مرحوم کے انتقال کے بعد ابّا کے لیے یہ سب مشکل کام تھا— کبوتر اڑا دیئے گئے— کچھ کبوتر بہت

دنوں تک اپنی پناہ گاہوں میں واپس آتے رہے۔ لیکن مہینے دو مہینے گزرنیکے بعد شاید انہیں بھی اس بات کا احساس ہوگیا کہ جو شخص اُنہیں دانہ کھلایا کرتا تھا، اب وہ اس دنیا میں موجود نہیں ہے — دادا مرحوم نے تمام کبوتروں کے نام رکھ چھوڑے تھے — ابّا واپس آئے ان کبوتروں کو حسرت سے دیکھتے — اور آنکھوں میں آنسو لیے واپس اپنے کمرے میں آجاتے۔

کبوتروں نے یقیناً اپنی نئی پناہ گاہیں تلاش کر لی ہوں گی۔ اسی طرح صحن میں مرغی کے دربے بنے ہوئے تھے — ہر وقت ان کی ککڑوکوں کی آوازیں فضا میں گونجتی رہتیں۔ ان مرغیوں میں ایک سفید رنگ کا اصیل مرغ بھی تھا۔ صحت مند۔ دربے کا بادشاہ۔ دوسری مرغیوں کو ٹھور سے مارتا ہوا — اور کبھی خوش ہوکر اپنی بادشاہت کا اعلان کرتا ہوا — کچھ دنوں بعد نظر محمد دوبارہ ابّا کے پاس آئے۔

'مجھے ایک دن کے لیے اصیل مرغ چاہئے......'

'وہ سفید والا......'

'ہاں......'

بیٹے کی محبت جاگ گئی تھی — ابّا زور سے چیختے تھے — 'سفید کاغذ، سفید مرغ — کسے مارنا چاہتے ہو نظر محمد؟ مجھے یا میرے بیٹے کو؟ عمل یا جادو ٹونہ کرنے کے لیے تمہیں کوئی اور نہیں ملا — اپنی بیمار بیوی کی صحت کے لیے میرے خاندان کی قربانی لینے آئے ہو......؟'

نظر محمد چپ — آنکھیں جھکی ہوئی — پاؤں منجمد — جیسے کاٹو تو خون نہیں — تھر تھر کانپ رہے تھے۔

ابّا زور سے چلّائے —

'برسوں کی دوستی کا تم نے گلہ گھونٹ دیا نظر محمد — اب کبھی بھول کر بھی بلند حویلی کا رخ مت کرنا — ہمارے لیے بھی تمہاری کوٹھی پرائی ہوگئی —'

دروازے پر امّاں کھڑی تھیں۔ ان کا ہاتھ تھامے میں کھڑا تھا — دماغ میں کتنے ہی سوال

گونج رہے تھے — تو کیا یہ مجھے مارنے آئے تھے — لیکن کیوں؟

ابّا نے اشارہ کیا — اماں مجھے لے کر دروازے سے ہٹ گئیں۔ ابّا دیر تک زور زور سے چلاّتے رہے — آس پاس کی کھڑکیاں کھل گئی تھیں — کچھ لوگ اپنے اپنے دروازے پر کھڑے یہ تماشہ دیکھ رہے تھے —

نظر محمد چلے گئے —

ابّا واپس کمرے میں آ گئے —

کوٹھی سے برسوں کا یارانہ ایک لمحے میں ٹوٹ گیا — ابّا بغیر کچھ بولے اپنے بستر پر دراز ہو گئے —

تب تک میں بارہ سال کا ہو چکا تھا — آزادی کا مفہوم کچھ کچھ میری سمجھ میں آنے لگا تھا — لیکن مسلسل چلنے والے ان واقعات نے مجھے زخمی کیا تھا — جیسے میں یہ سوچ رہا تھا کہ آزادی کتنی ڈراؤنی ہے؟

بلند حویلی کے ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں رات کے وقت جاتے ہوئے مجھے خوف کا احساس ہوتا تھا — یہاں تک کہ رات کے وقت پاخانہ جاتے ہوئے بھی مجھے ہول آتا تھا — رات کے سناٹے میں یہ پوری حویلی مجھے بھوتوں کی ایک پراسرار دنیا معلوم ہوتی تھی......

ملک کی آزادی کے ساتھ ساتھ میں بھی بارہ سال کا ہو گیا تھا — تب میں نے پہلی بار کچھ لکھنے کی جرأت کی تھی۔

‘میں اور میرا ملک سہانا
دونوں بارہ سال کے ہیں
میں اور میراملک سہانا
دونوں ابھی تک بچے ہیں
دونوں ہیں ایک کھیل میں گم

دونوں کو ڈر لگتا ہے......

میں اور میرا ملک سہانا۔

دونوں بارہ سال کے ہیں......'

شاید پہلی بار ڈر اور خوف کے اس ماحول میں' میں نے اپنے اندر کے فنکار کو آواز دی تھی۔ اسکول کی کاپی پر ٹوٹے پھوٹے جملے میں یہ چند لائنیں لکھ کر میں ابّا کے کمرے میں داخل ہوا تھا— ابّا سو رہے تھے— میں نے چپکے سے یہ کاغذ ابّا کے سرہانے رکھ دیا—

شاید میں نے اپنی شناخت کے لیے ایک نیا پر خطر راستہ چنا تھا— لیکن یہ وہ راستہ تھا، جس راستہ پر بلند حویلی کی پشتوں میں بھی کوئی نہیں چلا تھا۔ جاگیردارانہ نظام کو گھن لگ چکا تھا اور میرے وجود میں چپکے چپکے ایک فنکار جاگنے لگا تھا—

میں اپنے دوست نور محمد کو اپنی اس پہلی ادبی کاوش کے بارے میں بتانا چاہتا تھا۔ وہ میرے ہی اسکول میں تھا۔ مجھ سے دو کلاس جونیئر— حویلی کے بچوں کو گھر سے باہر نکلنے کی پابندی تھی۔ ابّا بھی بڑے ہونے تک گھر سے باہر نہیں نکلے— بس اسکول یا اسکول سے گھر— کہیں اور جانے کی اجازت ہی نہیں تھی۔ ہاں، نور محمد کی کوٹھی پڑوس میں تھی اس لیے بعض اوقات وہ کھیلنے کے لیے بلند حویلی آجاتا۔ یا میں' اس کی کوٹھی چلا جاتا۔

وہ اپنے گھر کے دروازے کے باہر سیڑھیوں پر کھڑا تھا۔ سہا سا— میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا— دوسرے ہی لمحے وہ مسکراتا ہوا میرے ساتھ چل پڑا— میں اسے لے کر حویلی کے صحن میں آ گیا— اس وقت صحن میں سنّاٹا تھا۔ میں نے جیب سے اس کاغذ کے ٹکڑے کی نقل نکالی جو میرے خیال سے میرا پہلا بڑا ادبی معرکہ تھا۔

نور محمد کا رنگ سانولہ تھا۔ وہ عمر میں بھی مجھ سے تین سال چھوٹا تھا۔ چہرہ بے حد معصوم۔ قد میں بھی مجھ سے چھوٹا مگر صحت مند۔ اس کی آنکھیں گول تھیں۔ وہ اپنی گول گول آنکھیں نچاتا ہوا مجھے بہت عجیب نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

یہ تم نے لکھی ہیں......؟

ہاں......

بے...... مان ہی نہیں سکتا۔

بے، نور محمد کا تکیہ کلام تھا۔

'آخر کیوں نہیں مان سکتے'

کیوں کہ تم اتنے چھوٹے—— تم اسے لکھ ہی نہیں سکتے۔

لیکن میں نے ہی لکھا ہے۔

پھر ضرور ابّا سے ٹھیک کرایا ہوگا——

'اللہ کی قسم——' میں نے کھٹ سے قسم کھائی۔ کسی نے بھی نہیں بتایا۔ میں نے خود سے لکھا ہے۔

'پھر تو کمال ہے......' اس کی گول گول آنکھوں میں چمک آ گئی تھی——

پھر تو آج تم مجھ سے بہت بڑے ہو گئے۔

وہ کیوں؟

کیونکہ تم یہ سب لکھنے لگے ہو......

ارے نہیں—— وہ تو بس یونہی—— اور نور محمد۔ میں کوئی بڑا اوڑا نہیں ہوا۔ بس وہی ہوں۔ تیرا دوست عبدالرحمٰن......'

لیکن نور محمد سنجیدہ تھا—— تم بڑے ہو گئے ہو۔

اور یہ وہی لمحہ تھا' جب یکا یک اُس نے پہلی بار اپنے آپ کو میرے سپرد کر دیا تھا——

میرے دوست رہو گے نا......؟

ہاں ہمیشہ......

میں جب بھی کچھ پوچھوں بتاؤ گے نا......؟

ہاں— ہمیشہ۔ اللہ کی قسم......

پھر ٹھیک ہے......وہ ہنس رہا تھا۔ اب تمہارے ساتھ کھیلنے میں مزہ آئے گا—

لیکن کیا خاک کھیلنے میں مزہ آتا، جانے کہاں سے جنات کی طرح امی صحن میں آگئیں— غصے سے آنکھیں نکال کر نور محمد کو دیکھا۔ میرا ہاتھ تھاما اور زور سے چلاّئیں۔

'تو یہاں کیا کر رہا ہے......؟'

'مجھے رحمٰن لایا تھا۔'

'اب خبردار جو یہاں آیا— پاؤں کاٹ کے رکھ دوں گی—

نور محمد کی سٹّی پٹّی گم تھی۔ وہ روتا ہوا بھاگ کھڑا ہوا۔ امی نے زور سے میرے ہاتھوں پر اپنی گرفت سخت کر دی تھی۔

اور تم بھی سن لو رحمٰن— آئندہ اس بچے سے ملنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے— اس کے گھر جادو ٹونہ ہوتا ہے۔ سمجھ رہے ہو نا تم— بس آج کے بعد کوٹھی جانا بند اور کبھی میں نے سن لیا کہ تم کوٹھی گئے ہو تو تمہارے بھی ہاتھ پاؤں کاٹ ڈالوں گی—'

اماں کمرے میں واپس آنے کے بعد بھی دیر تک نور محمد کے خاندان کو کھری کھوٹی سناتی رہی تھیں۔

میں سناٹے میں تھا۔

اور یقینی طور پر آزادی سے تحفے میں ملی، نئی تہذیب کے عفریت مجھے ڈرانے لگے تھے۔

●●

صبح ہو گئی تھی۔

میں پرچھائیوں کے حصار سے باہر نکل آیا تھا۔

ماضی کی ٹرین چھک چھک کرتے ہوئے رک گئی تھی۔

پروفیسر نیلے، بندر اور آزادی

'عام طور پر مہذب سماج میں ہی/
جمہوری حملے/
تیز ہوتے ہیں'

●●

ہم ایک جنگ سے نکل کر
دوسری جنگ کی طرف بڑھتے ہیں

جیسے
ایک تہذیب سے نکل کر
دوسری تہذیب کی طرف

(۱)

صبح ہی صبح گھر میں جنگ کا ماحول تھا— حلیمہ دیر سے اٹھی تھی اور ابو بابا اُس پر ناراض ہو رہے تھے۔

صاحب کی تو فکر کیا کرو— وہ صبح سویرے اٹھ جاتے ہیں۔ صبح صبح اُنہیں بیڈ ٹی پینے کی عادت ہے—'

'ساری رات بخار سے جلتی رہی......'

'لو— اور میں امریکہ گیا ہوا تھا— جیسے مجھے پتہ ہی نہیں— اب بہانے مت بناؤ۔ میں بھی وہیں تھا' جہاں تم تھی—'

'لیکن آپ تو گھوڑے بیچ کر سو رہے تھے۔'

'گھوڑے ہیں کہاں جو بیچوں گا— اور اب بہانے بنانا چھوڑو— جلدی سے صاحب کے لیے چائے کا انتظام کرو—'

سارہ ہنس رہی تھی—

میں نے ایک اچٹتی نظر ان دونوں پر ڈالی— اور صحن میں کرسی نکال کر اخبار پڑھنے بیٹھ گیا۔ کچھ ہی دیر بعد موبائل کی گھنٹی بجی۔ یہ میرے بیٹے کا فون تھا—

'آپ کی طبیعت کیسی ہے۔'

میں زور سے ہنسا— پہاڑیوں کی طبیعت کیسی ہوتی ہے۔ ایک دم فٹ۔

'لیکن آپ پہاڑی نہیں ہیں۔ پہاڑ پر جا کر بس گئے ہیں—' بیٹا سنجیدہ تھا— 'آپ کی صحت کو لے کر تشویش رہتی ہے۔ اس لیے سارہ جب بھی جانے کی ضد کرتی ہے، اسے روکتا نہیں— لیکن اب سارہ کا کالج کھل گیا ہے— اُسے آنا ہوگا۔ پھر آپ اکیلے ہو جائیں گے۔

'اکیلے کیسے— ابو بابا اور حلیمہ ہیں نا......'

'اس کی آواز میں درد چھپا تھا— پھر بھی ہم چاہتے ہیں ابو کہ آپ ہمارے ساتھ رہیں—

اس عمر میں آپ کا اکیلے رہنا ہم دونوں کو پسند نہیں ہے—'

میں نے بیٹے کی بات مسکرا کر کاٹ دی—ایسا کرو جب تم دونوں کو وقت ملے، تم دونوں بھی یہاں آجاؤ۔ اور میں تو کہتا ہوں جب بھی ذرا سا بھی وقت ملے' یہاں آجایا کرو۔ پھر میری فکر نہیں ستائے گی—'

ناشتہ کرنے اور چائے پینے کے بعد میں پروفیسر نیلے سے ملنا چاہتا تھا۔ لے دے کر بس ایک پروفیسر نیلے تھے جو مجھے سمجھتے ہیں۔ جن سے میں اپنی گتھیاں یا Puzzle شیئر کرسکتا تھا—اس وقت میں تہذیبوں کے جس تصادم سے دوچار تھا، وہاں میری یہ پہیلی پروفیسر نیلے ہی سلجھا سکتے تھے۔

اس لیے بغیر دیر کیے میں نے گاڑی نکالی—اور پروفیسر کے یہاں پہنچ گیا—

اتفاق سے وہ لان میں ہی مل گئے—اس وقت وہ اپنے پودوں کو پانی دے رہے تھے—

●●

'ڈری ہوئی آزادی......؟'

پروفیسر نیلے زور زور سے ہنس رہے تھے۔ کچھ سوچتے ہوئے اچانک وہ میری طرف مڑے۔

ابن انشاء کا ایک شعر ہے:

'فرض کرو یہ جی کی بپتا جی سے جوڑ سنائی ہو

فرض کرو ابھی اور ہو اتنی آدھی ہم نے چھپائی ہو'

شعر سنانے کے بعد وہ مسکرائے—تو آدھی کہانی آپ نے چھپالی۔'

'ہاں—لیکن یہ کہانی بھی زیادہ دن تک آپ سے چھپی نہیں رہے گی پروفیسر......ابھی فی الوقت میری گتھی یہی ہے—' ہم کتنی تہذیبوں کے درمیان جیتے اٹھتے ہیں—اور اپنی تہذیبی اور روایتی منطق کی وجہ سے ہم یہ کیسے فیصلہ کرلیتے ہیں کہ کون سی تہذیب اچھی ہے اور کون سی بری—؟'

پروفیسر نیلے پودے میں پانی ڈالتے ہوئے رکے۔

'ہر تہذیب ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہے — لیکن غور سے دیکھو، تو کسی نہ کسی بہانے اس سے جڑی بھی ہوتی ہے — مثال کے لیے — وہ ایک لمحے کو ٹھہرے — یقینی طور پر کوئی نہ کوئی ایک ایسی بھیانک بات ضرور ہے کہ آپ سب کچھ چھوڑ کر یہاں آ گئے — ان پہاڑوں پر — یعنی آپ کے پہاڑی ہونے کا قصہ اس خط سے ضرور جڑا ہے جو ابھی دو دن پہلے آپ کو ملا ہے — آپ نہیں بتانا چاہتے تو میں اصرار نہیں کروں گا — مگر تہذیبوں کی چوٹ بھیانک ہوتی ہے اور یہ آرام سے منطقی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ کچھ نہ کچھ ایسا ضرور ہوا ہے کہ آپ ڈر گئے — اور یہاں چلے آئے — اور اس ڈر کو کبھی بھی خود سے الگ نہیں کر سکے۔'

'بالکل صحیح —'

'اب جیسے مثال کے لیے — کچھ ماڈرن بچّے یہاں سے ہجرت کرنے کے بعد آسٹریلیا یا امریکہ چلے جاتے ہیں — لیکن وہاں جانے کے بعد یکا یک وہ مذہبی ہو جاتے ہیں۔ کٹّر مذہبی — کیونکہ عریانیت کے بحران سے خود کو باہر نکالنے کا ایک ہی راستہ بچتا ہے۔ مذہب یا ہجرت —

'شاید اسی لیے میں نے بھی ہجرت کی تھی — کبھی میں یہاں شوقیہ آیا تھا — مدت ہو گئی۔ مگر اس جگہ نے جیسے میرے ہوش و حواس پر جادو کر دیا۔ پھر جب کہیں اور بسنے کا خیال آیا تو میں نے اسی پہاڑی خطے کا انتخاب کیا —'

پروفیسر نیلے میری آنکھوں میں جھانک رہے تھے —

'میں پہلے ہی سمجھ گیا تھا — یہاں عام طور پر زندگی سے اُداس لوگ آتے ہیں۔ جن کی بیویاں ساتھ میں ہوتی ہیں اور بڑی عمر میں جن کے ساتھ رہنے کو ان بچے کبھی تیار نہیں ہوتے — مگر تمہارے ساتھ تو تمہارے بچے ہیں — اور تمہارا بیٹا تمہارے لیے ترستا بھی ہے — مجھے پہلے سے ہی معلوم تھا کہ دال میں ضرور کچھ کالا ہے۔ یا پوری دال ہی کالی ہے......'

'شاید میں ڈر گیا تھا۔ ایک ایسا خوف، جس کی اچھی طرح اس وقت شاید میں وضاحت نہ

کرسکوں۔مگر اس بچے کی طرح جس نے فاتحانہ چمک کے ساتھ بادشاہ کی طرف دیکھ کر کہا تھا، ارے بادشاہ تو ننگا ہے—ٹھیک ویسے ہی—' آنکھوں کی پتلیوں پر سہمے ہوئے ڈورے تیر گئے تھے—سوچتا ہوں، ایسا کیوں ہوتا ہے کہ کافکا کا کوئی کردار اچانک رات میں سوتے ہوئے میٹا مارفوسس کا شکار ہو جاتا ہے—میں آئینہ میں اسی بادشاہ کی طرح ننگا تھا۔مگر میں اس بادشاہ کی طرح ناسمجھ نہیں تھا—میرے جسم سے کپڑے علاحدہ تھے—اور میں دیکھ رہا تھا۔ایک نہیں ہزاروں کی تعداد میں چیونٹیاں میرے ننگے جسم سے ہو کر گزر رہی ہیں۔میں سرتاپا لرز رہا تھا—'

''تہذیبیں جانوروں سے زیادہ نوکیلے دانتوں سے ہمیں زخمی کر جاتی ہیں......' پروفیسر نیلے سنجیدہ تھے۔ہاں تم نظر محمد کے بارے میں بتا رہے تھے۔وہ گاندھی جی کے مخالف تھے......جبکہ آزادی کا سیدھا اور سچا راستہ عدم تشدد کے اسی مسافر نے بتایا تھا—اور کتنی عجیب بات، اس شخص نے جس راستے سے فرنگیوں کو کھدیڑ باہر کیا—اُن فرنگیوں کے جاتے ہی وہی تشدد اس ملک میں عام بات ہوگئی۔تم تہذیبوں کا یہ تصادم دیکھ رہے ہو کاردار......؟

پروفیسر نیلے نے میرا ہاتھ تھاما۔ہم دونوں کرسیوں پر بیٹھ گئے—

'ایک تہذیب ۴۷ سے پہلے کی تھی—ایک غلام تہذیب اور—۴۷ کی صبح نمودار ہوتے ہوئے ہم ایک نئی تہذیب کی دوسری سرنگ میں داخل ہو گئے—آزادی۔سوچتا ہوں تو یہ آسان لفظ کتنا مشکل لگتا ہے—صدیوں کی بے رحم غلامی کو ایک بھوکے ننگے فقیر نے عدم تشدد کی انگلیاں تھام کر اس جھٹکے میں اکھاڑ پھینکا کہ ساری دنیا حیران رہ گئی—

شریمتی نیلے کو شاید ہمارے آنے کی خبر مل چکی تھی۔وہ چائے کی ٹرے لے کر مسکراتی ہوئی داخل ہوئیں—

آپ سے ایک شکایت ہے کاردار صاحب......

مجھ سے۔

ہاں۔آپ ہی سے......وہ مسکرا رہی تھیں۔یہ بتا رہے تھے کہ آپ کی پوتی آئی ہوئی ہے۔

پچھلے سال سردیوں میں اس کو دیکھا تھا۔ بڑی پیاری بچی ہے۔ آپ اسے لے کر کیوں نہیں آئے—؟

'اگلی بار ضرور لے کر آؤں گا سارہ کو— یہ وعدہ ہے۔'

پروفیسر نیلے کو سنجیدہ دیکھ کر وہ سمجھ گئیں کہ کسی اہم مسئلے پر گفتگو چل رہی ہے۔ اس لیے وہ ٹھہری نہیں۔ دوبارہ واپس لوٹ گئیں......

پروفیسر نیلے خیالوں میں گم تھے۔

'اس وقت میری بھی عمر کیا رہی ہوگی کاردار...... چھوٹا تھا۔ لیکن لوگ بتاتے ہیں یونین جیک کے جھکنے اور ترنگا کے لہرانے کی خوشی ہر چہرے پر محسوس کی جا رہی تھی۔ پورے ملک میں جشنِ چراغاں کا ماحول تھا مگر ایک شخص تھا، جو اداس اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا خون کے آنسو رو رہا تھا......

کون؟

'ارے وہی— بھوکا ننگا فقیر—' پروفیسر نیلے سنجیدہ تھے— آزادی کی قیمت دو قوموں کے نام پر ملک کی تقسیم کی شکل میں دیکھ رہے تھے...... نفرت کی آندھیاں تب بھی تھمی کہاں تھیں کاردار...... ایک جیک جھک گیا تھا۔ ایک پرچم لہرا رہا تھا۔ کچھ لوگ خوشیاں منا رہے تھے— اور خوشیوں کا علمبردار آنسو بہا رہا تھا— ایک ساتھ کتنی اخلاقیات آپس میں مل گئیں کاردار— اور دیکھو تو ہر چیز کا ایک وقت مقرر ہے۔ گاندھی نے جب عدم تشدد کا ہتھیار بھارتیوں کو سونپا تو کتنی مخالفت کی گئی— لوگ ہنستے تھے— بھلا اس طرح بھی کوئی فاتح ہوسکتا ہے۔ لیکن گاندھی کے اندر صبر تھا۔ وہ صبر کی طاقت جانتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ انقلاب چین کے لیے ۲۲ برسوں کا انتظار کرنا پڑ سکتا ہے۔ ویت نام اپنی آزادی کے لیے جب ۳۵ سال قربان کرسکتا ہے تو ہندستان عدم تشدد کے نام پر ذرا سا انتظار کیوں نہیں کرسکتا—؟ دراصل گاندھی نے ان فرنگیوں کی نبض پکڑ لی تھی— ان کے مہذب کہلانے کی اپنی اخلاقیات تھی— وہ انتہائی سخت تھے۔ بربر تھے— اور سامنے والے کو بھڑکا کر تماشہ دیکھنے پر یقین کرتے تھے— ہندستانی بھڑکے تو انہیں مزہ آنے لگا— اپنی تہذیب کی کسوٹی پر

خود کو مہذب انداز میں پیش کرتے ہوئے وہ ان بھڑکاؤ لوگوں سے نپٹنا جانتے تھے۔ مگر کاردار — گاندھی نے شطرنج کے مہرے بدل دیئے — ایک نئی اخلاقیات سامنے رکھ دی۔ ان کی اپنی اخلاقیات، اُنہیں کے سامنے — تم کچھ بھی کرو ہم خاموش رہیں گے...... تم ہمیں مارو، ہم کچھ نہیں کہیں گے — ہندستانی تہذیب میں یہ غیر معمولی عمل پہلی بار ہوا تھا — اور یہ وہی عمل تھا جس سے برٹش حکمراں اچانک خوفزدہ ہوگئے۔ کیونکہ گاندھی ان کے ہی مہرے ان کے سامنے چل رہا تھا — اور یونین جیک اس بدلی بدلی سی تہذیب سے خوفزدہ ہوگیا تھا......

جانے کہاں سے لان میں پھدکتے ہوئے دو تین بندر آگئے تھے — بندر پیڑ کی شاخوں سے لٹکے ہوئے منہ سے آواز نکال رہے تھے — کرتب دکھاتے ہوئے اچھل کر ایک شاخ سے دوسری شاخ کو پھاندرہے تھے......

پروفیسر کی نظران بندروں پر پڑ گئی تھی — وہ ہاتھ کے اشارے سے چلاّ رہے تھے۔

ہش...... ہٹ...... ہا......

بندر اُنہیں آنکھیں دکھا رہا تھا۔

ہش...... بھاگ...... ہٹ......

ایک دلچسپ کھیل تھا۔ بندروں کی کاؤں کاؤں میں اضافہ ہو چکا تھا۔ وہ مسلسل ایک شاخ سے دوسری شاخ، ایک درخت سے دوسرے درخت کو پھاندتے ہوئے اپنا کرتب دکھا رہے تھے......

پروفیسر ہنس رہے تھے — جانے کہاں سے یہ بندر چلے آتے ہیں۔ میرے پودوں کو تو روند کر رکھ دیتے ہیں —'

میں مشکل سے اپنی ہنسی روکے ہوا تھا —

مین گیٹ پر چڑھا ہوا بندر اب پروفیسر کو آنکھیں دکھا رہا تھا۔ پروفیسر ہنس رہے تھے۔

'ان بندروں کی قوم — لیکن کیا کروں — ہمارے اجداد بھی تو بندر تھے — بندروں کی

تہذیب، بندر ہی جانیں.....' وہ ٹھہرے۔ ہاں تو، ہم کس موضوع پر بات کر رہے تھے۔ اوہ یاد آیا.....اب دیکھو یہ تہذیبیں کس طرح اپنا اثر چھوڑتی ہیں۔ آزادی یہاں ملی اور اس کا اثر امریکہ کے مارٹھر لوتھر کنگ جونیر، جنوبی افریقہ کے نیلسن منڈیلا، ویت نام کے اونگ سانگ سوئی کی تحریکوں پر پڑ رہا تھا۔ یعنی آزادی کے لیے تشدد اور ہتھیاروں سے الگ کا بھی راستہ اپنایا جا سکتا ہے.....اور ان لوگوں نے بعد میں یہی راستے اپنائے.....'

بندر دوبارہ ہنگامہ کرنے لگے تھے۔

پروفیسر کو نظر محمد کی اچانک یاد آگئی تھی— ہاں، تم نظر محمد کے بارے میں بتا رہے تھے۔ بات نظر محمد کی سوچ کی نہیں ہے۔ آزاد بھارت میں آج بھی بہت سارے ہندو اور بہت سارے مسلمان گاندھی کو اس دوقومی نظریہ یا تقسیم کے ذمہ دار مانتے ہیں۔ مگر سچ کیا ہے، یہ تم بھی جانتے ہو کاردار۔ ایک زمانے میں کانگریس بھی اس بٹوارے کے خلاف تھی۔ مگر ملک فرقہ وارانہ دنگوں میں گم تھا۔ زبردست مارکاٹ مچی تھی۔ سندھ اور بنگال میں آگ کے شعلے بھڑک رہے تھے۔ اور ادھر برٹش کیبنٹ نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو ہندوستان کی آزادی کا فتویٰ دے دیا تھا۔ ان پر یہ زبردست ذمہ داری تھی کہ دونوں طرف کے لیڈران سے میٹنگ کے بعد کسی ضروری نتیجے پر پہنچا جائے۔ لوگ بٹوارے کو ہی واحد حل تسلیم کر رہے تھے مگر گاندھی جی شروع سے آخر تک اس موقف کے خلاف رہے— اسی درمیان ۱۹۴۶ء میں جناح کی مسلم لیگ نے قومی انتخابات میں ۹۰ فیصد سیٹوں پر قبضہ جما لیا اور تقسیم کا راستہ کھل گیا— لیکن گاندھی جی تب بھی ہار نہیں مانے۔ انہوں نے وزیر اعظم کے طور پر جناح کے نام کو آگے بڑھا دیا۔ لیکن لارڈ ماؤنٹ بیٹن مزید کچھ بھی سننے کو تیار نہیں تھے— ادھر تقسیم کے پروانے پر دستخط ہوا، اُدھر گاندھی جی مرن برت میں چلے گئے— ملک بالآخر تقسیم ہو گیا۔ لیکن کاردار، دیکھو تو کوئی کہیں بھی خوش نہیں ہے— ہندوستان آج بھی تقسیم کے نتائج بھگت رہا ہے— ادھر پاکستان اپنے ہی لوگوں کی جنگ کی سزا پا رہا ہے— اور ان سے الگ قدرت ہے، جو تماشہ دیکھ رہی ہے— قدرت ہمیشہ سے تماشہ دیکھتی ہے۔ پھر ایک دن ان تہذیبوں کو نگلنے کے

لیے تباہیاں بھیج دیتی ہے—'

پروفیسر نیلے ایک دم سے اچھلے تھے— جانے کہاں سے ایک بندر خاموشی سے اچھلتا ہوا پاس آ گیا تھا۔ کین کی بنی میز سے جھپٹ کر اس نے پروفیسر کا چشمہ اٹھا لیا تھا۔ اچانک کی اس افراتفری میں خالی چائے کے کپ الٹ گئے تھے......

یہ سب اتنی جلدی میں ہوا کہ مدافعت کا موقع ہی نہیں ملا— میں بھی سرعت سے کھڑا ہو گیا۔ بندر نے چشمہ اپنے پاؤں میں پھنسا لیا تھا۔

پروفیسر چیخ رہے تھے۔

ہش......چشمہ دے......

بندر اُنہیں چڑھا رہا تھا—

چشمہ دے۔ ظالم......چشمہ دے میرا......

بندر اچھل کر دوسری طرح بھاگا۔ اس بھاگم بھاگ میں چشمہ گرا۔ کمانی ٹوٹ گئی— پروفیسر چشمہ لینے کے لیے دوڑے۔ بندر نے غرا کر انہیں پیچھے ہٹنے پر مجبور کیا۔ درختوں پر چڑھے ہوئے دو بندر اس کا ساتھ دینے کے لیے اتر آئے تھے۔ اب ایک ساتھ یہ سارے بندر مل کر اچھل کود مچا رہے تھے۔

'چشمہ توڑ دیا— اس سے پہلے بھی میرے دو گلاس شہید کر چکے ہیں یہ۔ تو ایسے نہیں مانے گا......'

پروفیسر نے آگے بڑھ کر زمین سے ایک بڑا سا پتھر اٹھا لیا تھا— بندر کچھ دیر تک غراتے رہے۔ پھر پروفیسر کے غصے بھرے تیور کو دیکھ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ پروفیسر نے چشمہ اٹھا لیا۔ شیشے سلامت تھے۔ ایک کمانی ٹیڑھی ہو گئی تھی۔

'چلو شکر ہے— زیادہ نقصان نہیں ہوا۔'

بندر صحن چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔

’آپ ان بندروں کا کچھ علاج کیوں نہیں کرتے......؟‘

میری بات پر پروفیسر ہنس پڑے۔

’بندروں کا کوئی علاج ممکن ہے کیا—؟ تشدد یا عدم تشدد— یہ کسی ہتھیار کو نہیں مانتے۔‘

●●

میں واپس اپنے گھر لوٹ آیا۔ سارہ اپنے کمرے میں چیٹنگ کرنے میں مصروف تھی۔ اس لیے اس سے کچھ زیادہ بات چیت نہیں ہوسکی۔ عام طور پر اس کا یہ وقت موبائیل یا چیٹنگ میں گزرتا ہے۔ مجھے اس بات کا بھی احساس تھا کہ سارہ جب چلی جائے گی تو گھر میں کس قدر خاموشی چھا جائے گی۔ پھر وہی تنہائی۔ وہی اکیلا پن— بچوں کی موجودگی کے باوجود اب یہ اکیلا پن مجھے کھلتا ہے۔

کچن سے حلیمہ اور ابو بابا کے بولنے کی آواز یہاں تک آرہی ہے— میں نے کھڑکی کھول دی ہے۔ یہاں سے دور تک پہاڑوں کے ٹیلے پر بنے مکانات نظر آرہے تھے۔ رات کا وقت پہاڑی کی آغوش میں بسے، روشنی سے جھلملاتے ان مکانوں کی خوبصورتی دیکھ کر قدرت کی شان میں قصیدے پڑھنے کا دل چاہتا ہے— سامنے سڑک سے مویشی لے کر گزرتے ہوئے گجر ہیں۔ سڑک سے ٹھہر ٹھہر کر اکا دکّا گاڑیاں گزر رہی ہیں—

ابو بابا چائے لے کر آئے ہیں۔ میرے سامنے اکثر ان کی زبان بند ہی رہتی ہے— چائے رکھنے کے بعد کچھ دیر وہ اگلے لمحہ کے انتظار میں کھڑے رہتے ہیں، پھر میری خاموشی سے سمجھ جاتے ہیں کہ کوئی بھی حکم نہیں ہے—

وہ واپس لوٹ گئے ہیں۔

دو دن بعد سارہ چلی جائے گی۔ جانے کیوں؟ پہلی بار سارہ کے جانے کا خیال مجھے پریشان کر رہا ہے— ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا— سارہ کے آنے سے گھر کی رونق بڑھ جاتی ہے— مگر

کے سامنے کھڑا ہوں — اب ٹھنڈ کم ہوگئی ہے۔ بستر میں تکیے کے پاس میرا منکی کیپ پڑا ہے۔ آئینہ میں ایک بار پھر اپنا چہرہ دیکھتا ہوں —

تم ڈر گئے ہو کاردار......

ہاں...... آئینہ میں جھل مل کرتا چہرہ کانپتا ہے۔

مگر کس سے؟ اور کیوں؟

نہیں جانتا —

تم ہی کہتے تھے...... یہ زندگی بے حد خوبصورت ہے۔ مگر اُن کے لیے جو جینا جانتے ہیں — اب تمہاری سوچ کو کیا ہوا؟

نہیں جانتا......

سب جانتے ہو کاردار — کیونکہ زندگی کی سچائیاں تلخ ہیں۔ یہ سچائیاں اچانک ہمیں بیمار بنا دیتی ہیں۔ پھر ہم ان سچائیوں سے فرار حاصل کرنے لگتے ہیں......

شاید ہاں — میں بھی فرار حاصل کر رہا تھا......

آئینہ میں جھلملاتے عکس نے سوال کا رخ موڑ دیا ہے......

'نور محمد سے ملنے جاؤ گے......؟'

●●

جسم میں ایک عجیب سی سنسنی دوڑ رہی ہے۔ نور محمد کا خط لرزتا ہوا میرے ہاتھوں میں ہے — آنکھیں بند ہیں۔ نور محمد اور میرا بچپنا...... میرا شاعری کرنا۔ نور محمد کو بلا کر صحن میں لانا — اماں کا غصہ کرنا......

ایک بار پھر یادوں کی ریل چل پڑی ہے۔

●●

(۲)

بلند حویلی — دادا مرحوم کے انتقال کے بعد بلند حویلی کی سلطنت ابّا کے ہاتھوں میں تھی۔ میں چھوٹا تھا لیکن اب یہاں کی دنیا کو بخوبی پہچاننے لگا تھا۔ دراصل یہاں کئی دنیائیں آباد تھیں — ایک دنیا اماں کی تھی — جہاں گھر، خانہ داری، محلے والوں سے لے کر بھوت پریت اور جناتوں کی ایک سے بڑھ کر ایک دنیا آباد تھی۔ دوسری دنیا ابّا کی تھی — ابّا نے خود کو مذہب کے دائرے میں باندھ لیا تھا — آنکھوں پر چشمہ، قد لگ بھگ چھ فٹ۔ داڑھی بڑھی ہوئی۔ گھنگریالے بال، جن میں سفیدی چھانے لگی تھی۔ پھر ابّا سے ملنے والے لوگ تھے۔ جہاں زمین اور جائیداد کو لے کر بحث چلتی تھی۔ حساب کتاب کیے جاتے تھے۔ یا پھر محلے کے دوست، جن کے آتے ہی قرآن شریف اور حدیث کے صفحات الٹے پلٹے جانے لگتے — تکرار تیز ہو جاتی — ابّا اب سارا دن مذہبی کتابوں کے مطالعے میں غرق رہنے لگے تھے۔

گرمی کے دنوں میں چھت پر پلنگڑیاں بچھ جاتیں۔ پانی کا چھڑکاؤ کیا جاتا — رات کے ۹ بجتے بجتے کھانا ختم ہو جاتا۔ میں اماں کے ساتھ چھت پر آ جاتا۔ پھر ابّا کی کہانیاں شروع ہو جاتیں۔ آسمان پر ستاروں کی حسین چادر بچھی ہوتی۔ ابّا دیر تک ان ستاروں سے تعارف کراتے رہتے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا جسم کو گدگدا رہی ہوتی — وہ قطب تارہ ہے۔ وہ مشتری ہے...... وہ سات تارے۔ بنات النعش......

چاندنی راتوں میں ابّا کی کہانیاں مجھے ایک نئی دنیا میں پہنچا دیتیں۔ ہاں، یہ سوچ کر ہول آتا کہ اس فانی دنیا میں کوئی بھی ہمیشہ رہنے کے لیے نہیں آیا ہے۔ ایک دن سب کو چلا جانا ہے۔ معصوم ذہن میں سوالوں کے دھماکے ہونے لگتے......

ایک دن ابّا بھی چلے جائیں گے......؟

ہاں......

امّاں بھی......؟

'ہاں......'

پھر میرا کیا ہوگا؟

پھر تم خود ہی اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جاؤ گے......

نہیں کھڑا ہوا تو؟

ذمہ داری سب سکھا دیتی ہے...... تمہیں بھی سکھا دے گی۔

چاندنی راتیں ابّا کی کہانیوں سے گلزار ہو جاتیں۔ پیغمبروں سے لے کر قطب الدین بختیار کاکیؒ، حضرت خواجہ غریب نواز اور حضرت نظام الدین اولیا تک کی زندگی کے واقعات سنائے جاتے۔

صبح ہوتے ہی اماں، مریم بوا کے ساتھ مل کر چولہا جلانے کی تیاریاں کرتیں۔ مٹی کے بڑے بڑے چولہے۔ چولہوں سے نکلتا ہوا دھواں۔ باورچی خانے سے ملحق ایک چھوٹا سا صحن تھا— ابّا اور ملنے آنے والے خاندان کے افراد وہاں کرسیاں لے کر بیٹھ جاتے۔ ادھر چائے بنتی رہتی اور اُدھر ابّا کی تقریر جاری رہتی—

میری تربیت اسی ماحول میں ہوئی۔ صبح ہوتے ہی گھر گلزار ہو جاتا۔ محلے کے قریب ہی کچھ بے حد قریبی رشتہ دار بھی رہتے تھے۔ ان لوگوں کی آمد و رفت شروع ہو جاتی۔ ایک طرف امّاں، مریم بوا کو کچھ نہ کچھ سناتی رہتیں۔

'ارے مصالحہ اتنا موٹا پیسا جاتا ہے— اسے اور باریک کیجئے۔ اب تو سلہٹ پر آپ کا ہاتھ ہی نہیں چلتا۔'

'سلہٹ گھس گئی ہے۔ مصالحہ کیا خاک پیسا جائے گا'

'پھر تم نے بتایا کیوں نہیں—کل ہی تو سلہٹ کوٹنے والا آواز لگا رہا تھا— آپ سے کوئی کام نہیں ہوتا مریم بوا—

اماں حساب کتاب میں ماہر تھیں— مریم بوا کے ہر کام میں اماں کو کچھ نہ کچھ کمی نظر آجاتی

تھی۔

یہ سبزی کہاں سے لائیں؟ لو، موڑ پر سبزی والا ٹھیلہ لگائے مل گیا ہوگا۔ میں نے کتنی بار کہا۔ سبزی گولہ چلی جایئے— گوشت بھی ڈھنگ کا دیکھ کر نہیں لائیں آپ۔ صرف ہڈّی دے دی ہے— وہ نکڑ پر سبحان میاں بیٹھتے ہیں۔ ان سے بلند حویلی کا ذکر کرتیں تو کبھی ایسا مریل جانور کا گوشت نہیں بھجواتے......

'ارے وہیں گئی تھی۔' مریم بوا غصے میں لڑنے بیٹھ جاتیں۔

'وہیں گئی تھیں تو پھر یہ کیا اٹھا لائیں۔'

سلام بھائی دور کے رشتے دار تھے۔ ایک دم کالے۔ قد، چھ فٹ سے نکلتا۔ کہیں سے بھی ہمارے گھرانے کے نہیں لگتے تھے۔ دبلے پتلے تھے۔ ان کی سب سے بڑی خوبی تھی کہ کوئی بھی لباس ان کے جسم کے ساتھ میچ نہیں کرتا تھا۔

اماں کی باتیں سن کر سلام چچا بھی بولنے لگتے۔

'سبحان میاں بھی اب اچھا گوشت نہیں رکھتے......'

اچھا— اماں کی تنی ہوئی بھنویں، کچھ اور سکڑ جاتیں—

'زمانہ برا آ گیا ہے۔ پہلے کیا گوشت والے تھے اور کیسا گوشت ملتا تھا— اور اب— سبحان کے باپ...... ہم لوگوں نے بچپن میں دیکھا تھا— سلام چچا اپنے بچپن میں کھو جاتے— ناک سے بولتے تھے۔ لیکن کیا گوشت دیتے تھے۔ مجال کہ ایک بھی بوٹی خراب نکل جائے۔

'السلام علیکم رحمٰن بھائی۔'

یہ بچو چا ہوتے— لنگی اور کرتہ پہنے— گوشت کی بحث کو بچو چا اپنے انداز میں آگے بڑھاتے۔ ان کے مسکرانے اور بولنے کا لہجہ عجیب تھا۔ آدھی بات وہ مسکرانے میں گول کر جاتے۔ لیکن اس مسکراہٹ میں طنز کی آمیزش ہوتی۔ وہ ہر بات کو کاٹنا ضروری سمجھتے تھے۔

'بے، یہ سبحان کیا گوشتے دے گا' وہ مریم بوا کی طرف مڑتے۔ گولے کے اندر جہاں نکڑ

پر سبحان بیٹھتا ہے۔ اس کے سیدھے دس دکان کے بعد جو نالہ آتا ہے، دیکھا ہے......

'ہاں......'

وہاں مشتاق بھی گوشت بیچنے لگا ہے......

مشتاق کون......؟ ابا چونک کر پوچھتے۔

'ارے وہی......جبو قصائی کا بیٹا۔ جو جیل چلا گیا تھا......'

اچھا وہ واپس آ گیا......؟

'ہے......آج ہی واپس آیا— پچھلے چھ مہینے سے گوشت بیچ رہا ہے۔ پولس نے ساری عقل ٹھکانے لگا دی......

باورچی خانے کی کیبنٹ بیٹھ چکی ہوتی۔ چائے کا دور چلتا رہتا— فساد، دنگے، گاندھی جی اور نہرو سے لے کر قائداعظم جناح اور پاکستان کے قصے، کہانیوں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو جاتا—

اب سوچتا ہوں، اس زمانے میں لوگوں کے پاس کتنا خالی وقت ہوا کرتا تھا۔ شاید گفتگو کے علاوہ کسی کے پاس کوئی کام نہیں تھا۔ سب اپنی اپنی بچی کھچی جاگیر اور زمینوں کی کمائی کھا رہے تھے۔ غلامی سے فیوڈل سسٹم کی طرف— فیوڈل سسٹم کی کڑیاں بکھرنے کے باوجود ان سب میں کہیں نہ کہیں ایک جاگیردار یا سرمایہ دار زندہ رہ گیا تھا— اسی لیے کہا جاتا تھا، کہ جاگیردارانہ نظام گیا۔ سرمایہ داری آ گئی...... گفتگو کے علاوہ ان جیسے لوگوں کا محبوب مشغلہ ہوتا۔ بی بی سی ریڈیو کی خبروں پر تبصرہ کرنا— سیاست کے بخیے ادھیڑے جاتے— معاشرے اور بدلتے دور کی کینچلی اتاری جاتی— اور سب برے وقت اور برے ماحول پر ایسے سر جوڑ کر بیٹھ جاتے، جیسے کسی میت میں آئے ہوں—

'پاکستان سے پھر جنگ ہوگی......'

پاکستان ٹھہرا چھوٹا سا ملک۔ وہ کیوں جنگ چاہے گا۔ بجو چچا پاکستان کے طرفدار تھے—

ابّا ایک زمانے تک پکّے مسلم لیگی تھے۔لیکن اب وہ ایک لفظ بھی ہندستان کی مخالفت میں برداشت نہیں کرسکتے تھے۔ سیاست پر بحث شروع ہوتی تو وہ بجو چا کو ڈھیر کرنے میں لگے رہتے— اور آخر کار نتیجہ یہ نکلتا کہ بولتے بکتے بجو چا غصہ ہوکر اپنے گھر چلے جاتے— دوتین دنوں کے لیے بلند حویلی سے رشتہ ختم۔اور چوتھے دن دوبارہ مسکراتے ہوئے اس طرح واپس آتے، جیسا کچھ ہوا ہی نہ ہو—

رات گئے تاش کی محفل بھی سجتی۔اس محفل میں بھی محلے کے بزرگ شامل ہوتے۔ چائے کا دور چلتا رہتا— لیکن اس بات کا شدت سے احساس سب کو ہورہا تھا کہ لے دے کر اب صرف حویلیاں رہ گئی ہیں۔آزادی کے بعد کے محنت کش اب بڑے ہونے لگے ہیں۔اُن کے رتبے اور چمک بڑھنے لگی ہے۔حویلی والوں کی چمک ماند پڑنے لگی ہے— اب ان کے بچے پڑھ رہے تھے— اور ان بچوں کے سامنے مستقبل کی آگ روشن تھی— باپ دادا کی جاگیریں اور ان جاگیروں پر آسان زندگی گزاردینے کے دن گزر چکے تھے—

محلے کے ہی ایک پرانے بگڑے نواب کے بیٹے نے ایک پارچون کی دکان کھول لی تھی۔ اس دکان کو لے کر محلے بھر میں طرح طرح کی باتیں سننے میں آرہی تھیں۔مثال کے لیے

باپ نواب، بیٹا دکاندار......

ارے، پارچون کی دکان کھولنے کے سوا کوئی اور کام نہیں۔

اب نوابوں کے بیٹے دکانوں میں بیٹھیں گے......

ارے غیرت اورعزت ہوتب تو شرم آئے......

محلے کے ایک اورعزت دار سمیع بھائی نے تو چودھری ٹھونگا بازار کے نام سے ایک دکان کھول لی۔ٹھونگا بنانے والی ایک مشین خرید لائے۔ ان کے باپ داداؤں کو چودھری کا خطاب انگریزوں کی طرف سے دیا گیا تھا۔لیکن نئے زمانے کے یہ جاگیردار یا چودھری اب گھر کی عزت بچانے کے لیے کمائی کے دھندوں کی طرف لوٹ رہے تھے۔ یہ بدلتا ہوا معاشرہ تھا— آزادی کی نئ

ہوا نے یکا یک پورے بازار کو تبدیل کر دیا تھا۔لیکن ان میں سے کوئی بھی، ابھی تک اپنے پرکھوں کی حویلی یا مکان کو فروخت نہیں کرنا چاہتا تھا۔ کیونکہ ایسا کرتے ہوئے آبا و اجداد کی روح کو ایذا پہنچانے کا احساس اُنہیں کھائے جا رہا تھا۔مگر آہستہ آہستہ حویلیوں پر بھی برا وقت آنے لگا— بڑی حویلیوں کی بھی، ملک کی طرح تقسیم ہونے لگی۔نئی دکانیں کھلنے لگیں— عمارت کے ایک حصے کو کچھ لوگ ہوٹل، یا ہوسٹل کے طور پر استعمال کرنے لگے— بلند شہر میں مسلسل آبادکاری کا کام جاری تھا— نئے نئے مکان بن رہے تھے۔دکانیں بن رہی تھیں— آہستہ آہستہ نئی سوچ آ رہی تھی۔ پرانی ذہنیت اپنے آپ کو بدل رہی تھی—

اور اسی ماحول میں، میں آہستہ آہستہ بڑا ہو رہا تھا۔میرا ایک ہی دوست تھا— نور محمد— لیکن نور محمد سے گفتگو کے راستے اب بند ہو چکے تھے—ہاں ہم اسکول میں مل لیتے تھے۔لیکن اسکول میں بھی وہ زیادہ بات نہیں کرتا تھا—

اُس دن وہ اداس تھا— اس نے بتایا کہ اماں کی طبیعت بہت خراب ہے—

’میں نے انجان بنتے ہوئے پوچھا۔

کیا ہوا—؟

’ان پر جنات کی سواری آتی ہے۔‘

’تمہیں کیسے معلوم؟‘

’سب بتاتے ہیں— یہ سب کو معلوم ہے—‘

’تب تو تم نے جنات کو دیکھا بھی ہوگا؟‘

’ہاں—‘

’دیکھا ہے......؟

’ہاں سچ مچ دیکھا ہے— ایسے......‘ اس نے اشارے سے بتایا— جیسے ہم تم کھڑے ہیں......

’بکواس......‘

’بے— سچ مچ۔ بڑا تگڑا جنات ہے— آدمیوں سے بہت لمبا۔‘

’وہ تمہاری اماں سے بات کرتا ہے......؟‘

’ہاں کرتا ہے۔ جب جنات کی سواری آتی ہے تو اماں کے چہرے کا رنگ بدل جاتا ہے۔ آواز بھاری ہو جاتی ہے۔ ہمیں اپنے اپنے کمرے میں بند کر دیا جاتا ہے۔ زبردست پہرہ ہوتا ہے کہ کوئی اپنے کمرے سے باہر نہ نکلے......

’کیوں؟‘

’کیوں کہ جنات اس پر بھی سوار ہو جائے گا—‘

’اور کسی پر سوار ہوا جنات؟‘

’نہیں—‘

’اچھا دیکھنے میں کیسا ہے جنات؟‘‘

’بڑا خطرناک۔ بے، وہ انسان تھوڑے ہی ہے۔ آگ کی مخلوق ہے۔ ایسا ابّا کہتے ہیں۔ ابّا اس دن مولوی محفوظ کو لے کر آئے تھے......‘

’یہ کون ہیں؟‘

’جھاڑ پھونک کرتے ہیں۔ ۳۰۰ جنات ان کے مرید ہیں۔ جہاں بیٹھتے ہیں، وہاں بھی جنات پہرہ دیتے ہیں......‘

’یہ کس نے بتایا......؟‘

’بے— یہ تو سب جانتے ہیں...... بتائے گا کون؟ مولوی محفوظ کو کون نہیں جانتا— سارے جنات ان سے ڈرتے ہیں۔‘

’پھر مولوی نے تیری اماں کا بھوت کیوں نہیں بھگایا......؟‘

’بے— یہ آسان تھوڑے ہی ہے۔ مولوی جی کہتے ہیں۔ بڑا ابرا جن ہے۔ آسانی سے

چھوڑے گا نہیں — تین ہزار سال کی عمر ہے......'

'تین ہزار سال...... باپ رے......'

'اور کیا — شاہ جنات ہے۔ اس لیے مولوی صاحب کہتے ہیں — وقت لگے گا۔ پچھلے دو مہینے سے ہر جمعہ ایک بکرے کی قربانی دی جا رہی ہے......

'بکرا گھر آتا ہے......؟'

'نہیں — ابا بکرے کی قیمت مولوی صاحب کو دے دیتے ہیں۔ وہ قربانی کے بعد بکرے کا گوشت یتیم بچوں میں تقسیم کر دیتے ہیں'

'تقسیم کر دیتے ہیں یا خود کھا جاتے ہیں —؟'

'بے تم پاگل ہو — اتنے بڑے مولوی پر شک......'

'نہیں شک نہیں۔ بس پوچھ رہا تھا —'

'ابا کہتے ہیں، ابھی یہ سلسلہ تین مہینے تک اور چلے گا — پھر شاہ جنات اماں کے بدن سے نکل کر کہیں اور چلے جائیں گے۔

'اگر نہیں نکلے تو......؟'

'نکلیں گے کیسے نہیں۔ نکلیں گے تو ان کے بھوت......'

'اچھا نکل گئے تو پھر کہاں جائیں گے......؟'

'یہ تو ہم نہیں جانتے۔'

'اماں بتا رہی تھیں کہ تمہارے ابّا میرے ابّا سے سفید کاغذ اور اصیل سفید مرغ مانگنے آئے تھے......'

نور محمد کے چہرے پر خوف طاری تھا۔

'کہیں مولوی صاحب یہ بھوت مجھ پر تو نہیں بھیجنے والے تھے......؟'

'اگر بھیجتے تو تم بھی مولوی صاحب کو بلا لیتے۔ پھر وہ تمہارے اندر کے جن کو کہیں اور بھیج

دیتے......‘

’لیکن کہاں؟‘

نور محمد کی ہنسی چھوٹ گئی— تم کہتے کہ نور محمد پر بھیج دیجئے— میں سب سنبھال لیتا۔ مجھے سب سنبھالنا آتا ہے......‘

●●

گھر لوٹنے کے بعد بھی نور محمد کی باتیں ذہن میں گونجتی رہیں۔ آنکھوں میں شاہ جنات کی خوفناک تصویریں گھوم رہی تھیں۔ کیا سچ مچ جنات ہوتے ہیں—؟ سایہ......؟ اگر سچ مچ مجھ پر جنات کا سایہ ہو جاتا تو......؟ نور محمد کی بات ایکدم سے یاد آجاتی۔ پھر مولوی صاحب سے کہہ کر مجھ پر بھیج دیتے......میں سب سنبھال لیتا۔

اندھیرے میں شاہ جنات کی آنکھیں چمک رہی تھیں—

رات ہوگئی تھی—

ابا کی بڑبڑاہٹ جاری تھی— ان عورتوں کا تو کام کبھی ختم نہیں ہوتا۔ چولہے بجھ گئے— لیکن باورچی خانہ سے ہٹنے کا نام نہیں لیں گی۔

’اب گندے برتنوں کو کیسے چھوڑ دوں،‘ کمرے میں اندر آتی ہوئی اماں کی بک بک جاری تھی— مریم کے بھروسے رہوں تو صبح دس بجے تک آگ نہیں سلگے۔ چولہا کیا خاک جلے گا۔ اور باورچی خانے میں ایک نہیں ہزار کام رہتے ہیں— آپ نہیں جانتے ہیں تو مت بولا کیجئے—

’اچھا بابا غلطی ہوگئی—‘

ابّا ہر بار اپنی غلطی تسلیم کر لیتے تھے—

چھت پر چارپائیاں ایک قطار سے لگ گئیں۔ چادر بچھ گئی۔ وظیفہ پڑھنے کے بعد ابّا پلنگ پر آکر لیٹ گئے۔ امّاں سونے کی تیاریاں کر رہی تھیں۔

’سنتے ہیں نظر محمد کی اہلیہ کی طبیعت بہت خراب ہے—‘

’جو دوسروں کے لیے گڈھا کھودتا ہے، اس کا یہی حشر ہوتا ہے۔ اماں کی آواز سے تلخی جھانک رہی تھی۔

’جانے دو۔ جو ہوا، سو ہوا— اب خدا جانے کتنے دن کی مہمان ہے—‘

’جانے دوں؟‘ اماں تڑپ کر اُٹھ کر بیٹھ گئی تھیں— کیسے جانے دوں۔ میرے بیٹے پر سحر کرنے چلا تھا کم بخت— اگر میرے بیٹے کو کچھ ہو جاتا تو—؟ اب خدا جانے کس پر توڑ کر رہا ہوگا— ان سفلی عمل کرنے والوں سے خدا دور رکھے۔ محلے میں کوئی ایک گھر ہے ایسا، جہاں جادو ٹونہ نہ ہوتا ہو۔ وہ فاروق میاں کو دیکھئے— ان کی گلی سے گزریے تو پتہ نہیں کتنی تعویذیں، گنڈے پڑے ہوتے ہیں۔ گھر سے نحوست برستی ہے۔ سات سات بیٹیاں— اور کسی کے چہرے پر مسکراہٹ نہیں— اب یہی حال آپ کے نظر محمد کا ہونے والا ہے—‘

’بددعا نہیں دیتے بیگم—‘

’یہ بددعا نہیں ہے۔ کہتے ہیں اللہ کی لاٹھی میں آواز نہیں— جو جیسا کرے گا۔ ویسا ہی بھرے گا۔‘

’مجھے ترس آتا ہے نظر محمد پر۔ ابھی عمر ہی کیا ہے۔ بیوی بیمار— بیٹا بھی چھوٹا ہے— ابّا کے لفظوں میں محبت تھی— جانے دو، خطا معاف بھی کرو۔ غلطی ہوگئی۔ بیوی کی محبت میں جو مولوی نے بتایا، وہی کرتا گیا بیچارہ—‘

’اب بیچارہ ہوگیا آپ کے لیے— رہنے دیجئے۔ میرے لیے ایسے لوگ کوئی بے چارے وے چارے نہیں۔ اب اتنے بھی نادان نہیں کہ ایک سفید کا غذ یا ایک اصیل مرغ مانگنے کا مطلب نہ جانتے ہوں— آپ سے تو دوستی تھی— ڈائن بھی ۱۴ گھر چھوڑ کر عمل کرتی ہے۔ وہ تو آپ کے دوست ٹھہرے۔ پشتوں کا یارانہ ٹھہرا— بیوی کی محبت میں سب بھول گئے۔ بس میری زبان نہ کھلوائیے۔ دوست کے بیٹے کی جان لینے پہنچ گئے۔ شرم بھی نہیں آئی مردود کو— اُس کا بھی تو چھوٹا

بیٹا ہے۔ بیوی سے اتنا پیار تھا تو بیٹے پر توڑ کراتا، میرے بیٹے پر توڑ کرانے کی کیا ضرورت تھی—'

آسمان میں چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ تاروں کی اٹکھلیاں چل رہی تھیں— جھل مل کرتا چاند تاروں کے درمیان کبھی چھپ جاتا، کبھی باہر نکل آتا— اماں دیر تک بولتی رہیں۔ ابّا خاموش ہو کر لیٹ گئے— اب میری باری تھی...... شاہ جنات کا چہرہ ابھی بھی آنکھوں کے آگے ناچ رہا تھا۔

اماں......

ہاں بیٹا......

کیا سچ مچ جنات ہوتے ہیں؟

ہاں بیٹا— ہوتے کیسے نہیں ہیں۔ قرآن شریف میں آیا ہے۔ آگ کی مخلوق ہیں۔ اسی لیے کہتی ہوں کہ ہر وقت پاک صاف رہا کرو—'

جنات کو ناپاکی پسند نہیں نا......؟

'بالکل نہیں— اسی لیے سمجھاتی ہوں پیشاب کرتے وقت پانی لے جایا کرو۔ جنات ہمیشہ ناپاک لوگوں پر ہی آتے ہیں۔ جو لوگ نماز پڑھتے ہیں، باوضو رہتے ہیں ان پر جن بھوتوں کا سایہ نہیں ہوتا۔ یہ مخلوق اللہ کے کلام سے ڈرتی ہے۔ تم پاک صاف رہو گے تو بدروحوں سے ہمیشہ محفوظ رہو گے—' اماں کو کچھ شک کا احساس ہوا تھا— بات کو درمیان میں روک کر انہوں نے پوچھا—

'سچ بتا— تو پھر اپنے دوست سے تو نہیں ملا؟'

'نہیں اماں—'

'ملنا بھی نہیں— 'برے لوگ ہیں— برے لوگوں کے بچے بھی برے ہوتے ہیں۔ کبھی بھول کر ان کے گھر مت جانا۔ ان کے گھر کے پاس سے کوئی بھی پھینکی ہوئی چیز مت اٹھانا۔ کیونکہ آج کل اس گھر میں عمل چل رہا ہے۔ ٹھہر— میں تجھے پھونک دوں......'

یہ اماں کی ہمیشہ کی عادت تھی۔ رات سوتے وقت درود پڑھ کر میری بلائیں اتارتیں۔ میں

اسکول جاتا، تب بھی اماں دعا دم کرتیں۔ پھر مجھے اسکول بھیجتیں۔ ایسے موقع پر ابا اگر پاس میں ہوتے اماں سے چٹکی ضرور لیتے......

ادھر اماں نے مجھے پھونک ماری — ادھر ابّا طنز سے مسکرائے۔

'کبھی بتایا نہیں — آخر تم کون سی دعا پڑھتی ہو......'

'آپ کو کیوں بتاؤں — امی کی بھنویں تن گئی تھیں۔ آپ جو پڑھتے ہیں کبھی مجھے بتاتے ہیں۔'

'اچھا چلو مت بتاؤ — ' ابّا کا چھیڑنا جاری رہتا — کبھی مجھے بھی پھونک دیا کرو۔ میں بھی تو آخر گھر سے باہر نکلتا ہوں۔ یا میری کوئی فکر ہی نہیں۔

'ہٹایئے — میرا مذاق مت اڑایئے۔ میں پڑھی لکھی نہیں تو کیا ہوا — اللہ خیر سے میں بھی اچھے گھر کی بیٹی ہوں۔ نماز، روزہ، دعا، درود تو مجھے بچپن سے زبانی یاد ہے — '

'لیکن بعد میں نہیں دہراؤ تو بھول جانے کا بھی خطرہ ہے — '

اماں کی آواز اچانک بلند ہوگئی تھی۔ 'منہ مت کھلوایئے — میں کچھ نہیں بھولتی۔ جب پہلی بار ڈولی چڑھ کر یہاں آئی تھی، تب سے لے کر آج تک کی ساری بات یاد ہے۔ بلند حویلی۔ ارے خاک بلند حویلی — کبھی شان رہی ہوگی۔ اب شان مٹی میں مل چکی ہے — در و دیوار کو دیمک چاٹ رہے ہیں۔ کبھی اس حویلی کی چھتیں دیکھی ہیں — کھوکھلی ہو چکی ہیں — بارش اور طوفان میں ڈر لگا رہتا ہے کہ خدانخواستہ حویلی کی کوئی دیوار بیٹھ نہ جائے۔ آپ کو تو یہ بھی یاد نہیں ہوگا کہ آج سے پہلے کب اس حویلی میں چونا گردانی یا پتائی ہوئی ہوگی — خدا قسم کھا کر بولیے۔ یاد ہے — ؟ میں نے تو برسوں میں نہیں دیکھا — اور چونا گردانی کرائیں گے کہاں سے — دیوار جھڑ رہی ہے۔ محرابیں ٹوٹ رہی ہیں — چھت بیٹھ رہی ہے — اور نام ہے بلند حویلی — اور سن لیجئے — بڑے بول نہیں بولتی — ذرا حویلی کے دروازے سے باہر نکل کر دیکھیے۔ یہ موچی اپو، پچو تھے — جو کل تک آپ کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے رہتے تھے — اب ذرا ان کی ٹھسں، ان کی اکڑ، ان کی شان

دیکھیے— اللہ بھی اُن کی مدد کرتا ہے جو محنت کرتے ہیں۔ آپ لوگوں نے کیا کیا— ؟ بس ساری زندگی حویلی حویلی کرتے رہے— حویلی حویلی چاٹتے رہے— اب چاٹنے کے لیے بھی حویلی نہیں بچی— محلے کے بنیوں، چماروں نے دوتلّہ، چارتلّہ مکان بنا لیے۔ اُن کے بچے بھی شان سے انگریزی اسکولوں میں پڑھ رہے ہیں— اور آپ کے پرکھے— ؟ بس جاگیردارانہ نظام پر چلتے رہے— لوگوں پر ظلم کرتے رہے— کہتے تھے، خیرات کرتے ہیں— اب خیرات کر کے دیکھئے— خیرات کرنے کے لیے بھی بچا کیا ہے— ؟ کچھ نہیں۔ ٹھن ٹھن گوپال— رادھا کیا ناچے کیا کھائے— شکر منائیے کہ باپ داداؤں نے ایک حویلی دے رکھی ہے— یہ حویلی نہ ہوتی تو آج ہمیں لے کر کہاں جاتے آپ— اور سن لیجئے— اب آپ پہلے کی طرح جوان نہیں، بوڑھے ہو چکے ہیں۔ بوڑھے ہو چکے ہیں— اب آپ سے محنت نہیں ہو سکتی— لیکن سوچئے— مالگزاری بند ہو چکی ہے۔ زمینیں بہت کم بچی ہیں۔ کبھی بیٹے کے مستقبل کو لے کر سوچا ہے— ؟ یا یہ بھی مجھے سوچنا ہوگا— بلند حولی۔ اللہ تیری شان نرالی— بچپن سے یہ محاورہ سنتی آئی تھی کہ اللہ گنجے کو ناخن نہ دے— '

اماں زور زور سے بولتی ہوئی ہنستی ہیں— اور آپ جیسوں کو حویلی نہ دے۔ سب لٹا دیا— اور اب لٹانے کے لیے بھی کچھ نہیں......'

ابا کے زوردار خراٹے گونج رہے تھے۔ اماں نے رک کر ابا کے خراٹوں کو محسوس کیا— دل کی بھڑاس نکل چکی تھی۔ اب وہ مطمئن تھیں— اب انہیں اچھی نیند آئے گی۔

لیکن نیند میری آنکھوں سے اچٹ چکی تھی۔

●●

وہ پہلی رات تھی جب میں نے محسوس کیا، میں ایک کیڑے میں بدل گیا ہوں— ٹھیک ویسے ہی جیسے مٹیا مارفوسس کے اس کردار نے خود کو محسوس کیا تھا۔ آسمان پر جھل مل کرتے تاروں کی

روشنی میں، چھت پر چار پائی پر لیٹا ہوا عبدالرحمٰن کا ردار گم ہے — اور اس کی جگہ ایک بدنما کیکڑے نے لے لی ہے — میں خود کو ہلا ڈلا کر دیکھ رہا تھا۔ مگر یہ کیا — ؟ میں جیسے بستر سے چپک کر رہ گیا تھا۔

اماں آنکھیں موند کر سوگئی تھیں۔

ابا کے خراٹے بج رہے تھے۔

آسمان پر بدلیاں چھا گئی تھیں۔ لیکن اس کے باوجود تاروں کا رقص جاری تھا — اور یہاں بستر پر ایک بدنما کیکڑا آ گیا تھا۔

(۳)

میں اپنے بچپن کے بے حد حسین دنوں کا ذکر کرنے سے قاصر ہوں، جیسا کہ عام طور پر بڑے ہو جانے کے بعد لوگ اپنے بچپن کو لے کر شیخیاں بگھارتے ہیں — میں ایسی کوئی شیخی بگھارنے کے قابل بھی نہیں ہوں۔ کیوں کہ جس نئی دنیا کا تذکرہ میں نے پچھلے صفحوں میں آپ سے کیا تھا، وہاں خوشی اور سکون کے لیے شاید بہت کم جگہ بچی تھی — اس لیے کہ تبدیلیوں کی آندھی بہت تیز تھی۔ پرانے پتے درخت سے ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر رہے تھے اور ان کی جگہ نئے سبز پتّے پیدا ہو رہے تھے — اماں اور ابّا کی گفتگو سے نکلے الفاظ اب پہچاننے لگا تھا اور مجھے کہنا چاہیے، میں خود کو غیر محفوظ سمجھنے لگا تھا۔

جی ہاں، غیر محفوظ —

میرے اندر کا شاعر بے حد خاموشی سے سامنے آ رہا تھا۔ مگر اس فنکار پر گھر کی موجودہ فضا حاوی تھی۔ گھر کی اداسی، خاموشی، بلند حویلی میں پھیلا ہوا سنّاٹا — میں اکثر سوچتا تھا، اماں اتنی چڑ چڑی کیوں ہیں — ؟ مریم بوا سے لے کر ابّا تک کی ہر بات اُنہیں ناگوار کیوں گزرتی ہے۔

مگر اب میں ان تمام باتوں کا تجزیہ بڑے آرام سے کرسکتا ہوں— اور یہ کہانی اسی جاگیردارانہ نظام سے وابستہ ہے، جس نظام میں اماں پہلی بار دلہن بن کر اس گھر میں آئی تھیں— تب سے لے کر آج تک کے دنوں کا تجزیہ کوئی مشکل کام نہیں کہ اماں نے کس طرح اپنے آپ کو اس گھر کے لیے قربان کر دیا تھا۔ ایک ایسے گھر کے لیے، جسے گھن لگ چکا تھا— اور اماں حویلی سے وابستہ ان تمام لوگوں سے واقف تھیں، جن کی اوقات اس نظام میں محض چوسی ہوئی ہڈی سے زیادہ نہیں تھی— جن کے پاس خالی اور بیکار وقتوں کا خزانہ تھا۔ جن کے پاس کوئی خواب نہیں تھے۔ صرف ماضی کی کہانیاں تھیں۔ پدرم سلطان بود— اور اماں کی شکایت بیجا نہیں تھی کہ یہ لوگ اب بھی خود کو اسی نوابی عہد کا ایک حصہ تسلیم کرتے تھے—

اور اسی لیے اماں کے اندر ابّا کو لے کر شاید اتنی شکایتیں جمع ہوگئی تھیں، جن کا حساب نہیں کیا جاسکتا۔ ابّا، اس سچ سے واقف تھے۔ مگر مجبور— کیونکہ فیوڈل سسٹم نے ابّا کو کھوکھلا کر دیا تھا۔ سچ بدل گیا تھا— لوگ بدل گئے تھے— اور بقول ابّا، بڑے چھوٹے ہوتے جارہے تھے۔ اور چھوٹے ، بڑے—

ہم ایک جنگ سے نکل کر دوسری جنگ کی طرف بڑھتے ہیں۔ جیسے ایک تہذیب سے نکل کر دوسری تہذیب کی طرف۔

●●

اسی درمیان ایک ایسا واقعہ اس حویلی میں پیش آیا، جس کا ذکر اب یہاں ضروری ہوگیا ہے۔ بہت ممکن ہے، اس واقعہ نے ابا کو کچھ دیر کے لیے ذہنی تقویت دی ہو، مگر اماں کا پارہ گرم تھا۔ میرے لیے سب کچھ کسی طلسمی کہانی کی طرح تھا۔ یعنی ایک ایسی حقیقت جسے ابھی سمجھنے سے میرا معصوم ذہن قاصر تھا—

ایک صبح دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز آئی۔ ابّا نے دروازہ کھولا تو سامنے مولوی محفوظ کھڑے

تھے۔ خشخشی داڑھی — آنکھوں میں سرمہ، سفید کرتا پائجامہ — اور کندھے پر تہہ کی ہوئی گندمی رنگ کی شال لپیٹے — ابّا کے پیچھے پیچھے میں بھی تھا —

السلام علیکم — ابا نے سلام کیا — مگر اس سلام میں گرم جوشی نہیں تھی۔

'وعلیکم السلام — ' مولوی محفوظ کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ اندر آنے کے لیے نہیں کہیں گے وسیع بھائی۔'

'ہاں ہاں کیوں نہیں — تشریف لائیے۔'

'ٹھہریئے — '

مولوی محفوظ کے قدم آگے نہیں بڑھے۔ وہیں رُکے رہے — آنکھیں بند تھیں۔ آہستہ آہستہ ہونٹوں سے کچھ بدبدا رہے تھے۔ پھر آنکھیں کھول لیں۔ اب ان آنکھوں کی چمک پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ چکی تھی۔

'سب اللہ کی مصلحت — کہتے ہیں نا، اللہ کی مصلحت کے بغیر ایک پتہ بھی نہیں ہلتا۔ اور اس کی مصلحت نہ ہوتی تو میرے قدم خود بہ خود آپ کے گھر کی جانب نہیں اٹھ سکتے تھے — سبحان اللہ —

سبحان اللہ کی ادائیگی ذرا زور سے کی گئی — وہ اب بھی مسکرا رہے تھے — 'وسیع بھائی، آپ ان باتوں کو نہیں سمجھیں گے۔ مگر میری آنکھیں جو دیکھ رہی ہیں، وہ آپ کی آنکھیں نہیں دیکھ رہی ہیں۔ آپ صرف ایک بے رونق ویران ہوتی بلند حویلی کا مرثیہ پڑھ رہے ہیں، جبکہ میں اس حویلی میں کچھ اور دیکھ رہا ہوں — وہ ایک بار پھر اپنی خشخشی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے زور سے چیخے — سبحان اللہ۔ اللہ تیری شان نرالی۔

میری آنکھیں اس مکالمے پر حیران تھیں —

ابّا کی پتلیوں میں الجھن کے آثار دیکھے جاسکتے تھے — مگر آپ نے آخر ایسا کیا دیکھ لیا۔ اب تو نہ ہاتھی ہے۔ نہ ہاتھی پالنے والے۔ بس بلند حویلی — نام کی حویلی ہے۔ نام ہی بلند ہے۔

ورنہ، کہیں کوئی بلندی باقی نہیں بچی۔'

'ایسا آپ مانتے ہیں نا— مانیے۔ آپ کو ماننے کا حق ہے— مگر destiny کو تو مانتے ہیں نا آپ— تقدیر— سبحان اللہ— اللہ تیری شان نرالی۔ آپ کچھ سوچتے ہیں' تقدیر کچھ اور سوچتی ہے۔ آپ ایک مہرہ چلتے ہیں۔ تقدیر اس مہرے کو الٹ دیتی ہے۔ آپ پیچھے جاتے ہیں اور اچانک تقدیر آپ کو آگے لے جاتی ہے۔ تقدیر سے کب کوئی جیت سکا ہے بھائی—؟'

'تقدیر......؟'

مولوی محفوظ کے چہرے کی مسکراہٹ مزید پراسرار ہوگئی تھی— 'ہاں، تقدیر— آپ نے بالکل ٹھیک سنا۔ تقدیر آپ کے ساتھ مذاق نہیں کر رہی۔ بلکہ ایک نیا کھیل کھیلنے والی ہے۔ مزہ تب ہے جب آپ خود کو اس کھیل کا ایک حصہ بنا لیجئے۔ میری مانیے تو خود کو تقدیر کے سپرد کر دیجئے— اور کھیل کا مزہ لیجئے— وہ کہتے ہیں نا— کھیل دیکھو کھیل کی دھار دیکھو— سبحان اللہ......'

ابّا کچھ حیران سے تھے۔ 'میں اب بھی کچھ نہیں سمجھا۔'

'ارے اتنی دیر سے باتیں کیے جا رہا ہوں۔ آپ کیا چائے کے لیے بھی نہیں پوچھیں گے وسیع بھائی۔ ہم اتنے غیر ہو گئے۔ مانتا ہوں، آپ کو مجھ سے شکایت پیدا ہوگئی ہے۔ آج آپ کی یہ شکایت بھی دور کرنے آیا ہوں—'

'آیئے— اندر آیئے—' ابا نے دروازے سے آواز لگائی— پردہ کر لیجئے۔

یہ عام دستور تھا— کیونکہ مردانہ کمرہ صحن سے ہو کر جاتا تھا، جہاں عام طور پر مہمانوں کو بیٹھایا جاتا تھا— گھر میں کوئی مہمان تشریف لاتا تو سب سے پہلے گھر کی عورتوں کو پردہ کرنے کے لیے کہا جاتا— پردہ کر لیجئے کی آواز کے دو سکنڈ بعد ہی مولوی محفوظ اندر کی طرف بڑھے۔ مین دروازے پر بڑا سا پردہ لٹکتا تھا۔ صحن کے دائیں طرف مردانہ کمرہ یا ڈرائنگ روم تھا۔ لیکن صحن میں آتے ہی مولوی محفوظ کے قدم ایک بار پھر رک گئے۔

ٹھہریئے—

'اُنھوں نے آنکھیں بند کیں۔ کچھ دعا پڑھی۔ پھونک ماری — پھر ابّا سے گویا ہوئے۔

'عورتوں کو ابھی اس طرف آنے سے منع کیجئے اور ممکن ہو تو یہیں دو کرسیاں منگا لیجئے۔

'یہاں......؟'

'ہاں بھئی۔ سبحان اللہ......' مولوی محفوظ کی آنکھیں چمک رہی تھیں — 'میں نے کہا تھا نا، جو میں دیکھ رہا ہوں، وہ آپ نہیں دیکھ رہے ہیں۔ اور آپ دیکھ بھی نہیں سکتے محفوظ بھائی۔ دو کرسیوں کے ساتھ ساتھ مٹھائی بھی منگوائیے۔ اور ہاں میری یہ بات گرہ میں باندھ لیجئے کہ بلند حویلی کی تقدیر سنورنے جارہی ہے —

میں نے دیکھا، اس پار دروازے سے لگی اماں کی آنکھوں میں فکر کے آثار تھے۔ اماں مجھے ہاتھ کے اشارے سے بلا رہی تھیں۔ لیکن میں اس دلچسپ گفتگو کو چھوڑ کر جانا نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے کچھ دیر ہاتھ ہلانے کے بعد اماں دروازے سے ہٹ گئی تھیں۔ ابا کی بے جان پتلیوں میں حیرانی کے رنگ جھلک رہے تھے۔

'پہیلیاں مت بجھائیے مولوی صاحب۔ صاف صاف بتائیے۔'

مولوی محفوظ نے پلٹ کر ابّا کی آنکھوں میں جھانکا — پہلے آپ کی شکایت دور کرتے ہیں۔ یقیناً آپ کو مجھ سے ناراض ہونے کا حق حاصل ہے۔ آخر آپ کے خاندان سے، پشتوں سے ہمارا اٹھنا بیٹھنا رہا ہے۔ لیکن نظر محمد کی حماقت کی سزا مجھے کیوں ملے —؟'

'کیونکہ آپ نے اسے میرے پاس بھیجا —'

'قطعی نہیں — آپ ایسا سوچ بھی کیسے سکتے ہیں — کیا میں ایسا کرسکتا ہوں —؟ اللہ معاف کرے —' اُنھوں نے اپنے پچکے ہوئے گالوں پر تھپڑ مارا — آپ کی ناراضگی بجا ہے۔ لیکن جب میں نے ایسا کیا ہی نہیں تو بھلا میں کیوں قصوروار؟ میں آپ کو ساری کہانی سمجھاتا ہوں۔'

صحن میں کرسیاں لگ گئی تھیں۔ چائے اور نمکین کے لیے ایک چھوٹا سا اسٹول بھی آگیا۔ کچھ دیر بعد مریم بوا نے آواز لگائی۔

'بوا— چائے لے جاؤ—'

مریم بوا— مجھے بوا بولتی ہیں۔ چائے کی ٹرے ہاتھ میں لے کر میں دوبارہ واپس آ گیا۔ مولوی محفوظ نے چائے اٹھائی— میری طرف دیکھا۔

'ماشاءاللہ— بڑا ہونہار بچہ ہے۔ اللہ نظر بد سے بچائے—' نمکین اور مٹھائی میں نے اسٹول پر سجا دی تھی۔ مولوی محفوظ نے مٹھائی کا ایک ٹکڑا اٹھا کر منہ میں ڈالا—

'آپ تو جانتے ہیں' کوٹھی میں جنوں کا سایہ ہے— میں نے نظر محمد کو شادی سے پہلے بھی صلاح دی تھی۔ جان کی امان چاہتے ہو تو کوٹھی کرائے پر اٹھا دو اور کہیں دوسری جگہ منتقل ہو جاؤ— مگر میری بات کون سنتا ہے— سو دیکھئے، بھگت رہے ہیں۔ ایک رات شادی کے کچھ ہی دنوں بعد بیوی پاخانہ سے نکلیں تو شاہ جنات سوار ہو گیا— اس کے قبضے میں پورے تین ہزار جنات ہیں— اور آپ تو جانتے ہیں، جنات ایسے تھوڑے ہی بھاگتے ہیں۔ جہاں مسکن بنا لیتے ہیں' وہاں سے اُنہیں نکالنا کتنا مشکل ہوتا ہے۔ ہم ٹھیک کرنے کی کوشش کر رہے ہیں مگر آپ تو جانتے ہیں، شفا دینا اللہ کے ہاتھ میں ہے— ہم اپنی طرف سے ہر ممکن تدبیر کر رہے ہیں— اور اسی تدبیر میں سے ایک تھا......

'وہ سفید کاغذ......اور سفید مرغ......؟'

'ہاں، مجھے عمل کرنے کے لیے اس کی ضرورت تھی۔'

لیکن کیا اس کے لیے صرف میرا خاندان ملا تھا آپ کو— ؟ ابّا کے چہرے پر ناراضگی تھی۔

'قطعی نہیں— بھلا آپ کا خاندان کیوں ملے گا؟ میری آپ کے خاندان سے کیا دشمنی ہے— اور یہی تو سمجھانے آیا ہوں میں۔ میں نے نظر محمد سے صرف اتنا کہا تھا— ایک سفید کاغذ اور ایک سفید مرغ لے کر آؤ— لیکن یہ نہیں کہا تھا کہ وہ آپ سے لے کر آئے—'

'لیکن آپ ان سے دریافت تو کر سکتے تھے— ؟'

'بجا فرمایا آپ نے......سبحان اللہ۔ آپ کی ناراضگی بالکل درست، مگر وسیع بھائی، پوچھتا

تو کس طرح پوچھتا۔ اب آپ سے کیا چھپانا کہ سفلی عمل کے درمیان ہم لوگ اتنا الجھ جاتے ہیں کہ غیر ضروری چیزوں کی طرف توجہ بھی نہیں جاتی—'

'چاہے کسی کا گھر تباہ ہو جائے—' ابّا نے چٹکی لی—

مولوی محفوظ نے بالکل بھی برا نہیں مانا— 'اب چھوڑیے بھی— نظر محمد کو معافی دے دیجئے— اور ہاں، میں جو کہہ رہا ہوں، اسے کان کھول کر سن لیجئے— بلند حویلی کی تقدیر کھلنے والی ہے— سبحان اللہ— میری آنکھیں وہ منظر دیکھ رہی ہیں جو آپ خواب وخیال میں بھی سوچ نہیں سکتے— ذرا ٹھہریئے......

چائے ختم ہو چکی تھی— مٹھائی اور نمکین کی پلیٹ بھی خالی ہو چکی تھی۔ مولوی محفوظ اٹھے۔ صحن کے ارد گرد گول گول گھومنے لگے— ابّا غور سے دیکھ رہے تھے۔ میرے لیے یہ سب کچھ کسی عجوبہ سے کم نہیں تھا— اور سب سے زیادہ تو یہ آدمی، مولوی محفوظ— صحن کے چاروں طرف گھومتے ہوئے وہ مجھے مولوی کم کسی سرکس کا جوکر زیادہ نظر آرہا تھا۔ وہ کبھی رکتے— کبھی اُنگلیوں پر کچھ گنتے— کبھی آنکھیں بند کرتے— پھر کھولتے— پھر گھومنا شروع ہو جاتا— اچانک وہ ایک جھٹکے سے رکے، چمکتی آنکھوں سے ابّا کی طرف دیکھا—

'وسیع بھائی— جو کہوں گا مانیں گے......؟'

'پہلے آپ بتایئے تو سہی—'

'نہیں پہلے آپ مجھے یقین دلایئے۔ آپ مجھ پر بے وجہ شک تو نہیں کریں گے— ؟ اور جو کچھ کہوں گا، وہ آپ تسلیم کریں گے......'

ابّا گھر آئے مہمانوں کی عزت کرنا جانتے تھے۔

'حکم—' ابّا خاموشی سے بولے۔

'سبحان اللہ۔ اللہ تیری شان نرالی—' مولوی محفوظ نے قدرے زور سے ادائیگی کی۔ پھر ابّا سے بولے...... سنیے...... ذرا گھر میں سفید چونے کا برادہ ہو تو وہ منگوائیے— ابھی اسی وقت......'

'لیکن......'

'لیکن ویکن بعد میں پوچھئے گا وسیع بھائی۔ ابھی نہیں— ابھی مجھے میرا کام کرنے دیجئے—'

ابا نے مجھے اشارہ کیا۔ کچھ دن پہلے ہی کچن کے پاس والی دیوار کی پتائی کے لیے ابا نے ایک بورا سفید چونے کا برادہ منگوایا تھا— میں نے جاتے ہوئے دیکھا۔ مولوی محفوظ کی آنکھیں بند تھیں۔ اب بھی وہ انگلیوں پر کچھ گنتی گن رہے تھے۔ جیسے کچھ حساب لگا رہے ہوں۔ لیکن ان کی آنکھوں اور چہرے سے روشنی کی کرن پھوٹ رہی تھی۔

چونے کا برادہ آ گیا تھا۔ مولوی محفوظ نے آنکھیں کھول دیں۔ مسکرا کر میری طرف دیکھا۔ مٹھیوں میں برادے کو لیا پھر صحن کے ایک طرف چونے کے برادے سے ایک گول دائرہ کھینچ دیا۔

'یہ کیا ہے؟' ابا کی آنکھوں میں حیرت تھی۔

'بس، اگلی بار میرے آنے تک اس حصے کو مت چھیڑیئے گا— میرا انتظار کر لیجئے گا—'

'مگر یہ ہے کیا......؟'

مولوی محفوظ مسکراتی، معنی خیز آنکھوں سے ابّا کو دیکھ رہے تھے۔

'سب کچھ ایک ہی دن میں جان لیں گے کیا وسیع بھائی۔ ذرا انتظار کیجئے۔ ذرا ایک دن صبر سے کام لیجئے—' وہ مسکرا رہے تھے۔ 'صبر کا پھل یقیناً میٹھا ہوتا ہے—'

'مگر اللہ کے واسطے کچھ تو بتا دیجئے— یہ کوئی جادو ٹونہ، توڑ تو نہیں—' ابّا نے اپنا شک جتایا......

'توبہ توبہ......کیسی باتیں کرتے ہیں وسیع بھائی۔ اللہ کے واسطے ایسا برا خیال بھی دل میں نہ لائیے۔ میں آپ اور آپ کے خاندان کے بارے میں کبھی برا سوچ بھی نہیں سکتا۔ لیکن افسوس، ابھی اس وقت اس گول دائرے کے بارے میں نہیں بتا سکتا— آپ کو مزید ایک دن انتظار کرنا ہوگا۔

مولوی محفوظ مسکرا رہے تھے— 'مٹھائی اچھی تھی......' وہ میری طرف مڑے تھے— بیٹا،

اپنی اماں سے پوچھنا، کیا نعمت خانے میں ایسی ایک مٹھائی اور بھی پڑی ہے۔ ہے تو ضرور لے آنا—' وہ ابّا کی طرف دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔

'محفوظ بھائی، میں نہیں جانتا، آپ یقین کریں گے یا نہیں، لیکن اس بلند حویلی کے دن پلٹنے والے ہیں۔ بیحد اچھے دن آنے والے ہیں اس حویلی کے......'

●●

مولوی محفوظ تو چلے گئے لیکن ابّا اور سارے گھر کو الجھن میں ڈال گئے۔ ان کے جاتے ہی بجلی کی سرعت سے اماں نکل کر سامنے آ گئیں۔

'اب یہ مردود کس لیے آیا تھا......'

'ایسا نہیں کہئے— ملنے آیا تھا۔'

'ملنے آیا تھا؟ بڑا آیا ملنے والا۔ میں اس منحوس کو اچھی طرح پہچانتی ہوں— جادو ٹونا کرتا چلتا ہے۔ اسی لیے چہرے پر نحوست برستی ہے۔ اللہ ایسے لوگوں کے چہرے کے نور ہی چھین لیتا ہے— مگر میں پوچھتی ہوں۔ یہاں کیوں آیا تھا—'

'اب جانے بھی دو— اِدھر سے گزر رہے ہوں گے، سوچا کہ ہم سے بھی ملتے چلیں۔'

'بالکل نہیں— کوئی نیا فتور دل میں سمایا ہوگا...... اماں کے دل میں آگ لگی ہوئی تھی۔ اسی مردود نے تو کاغذ اور مرغا منگایا تھا— میں اس کی رگ رگ سے واقف ہوں۔'

'کیسے واقف ہو؟' ابّا اس ماحول میں بھی مسکرانا نہیں بھولے— 'مولوی محفوظ کو تم نے دیکھا کب ہے۔ وہ آتے ہیں تو پردہ ہو جاتا ہے۔'

'پردہ اور بات ہے۔ پردہ کرنے سے کیا آنکھیں بند ہو جاتی ہیں—' اماں کا موڈ تو جھگڑا کرنے کا تھا— 'لیکن میں جانتی ہوں— وہ ایسے نہیں آیا ہوگا— کچھ نہ کچھ وجہ ضرور رہی ہوگی۔'

میں دیکھ رہا تھا، ابّا کی مسلسل یہ کوشش تھی کہ اماں صحن میں اس جگہ کو نہ دیکھ لیں، جہاں مولوی

محفوظ نے چونے کا گھیرا بنایا تھا۔ وہ اُنہیں بات میں مصروف کر کے واپس بھیجنا چاہتے تھے۔ مگر اماں تو اماں تھیں۔

'ارے ہاں— اس نے کچھ منگایا بھی تھا۔ وہ...... چونے کا برادہ؟ وہ کس لیے......؟ اب اماں کی آنکھیں پرندے کی طرح ادھر اُدھر دیکھ رہی تھیں اور آخر کار اماں کی آنکھوں نے وہ جگہ دیکھ لی جہاں چودھری محفوظ گول دائرہ بنا گئے تھے۔ اماں کی آنکھیں جیسے اس دائرے سے چپک کر رہ گئی تھیں۔ آنکھوں میں طوفان تھمنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ وہ جھٹ سے آگے بڑھیں۔ صحن میں ادھر اُدھر دیکھا— پھر دائرے کی طرف اشارہ کیا......

'یہ کیا ہے......؟'

'میں کیا جانوں— 'ابا چپ تھے۔

'آپ کیا جانیں— 'اس مردود کے آنے سے پہلے تو یہ نہیں تھا۔ اب کیا غیبی طاقت یہ دائرے بنا گئی۔'

'جب جانتی ہو تو کیوں پوچھ رہی ہو— 'ابا کا لہجہ کمزور تھا۔

'اے ہے......تو مردود یہ کارگزاری کر گیا ہے— 'وہ زور سے چلائیں— 'رحمٰن— ادھر مت آنا۔ اس دائرے سے دور رہنا۔ مجھے پہلے ہی شک تھا۔ منحوس کی بری نظر اب میرے گھر پر ہے۔ یا خدا میرے بیٹے کو، اس گھر کو اپنی امان میں لے لے۔ یا خدا اس گھر کو بری بلا سے محفوظ کرنا......'

'محفوظ رکھنا— 'ابّا اس ماحول میں بھی ہنسنا نہیں بھولے— 'آخر تم نے مولوی محفوظ کا نام لے ہی لیا—'

لیکن اماں پر ابّا کی بات کا کوئی اثر نہیں ہوا—

'میں پوچھتی ہوں آپ کے رہتے اسے ایسا کرنے کی ہمت کیسے ہوئی—؟ کیا آپ اس گھر کی، اپنے بیٹے کی سلامتی نہیں چاہتے......؟ کیسے باپ ہیں آپ......؟'

’بیگم، تم غلط سمجھ رہی ہو — جو سمجھ رہی ہو، وہ ویسا نہیں ہے۔‘

’پھر کیا ہے؟‘

اماں نے جیسے آج جی بھر کر لڑنے کی ٹھان لی تھی۔

’میں نہیں جانتا — لیکن تم جو سوچ رہی ہو وہ بھی صحیح نہیں ہے۔‘

’پھر صحیح کیا ہے — آپ ہی بتایئے — کچھ دن پہلے وہ اس گھر پر سحر کرنا چاہتا تھا اور آج جادو کے دائرے کھینچ گیا۔ آپ جانتے ہیں ان دائروں کا مطلب؟ کیا میں اتنی بچی ہوں کہ ان دائروں کا مطلب نہیں جانتی......‘ اماں کی آنکھوں سے آنسو نکل رہے تھے — ’بس ایک ہی تو بیٹا ہے اپنا۔ بلند حویلی کی تقدیر روٹھ چکی ہے۔ لیکن لوگ ابھی بھی یہاں کے رہنے والوں پر نظر گڑائے بیٹھے ہیں۔ میں پوچھتی ہوں، وہ مردود ایسا ہی ہمدرد ہے۔ تو پہلے کیوں نہیں آیا۔ کبھی آپ کی، ہماری یا ہمارے بیٹے کی خیریت پوچھی — اور آج بری نیت سے آیا اور آپ کی موجودگی میں سحر کر گیا —‘

’بس ہو گیا — دل کی بھڑاس نکل گئی۔ یا کچھ اور بچا ہے تو وہ بھی پہلے نکال دو......‘

ابّا نے سپر ڈال دی تھی۔

امّاں آنسو پوچھ رہی تھیں — ’آپ شریف بنے رہیے۔ آج شرافت کا زمانہ نہیں رہا — لوگ آپ کی شرافت کا فائدہ اٹھاتے ہیں اور اسی کمزوری کا فائدہ اٹھا کر وہ آیا — مزے سے چائے پی اور جادو کی لکیریں کھینچ کر چلا گیا۔‘

’وہ پھر آئے گا بیگم......‘ ابّا زور سے چلّائے۔ صرف اپنی بولتی رہتی ہو۔ کبھی میری بھی سن لیا کرو — وہ کل پھر آئے گا — اور اگر یہ جادو ہے تو اپنا غصہ خود ہی نکال لینا —‘

’حجاب توڑ کر؟ پردے سے باہر نکل کر —؟ اماں کا چہرہ لال سرخ ہو رہا تھا۔ میں تو یہیں پردے کے پیچھے سے سوصلوٰۃ سناؤں گی اسے۔ مگر وہ کل پھر کیوں آئے گا۔ ہائے اللہ — کوئی بڑا گل تو نہیں کھلا رہا مردود —؟‘

’ایسا کچھ نہیں ہے۔‘

’آپ سیدھے ہیں۔آپ ان جھاڑ پھونک کرنے والوں کی قوم سے آگاہ نہیں۔مگر میں خوب واقف ہوں۔اچھا کل ہونے دیجئے— آنے دیجئے اسے—اس کا بھوت خود اس پر نہ اتار دیا تو میرا نام بدل دیجئے گا۔

امّاں نے زور سے میرا ہاتھ تھاما۔

’چل رے رحمٰن— اور ہاں کان کھول کر سن لے۔ جب تک وہ مردود آکر خود ہی یہ دائرے ختم نہیں کرتا۔تیرا صحن میں کھیلنا بند—‘

ابّا بے چارگی سے اماں کو دیکھ رہے تھے۔

میں یکا یک سناٹے میں آگیا تھا—

●●

محرابیں مجھے ڈس رہی تھیں۔ درخت اور اس کی شاخیں ڈراؤنی لگ رہی تھیں۔ بے رونق دیواروں میں خوفناک آنکھیں نظر آ رہی تھیں۔ چھت کی سفیدی جھڑ گئی تھی...... وہاں الگ الگ بھیانک چہرے بنے ہوئے نظر آرہے تھے......

عرصہ بعد میں نے پھر اپنی نوٹ بک نکالی—اور اس پر لکھا......

’میرے چاروں طرف بھوت ہیں/

آنگن میں......صحن میں/چھت پر/

پیڑوں سے لٹکے بھوت......

دیواروں سے جھانکتے بھوت......

میں گم ہونے لگا ہوں—

یا پھر......

میں بھوت بننے لگا ہوں......‘

کمرے کی کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ یکا یک ایسا لگا۔ جیسے کھلی کھڑکی سے دو آنکھیں میری

جانب دیکھ رہی ہوں۔

میں ایک بار پھر ڈر گیا تھا—

(۴)

اچانک میری اہمیت بڑھ گئی تھی۔ یا میں ایسا شخص تھا، جسے کوئی مارنا بھی چاہتا تھا۔ اماں کا بس چلتا تو وہ شاید مجھے باہر...... یا اسکول جانے پر بھی پابندی لگا دیتی۔ مگر افسوس اماں کے لیے ایسا کر پانا ممکن نہیں تھا—

میں سوالوں کے نرغے میں تھا— کوئی مجھے کیوں مارنا چاہتا ہے؟ مولوی محفوظ یا نور محمد کے والد......؟ میں گھنٹوں اسی موضوع پر سوچ رہا تھا۔ نور محمد کی والدہ کا چہرہ بھی میری آنکھوں کے آگے منڈرا رہا تھا۔ مجھے سب سے زیادہ دکھ اس بات کا تھا کہ نور محمد سے میرا ملنا لگ بھگ بند ہو چکا تھا۔ وہ اسکول میں بھی مجھ سے بچنے کی کوشش کرتا۔ لیکن شاید میں اس سے باتیں کرنا چاہتا تھا— جیسے یہ کہ میں خود اس کے گھر کے لیے کتنا خاص ہوں— یعنی، میں ہی وہ شخص ہوں، جسے اس کی امی کی صحت کے لیے نشانہ بنایا گیا۔ اس طرح انجانے طور پر زیادہ مضبوطی کے ساتھ میں خود کو نور محمد کے گھر سے وابستہ محسوس کرتا—

رات کے وقت آسمانی چادر کے نیچے سوتے ہوئے ابّا نے امی کو سمجھا دیا تھا کہ مولوی محفوظ کس لیے آئے تھے۔ لیکن امّی کا شک اب تک دور نہیں ہوا تھا۔ ہاں، ایک عجیب سی پراسرار مسکراہٹ اندھیرے میں بھی ان کے چہرے پر محسوس کی جا سکتی تھی۔

'بلند حویلی کی تقدیر کھلے گی......؟'

'ہاں......'

'یہ مولوی محفوظ نے کہا......؟'

ہاں......

امی ہنس رہی تھیں— 'آپ نے بتایا نہیں کہ اس بلند حویلی کی کبھی کوئی تقدیر تھی ہی نہیں— ارے تقدیر بنانے والا تو اللہ ہے۔ اگر تقدیر ہی بنانی تھی تو مولوی محفوظ نے اپنی تقدیر کیوں نہیں سنوار لی— دو دو بچے ہیں۔ آوارہ نکل گئے۔ ایک سال پہلے بیوی کا انتقال ہو گیا— سنتے ہیں کہ بیوی پر بہت ظلم کرتا تھا......'

'اب رہنے بھی دو......'

'بلند حویلی کی تقدیر کھلے گی......' اماں کی آنکھوں میں حیرت کے قمقمے روشن تھے۔ اچھا چلیے— میں بھی دیکھتی ہوں۔ وہ کیا کرتا ہے، کیا بتاتا ہے—' امی شک کے دائرے میں تھیں— 'ہوسکتا ہے، وہ سچ بول رہا ہو......'

'اب یہ تو خدا جانے......'

'ان لوگوں کا بھی کوئی ٹھکانہ نہیں— ہوسکتا ہے الٹا پلٹا کرتے ہوئے سیدھا آنے لگا ہو......'

'الٹا پلٹا کرتے ہوئے سیدھا......' ابا کو یہ محاورہ عجیب سا لگا تھا— ہاں ہوسکتا ہے۔ واقعی عامل ہو......'

میں نے پلٹ کر امی کو دیکھا— امی کی آواز بدل گئی تھی۔ اس تبدیلی پر حیران ہونے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ ممکن ہے امی نے تصور میں بلند حویلی کی تقدیر کو مسکراتے ہوئے دیکھ لیا ہو— ابا چپ تھے— ہوا تیز چل رہی تھی— جب بہت زیادہ پریشانیاں گھیرتی ہیں تو کہیں امید کی ایک کرن بھی آپ کو فریب دینے کے لیے تیار رہتی ہے— مجھے یقین تھا، امی فریب میں آ گئی تھیں۔

یا ممکن ہے، بلند حویلی کی تقدیر سچ مچ کھلنے والی ہو۔

●●

دوسرے دن ٹھیک بارہ بجے مولوی محفوظ دوبارہ آ گئے۔ ان کے ساتھ ایک ۲۵۔۲۴ سال کا

نوجوان تھا۔ گندمی چہرہ، قد پانچ فٹ چھ انچ کے آس پاس۔ سر پر ٹوپی، کرتا اور پائجامہ پہنے—
دعا سلام کے بعد صحن میں کرسیاں سج گئیں۔
سب سے پہلے چائے پی گئی—
'یہ اسلم ہیں— مولوی محفوظ نے نو وارد کو ملاتے ہوئے کہا— میرے ساتھ ہی کام سیکھ رہا ہے۔ بڑا ہونہار بچہ ہے۔ کل دیر تک ہم آپ کے گھر کے تعلق سے گفتگو کرتے رہے۔ آپ آنکھیں دیکھ رہے ہوں گے میری۔ ساری رات جاگنے کا نتیجہ ہے۔ مگر بھائی، مان گئے اللہ کی نعمتوں کو— وہ کب دے گا، کیسے دے گا— یہ سمجھنا مشکل ہے— اور اسی لیے تو کہتے ہیں۔ اللہ کی لاٹھی میں آواز نہیں ہے—'
'پہیلیاں مت بجھائیے— 'ابّا ان پہیلیوں سے تنگ آ گئے تھے۔
'پہیلی نہیں، وسیع بھائی— زندگی ہے تو حیرانیاں ہیں۔ آنکھیں قدم قدم پر حیرانیاں دیکھتی ہیں۔ قدرت کی گلکاری دیکھیے— نیلے آسمان کو، تاروں کی بارات کو، اس حسین کائنات کو...... ذرّے ذرّے میں خدا کا جلوہ نظر آتا ہے۔ جو منکر ہیں، یہ جلوے ان کے لیے نہیں ہیں—'
'یہ سچ ہے— 'ابّا نے حامی بھری۔
'اور یہ دنیا یقین پر قائم ہے وسیع بھائی۔ ورنہ کرنے والے ہم کون ہوتے ہیں۔ کرتا تو خدا ہے۔ ہم تو محض وسیلہ بن جاتے ہیں۔ اب دیکھیے نا۔ خدا جسے دے، چھپّر پھاڑ کے دے۔ کیسے کیسے لوگ دنیا میں آئے اور چلے گئے— کسی کو تاج و تخت، کسی کو بادشاہ بنا دیا— کسی سے سلطنت چھین لی۔ سب اللہ کی مصلحت— اس کے کام، وہی جانے...... ہاں تو میں کہہ رہا تھا۔ ہم لوگ تو بس معمولی وسیلہ ہیں۔ اب جیسے کوئی انجینئر ہے، ڈاکٹر ہے، ویسے ہم بھی اپنے کام میں ماہر ہیں۔ جیسے کوئی وید یا حکیم بغیر نبض دیکھے بھی مرض کی تشخیص کر لیتا ہے۔ ٹھیک ویسے ہی...... ہماری آنکھیں بھی گمشدہ خزانوں کے راز جان لیتی ہیں—'
پہلی بار ابّا چونک گئے تھے— 'گمشدہ خزانہ......؟'

میری انکھوں میں بھی چمک لہرائی تھی——

'ہاں وسیع بھائی—— گمشدہ خزانہ—— کہتے ہیں صدیوں سے زمین میں دفن خزانہ گھومتا رہتا ہے—— قارون کے پاس کتنی دولت تھی—— کیا آج کا کوئی حکمراں یا بادشاہ قارون کے خزانے سے اپنا موازنہ کرسکتا ہے——؟ سوال ہی نہیں اٹھتا—— بیش قیمت خزانہ—— مگر کیا ہوا۔ قارون کو بھی موت لے گئی——اور زمین کے اندر اس کا خزانہ آج تک گھوم رہا ہے——'

ابّا کی آنکھوں کی چمک تیز ہوگئی تھی۔

'اور وسیع بھائی۔ آپ تو پڑھے لکھے آدمی ہیں۔ خاندانی آدمی ہیں۔ آپ سے کیا چھپا۔ آپ نے بھی ہزاروں کہانیاں سنی ہوں گی۔ یہ خزانہ آواز دیتا ہے۔ مگر یہ آواز سب نہیں سنتے۔ زمین کے اندر گڑا خزانہ برسوں مکین کو خواب خرگوش سے جگانے کی کوشش کرتا ہے—— جو جاگ جاتے ہیں' یہ خزانہ ان کا ہوجاتا ہے—— جو سوئے رہ جاتے ہیں، یہ خزانہ ان سے الگ ہوکر اپنی جگہ بدل دیتا ہے——'

'ہاں سنا ہے—— دادا مرحوم بتایا کرتے تھے کہ ایک زمانے میں اسی صحن سے ڈھن ڈھن......ڈھن کی آوازیں آیا کرتی تھیں۔ رات کے وقت سارا گھر بیدار ہوجاتا تھا۔ اس وقت یہ حویلی بھی کیا حویلی تھی۔ دادا جان کا زمانہ بھی کیا زمانہ تھا—— مگر اس وقت کمی کس چیز کی تھی۔ بس ڈھن......ڈُھن کی آواز سن کر خاموش رہ گئے دادا جان......'

'لیکن یہ خزانہ سب کو حاصل نہیں ہوتا وسیع بھائی—— آپ لاکھ کوشش کر لیجئے۔ کوئی فائدہ نہیں—— کہتے ہیں زمین میں دفن اس گمشدہ خزانے کے ساتھ ایک شیش ناگ بھی ہوتا ہے جو اس خزانے پر پہرہ دیتا رہتا ہے......

'اچھا......'

ہاں وسیع بھائی——اور زمین میں ایک دو نہیں بلکہ ہزاروں کی تعداد میں بڑے بڑے دیغ ہوتے ہیں، جن میں بیش قیمت ہیرے اور جواہرات چھپے ہوتے ہیں۔ پرانے زمانے میں تو لوگ

دولت زمین میں ہی دفن کر کے رکھتے تھے — اور ایک دن زمین خزانہ لے کر چرخی کی طرح گھومنے نکل جاتی ہے —'

ابّا نے تسلیم کیا — 'ہاں۔ ایسی بہت سی کہانیاں میں نے بھی سنی ہیں۔ بلکہ ابّا مرحوم تو ایسی نہ جانے کتنی کہانیاں سنایا کرتے تھے — اور یہ بھی کہتے تھے کہ وسیع ایسا خزانہ اس گھر میں بھی ہے — اگر اس گھر کی کھدائی کی جائے تو یہ خزانہ برآمد ہو جائے — مگر خدا معلوم — کھدائی بھی کہاں، کس جگہ کی جائے —؟ کتنے ہی لوگ غلط کھدائی میں ہزاروں کی دولت لٹا چکے اور خزانہ نہیں ملا —'

'آپ کے والد سچ کہتے تھے.....' مولوی محفوظ کی آواز کانپ رہی تھی — بالکل سچ، سبحان اللہ، اللہ تیری شان نرالی — سبحان اللہ — میں کہتا نہ تھا۔ اب اس بلند حویلی کے دن پھرنے والے ہیں.....'

'چلیے مان لیا کہ پھرنے والے ہیں — مگر کیسے؟ کوئی اشارہ تو دیجیے —' اس بار ابّا کی آواز بدلی بدلی تھی۔

مولوی محفوظ نے اسلم میاں کو اشارہ کیا۔

اسلم میاں نے سر کی ٹوپی برابر کی — پھر میری طرف مڑے۔ 'ایک جانماز لے آؤ۔ چارپائی پر بچھا دو —'

صحن میں پہلے سے ہی ایک چارپائی موجود تھی۔

'اور ہاں — اسلم میاں ٹھہر کر بولے — تھوڑی سی چینی — اور پلاؤ یا زردہ میں ڈالے والا ذرا سا رنگ۔

'پلاؤ یا زردہ میں جو رنگ پڑتا ہے.....'

'ہاں.....'

'سمجھ گیا —'

چارپائی پر جانماز بچھا دی گئی۔ مولوی محفوظ جانماز پر دعا کے انداز میں بیٹھ گئے — خشخشی

داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ آہستہ آہستہ کوئی دعا پڑھ رہے تھے۔ ابّا کرسی پر ہمہ تن گوش یہ سارا منظر دیکھ رہے تھے۔ صحن کے اس پار دروازے سے امّی اور مریم بوا بھی اس انہونی پر نظر رکھے ہوئی تھیں......

اسلم میاں نے چینی سفید برادے کے اوپر ڈال دی۔ رنگ کو دائرے کے درمیان میں چھڑک دیا— اب ان کا کام ختم تھا۔ وہ مولوی محفوظ کے اٹھ کر کھڑے ہونے کا انتظار کرنے لگے—

میں نے آہستہ سے ابا کے کان میں پوچھا— یہ کیا ہو رہا ہے—؟'

ابّا نے آنکھیں دکھاتے ہوئے خاموش رہنے کا اشارہ کیا—

میری نظر میں ابھی اس وقت— جو کچھ ہو رہا تھا اس کی اہمیت محض ایک دلچسپ کھیل کی تھی۔ لیکن مجھے اس کھیل میں مزہ مل رہا تھا— جیسے بچپن میں امّاں پریوں اور جنوں کی کہانیاں سنایا کرتی تھیں— ان کہانیوں میں حیرت میں ڈالنے والے واقعات ہوتے تھے—

یہ سارا منظر اُنہی کہانیوں سے ملتا جلتا تھا—

دس۔ پندرہ منٹ بعد......مولوی محفوظ اٹھ کھڑے ہوئے۔ جانماز موڑ کر میرے ہاتھوں میں دیا— دائرے کے قریب آ گئے— پھونک ماری۔ اسلم کو جھکنے کا اشارہ کیا۔

کچھ رنگ بدلا......؟

نہیں—

دوبارہ پھوک ماری گئی— اب......؟

نہیں......

'اب......؟'

'نہیں......'

مولوی محفوظ نے زور سے یا اللہ کہا— پھر پھونک ماری......

'اب......—'

ہاں......اسلم کی آنکھوں میں خوشی تیر گئی۔

'غور سے دیکھو— کہیں کوئی کنفیوژن باقی نہ ہو۔'

'ہاں......'

'ہاں کیسا رنگ ہے......؟'

'سبزی مائل......'

'یعنی سرخ محل گیا......؟'

'ہاں—'

'سبز......؟'

'جی ہاں......'

'گرین سگنل......غوطہ لگانے کے لیے صحیح وقت......'

'جی......'

'چلو آؤ۔ کرسی پر بیٹھو—'

مولوی محفوظ کا چہرہ دمک رہا تھا— جیسے کوئی بڑا معرکہ سر کر کے آئے ہوں—

دونوں کرسی پر بیٹھ گئے—

'اب مٹھائی ہو جائے وسیع بھائی—'

'مٹھائی بس آنے والی ہے— لیکن معاملہ کیا ہے اور یہ ساری کارروائی جو ابھی آپ نے کی......؟'

مولوی محفوظ ہنس رہے تھے—

'سب بتاتا ہوں آپکو— ارے یہ سب بہت پہلے بھی بتا سکتا تھا۔ لیکن نہیں— میں پہلے مکمل اطمینان کرنا چاہتا تھا۔ ہم عامل لوگ ہیں— عمل کے دوران کبھی کبھی ہماری تیسری بند آنکھ

کھل جاتی ہے۔ یہ سارے عامل کے ساتھ نہیں ہوتا— بس کچھ ہی لوگوں کے ساتھ — اور جب یہ تیسری آنکھ کھلتی ہے تو ہمیں وہ نظر آنے لگتا ہے جو عام آدمی نہیں دیکھ پاتا......'

'مطلب......؟'

'مثال کے لیے اس دن آپکے گھر کے دروازے سے گزرتے ہوئے مجھے ٹھہر جانا پڑا— اس گھر کی چوکھٹ سے مجھے ڈھن......ڈھن......ٹھن کی آواز سنائی دے رہی تھی......

'مطلب......؟' ابّا اس بار چونک پڑے تھے۔

'آپکو یاد ہوگا— صحن میں قدم رکھتے ہی میرے قدم وہیں رک گئے تھے—اور میں نے یہاں کرسیاں لگائی تھیں......

ہاں......

'میں اس وقت بھی سارا کچھ، سچ سچ آپکو بتا سکتا تھا۔ مگر میں پہلے اپنا اطمینان کرنا چاہتا تھا— یعنی اگر معلوم ہو کہ خزانہ کہاں ہے— تو صرف خزانے کی جگہ کی معلومات ہی کافی نہیں— یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ وہ خزانہ نکل سکتا ہے یا نہیں— یا اس کے نکالے جانے کا صحیح وقت کون سا ہو سکتا ہے۔ یہ کام اکیلے ممکن نہیں تھا، اس لیے مجھے اسلم میاں کو ساتھ لانا پڑا— اور جب اسلم میاں نے دیکھ لیا کہ وہ سرخ رنگ، سبز ہو گیا، تب ہی مجھے اطمینان ہوا کہ اب آپ کو وہ سچ بتایا جا سکتا ہے......

'لیکن رنگ تو ابھی بھی لال ہے......' یہ آواز میری تھی......

مولوی محفوظ مسکرا رہے تھے— تم ابھی بچے ہو— یہ رنگ یا تو دودھ پیتا بچہ دیکھ سکتا ہے یا پھر کوئی دوسرا عامل— چونکہ اس وقت میں خود عمل میں ہوتا ہوں اس لیے یہ کام میں نے میاں اسلم کے سپرد کیا— اب آپ سمجھ گئے ہوں گے وسیع بھائی......'

'کیا......؟' ابّا نے درمیان میں ہی بات کاٹ دی—

'کہ آپ کے گھر میں خزانہ ہے۔ گمشدہ خزانہ— اور وہ اسی جگہ ہے جہاں میں نے دائرہ

بنایا ہے—اور سب سے اہم بات آپ اس خزانے کو نکال سکتے ہیں—'

ابّا فرط مسرت سے کانپ رہے تھے—

'اور جیسا کہ آپ نے بتایا، آپ کے دادا کے وقت میں بھی خزانے کے ڈھن ڈھن کرنے کی آواز آتی تھی—یقینی طور پر بلاشبہ یہ آواز اب بھی آتی ہوگی—لیکن آپ سن نہیں پائے—اب سننے کی کوشش کیجئے—رات کے ۱۲ بجے سے صبح ہونے سے پہلے کسی وقت بھی یہ آواز آپ سن سکتے ہیں......'

'تو یہ خزانہ نکل سکتا ہے......؟'

'ہاں......'

'لیکن کیسے......؟'

'بہت آسان ہے—یہ سب باتیں میں آپ کو آرام سے سمجھاؤں گا— مگر یہ کام کوئی اتنا آسان کام بھی نہیں—'

'مطلب......؟'

'کچھ لوگوں کو اعتماد میں لانا ہوگا۔ جن کے بارے میں آپ کو یقین ہو کہ یہ لوگ اس کا تذکرہ باہر نہیں کریں گے۔ گھر کے نوکر اور بچوں کو بھی اس کے بارے میں نہیں بتائیں گے......'

مولوی محفوظ میری طرف مڑے— 'خبردار بیٹا—یہ بات باہر کسی سے مت کہنا—اپنے کسی دوست سے بھی نہیں—'

'جی ہاں'

'شاباش—'

مولوی محفوظ نے پھر ابّا کی جانب دیکھا—اور یہ کام میری موجودگی میں ہی ہوگا—کوشش یہ ہوگی کہ کھدائی کی آواز باہر تک نہ جائے۔ آپ تو جانتے ہیں۔ زمانہ خراب ہے—لوگوں تک بات پہنچ گئی—اور خزانہ نکل بھی گیا تو یہ خزانہ سرکار کا ہو جاتا ہے— کیونکہ سرکار ایسے خزانوں

پر قبضہ کر لیتی ہے......

'ہاں— آپ صحیح کہتے ہیں—' ابّا کا لہجہ کانپ رہا تھا۔ 'لیکن......'

'لیکن کیا......؟'

'آپ کو پورا یقین ہے نا...... کہ خزانہ یہاں، اس بلند حویلی میں موجود ہے—؟

'سولہ آنا۔'

یعنی ہم اسے نکال سکتے ہیں......؟

'سولہ آنا......'

'ہم اسے اپنے استعمال میں لا سکتے ہیں—؟'

'سولہ آنا...... سبحان اللہ۔ اللہ تیری شان نرالی— لیکن ایک بات آپ کو یاد رکھنی ہوگی۔'

'وہ کیا—؟'

'جو خزانہ نکلے گا— وہ اکیلے آپ کا نہیں ہوگا۔'

'پھر......؟'

خزانے کا ۵۰ فیصد حصہ ہم رکھیں گے— اور ۵۰ فی صد آپ کا— ایسا دستور ہے۔ ہم یہ ۵۰ فیصد اپنے لیے خرچ نہیں کریں گے— کیونکہ ہر گمشدہ خزانہ قربانی مانگتا ہے۔ یہ ۵۰ فیصد غریب غرباء اور مساکین میں تقسیم ہوگا...... سبحان اللہ......'

سبحان اللہ......' ابّا کی آنکھوں کی بدلیاں چھٹ گئی تھیں— 'کیا بہت بڑا خزانہ ہے......؟'

'بہت بڑا۔ اتنا بڑا کہ آپ کی سات پشتیں کھائیں تب بھی کم نہ ہوں......'

'لیکن اس خزانے کے نکلنے سے ہمارا کوئی نقصان تو نہیں ہوگا—؟'

'ہم کس لیے ہیں......' مولوی محفوظ ہنس رہے تھے— آپ کا نقصان ہوتا تو ہماری ضرورت ہی کیا تھی۔ ہم اسی لیے تو ۵۰ فیصد کمیشن لے رہے ہیں کہ خزانہ بھی نکل جائے اور آپ کے سر آنے والی بلا بھی دور ہو...... سبحان اللہ......'

●●

میرا دل کرر ہا تھا، بھاگ کر یہ خبر نور محمد کو سناؤں — لیکن مولوی محفوظ کا چہرہ آنکھوں کے پردے پر ناچنے لگتا — پھر ابّا نے یہ بھی سمجھایا کہ جو باتیں راز رکھنے کی ہوتی ہیں، وہ کسی کو بتائی نہیں جاتیں۔ اس سے اس کا اثر زائل ہو جاتا ہے۔

لیکن اس کے باوجود میں اسے بتانا چاہتا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا، جیسے میرے پنکھ نکل آئے ہوں۔ میں ہوا میں اڑ رہا ہوں — کیا یہ ممکن ہے —؟ کیا ایسا سچ مچ ہوتا ہے۔ کیا زمین میں سچ مچ کا خزانہ دفن ہے۔ کیا زمین میں دفن خزانہ گھومتا رہتا ہے —؟ جیسے ابھی میرے گھر ہے۔ گھومتا ہوا نور محمد کی کوٹھی پہنچ گیا تو —؟ جی چاہ رہا تھا — بس ابّا جیسے بھی ممکن ہو، اس خزانے کو باہر لے آئیں —

میں اس خزانے کو دیکھنے کے لیے بے تاب تھا —

اور اِدھر اس گمشدہ خزانے کو لے کر گھر میں کچھ نئی کہانیاں اچانک جنم لینے لگی تھیں —

(۵)

آدھی رات کو ابّا نے اماں کو جگا دیا —

اٹھو...... اٹھو...... جلدی اٹھو......

اماں ہڑبڑا کر اٹھ گئیں......

'نوج — کوئی برا خواب دیکھا کیا......؟

'نہیں۔ خزانہ...... میں نے ابھی آواز سنی۔ میں گواہی دے سکتا ہوں کہ یہ میرا وہم نہیں ہے۔ یقیناً بالکل وہی آواز، جس آواز کے بارے میں مولوی محفوظ نے بتایا تھا، میں نے خود اپنے کانوں سے سنی یہ آواز —'

’آئیں — کیا سچ مچ.....‘اماں نے برسوں بعد آج لڑائی نہیں کی تھی —

’آؤ — ادھر آؤ.....ہاں اسی جانب سے آواز آئی تھی۔‘

چھت کافی بڑی تھی..... یہاں سے، مونڈھے پر سے ابّا نے صحن کی طرف اشارہ کیا۔

بالکل صحیح جگہ — دیکھو۔ یہ آواز یہیں سے آئی تھی — جیسے کوئی بڑا سا لوہے کا ٹرنک ہو — اور اس میں زیورات بھرے ہوں۔ ٹرنک کے گھومنے کی وجہ سے آواز پیدا ہو رہی ہو..... ڈھن.....ڈھن.....

’یا اللہ — آپ نے زندگی میں پہلی بار کوئی اچھی بات کی ہے.....‘

ابّا کا لہجہ کانپ رہا تھا — تمہیں کافی دیر سے اٹھانا چاہتا تھا۔ پورے دو گھنٹے سے یہ آواز سن رہا تھا۔ چلو نیچے چلتے ہیں.....‘

امّاں، ابّا کی آواز سن کر میں بھی جاگ گیا تھا۔ ابّا، امی کو لے کر سیڑھیوں سے نیچے اترے۔ سیڑھیوں کے پاس والا کمرہ مریم بوا کا تھا — اور دائیں طرف والا کمرہ خانسامہ علی بخش کا تھا — جو ان دنوں اپنے گاؤں گئے ہوئے تھے۔ اس افراتفری میں مریم بوا کی بھی نیند کھل گئی۔ مریم بوا بھی کمرے سے نکل کر صحن میں آ گئیں۔ مرغیوں کے دربے سے ٹھہر ٹھہر کر کڑکڑوں کوں کی آواز آ رہی تھی — مگر جیسے زیادہ تر مرغیاں اس وقت آرام کر رہی تھیں — پاؤں دابے میں بھی چلا آیا تھا — پیچھے پیچھے مریم بوا بھی۔

’ہائے اللہ اب کیا ہوا — ؟‘ یہ مریم بوا کی آواز تھی۔

’لو، اس وقت تمہیں آنے کو کس نے کہا.....؟‘

’ارے کہے گا کون — آپ لوگوں کی بات چیت سے نیند کھل گئی۔ کوئی چور وور ہے کیا — ؟

’ارے نہیں مریم بوا — حویلی میں مجال ہے کوئی چور آ جائے — ‘ یہ اماں کی آواز تھی — آج اُنہیں مریم بوا کی آواز بھی بوجھل نہیں لگ رہی تھی۔

'مگر بات کیا ہے — یہاں ہو کیا رہا ہے......'

ابّا نے اماں کو آنکھوں سے اشارہ کیا۔

'کچھ نہیں — مجھے لگا مرغیوں کے دربے میں کوئی نیول آ گیا ہے'

نیول کہاں سے آئے گا۔ وہ تو بس موری میں گھومتا رہتا ہے'

'مرغیاں زور زور سے کٹ کٹا رہی تھیں......'

'لو، بی بی کی سنو — آپ تو چادر تان کر سو جاتی ہیں۔ مرغیاں روز ہی رات میں کٹکٹاتی ہیں۔ کم بخت — ان کے کٹکٹانے سے نیند ہی نہیں آتی۔'

اماں نے اچانک مجھے دیکھ لیا تھا۔ میں سیڑھیوں کے پاس کھڑا تھا — جسم میں خون کی گردش تیز تھی۔

'اب تجھے آنے کو کس نے کہا — کل اسکول نہیں جانا ہے کیا —'

'میری بھی نیند کھل گئی۔ اس لیے چلا آیا......'

مریم بوا دوبارہ کمرے میں لوٹ گئی تھیں۔ ابّا، امّاں کی طرف مڑے — وہ ڈھن ڈھن کی آواز اب بھی میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔ سب کچھ کتنا بدلا بدلا سا لگ رہا ہے......'

'ہاں۔'

'جیسے حویلی بدل گئی —'

'ہاں......'

'بالکل پہلے کی طرح شان سے کھڑی ہماری بلند حویلی — وہی پہلے والی شان۔ آزادی نے ہماری پہلی والی شان لوٹا دی —'

'ابھی لوٹائی نہیں ہے۔ ہاں، لوٹائے گی — نماز میں دعا مانگئے — اور دیکھئے — جانے کب کھدائی کا شگن نکلتا ہے...... میں تو بیتاب ہو رہی ہوں، خزانہ کا دیدار کرنے کے لیے......'

'تم سے زیادہ میں بیتاب ہو رہا ہوں۔'

یہ ابّا تھے— 'چلو— اب سو جاتے ہیں— کل اس بارے میں مولوی محفوظ سے باتیں کرتے ہیں۔ دیکھتے ہیں، وہ کھدائی کے لیے کون سا دن مقرر کریں گے— '

●●

دوسرے دن مولوی محفوظ نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ 'کھدائی کے لیے مزدور باہر سے نہیں آئیں گے۔ یہ کھدائی ہمیں ہی کرنی ہوگی۔ ہاں کھدائی کرنیکے سارے سامان گھر میں موجود ہونے چاہئیں— اور کسی کو کانوں کان اس کی خبر نہ ہو۔

'لیکن کیا ہم لوگوں سے......'

مولوی محفوظ نے ابّا کی بات مکمل کی۔ 'میں نے اپنے تین شاگردوں سے بات کی ہے۔ اللہ رکھے یہ تینوں میرے بھروسے مند ہیں۔ ایک سے تو آپ مل ہی چکے ہیں۔ اسلم میاں— باقی دو اور ہو جائیں گے۔ رات کے ۱۲ بجے سے پو پھٹنے سے پہلے تک ہم کھدائی کریں گے— اور صبح میں اس جگہ کو چھپا دیں گے۔ تا کہ یہ جگہ آنے والے مہمانوں کی نظر سے بچی رہے— '

'ہاں یہ ٹھیک رہے گا— ' ابّا کو مولوی محفوظ کا یہ منصوبہ پسند آیا تھا—

امی نے پردے کی روایت طاق پر رکھ دی تھی۔ کیونکہ اب اس نئے معاملے کو لے کر مولوی محفوظ کی حیثیت گھر کے فرد جیسی ہو گئی تھی۔

'پھر تاریخ کیا ہوگی— ؟' اس بار سوال امی نے پوچھا تھا۔

'بو بو، تاریخ کے لیے مت گھبرائیں— آج ہی اچھا شگن دیکھ کر آپ کو بتا دوں گا— سبحان اللہ۔ بلند حویلی پر بہت جلد اللہ کی رحمت برسنے والی ہے۔

●●

اب میں باریکی سے چھوٹی چھوٹی چیزوں کو سمجھ رہا تھا۔ جیسے یہ کہ ہمیشہ خاموش رہنے

والے ابّا میں ایک بار پھر وہی پرانا جوش آ گیا تھا، جس کی تھوڑی بہت کہانیاں میں نے سن رکھی تھیں۔ ورنہ ہمیشہ میں نے ابّا کو خاموش ہی پایا تھا۔ خاص کر تب، جب امّاں حویلی اور حویلی والوں پر مسلسل طنز کے تیر برسا رہی ہوتیں۔ ابّا کے پاس اماں کے ان تیروں کا کوئی جواب نہ ہوتا— مگر مولوی محفوظ کے ذریعہ سنائی گئی خوشخبری سے ابّا کو جیسے وہ تمام تیر واپس مل گئے تھے—

حقیقتیں کتنی جلد بدل جاتی ہیں۔ دو چار دن میں ہی گھر کا ماحول بدل گیا تھا۔ مولوی محفوظ نے شگن کی تاریخ نکال لی تھی۔ اور یہ تاریخ اگلے جمعہ کی تھی— لیکن اس درمیان امی جان نے بھی کئی بار خزانے کے ڈھن ڈھن کی آوازیں سنیں— میرے لیے یہ سب کسی کھیل جیسا تھا۔ اکثر، رات کے کسی پہر اماں، ابّا دونوں جاگ جاتے۔ کھسر پسر شروع ہو جاتی۔ مجھے یقین تھا— اس گفتگو کے پس پردہ ضرور اس خزانے کو بھی دخل تھا، جس نے اس محض نبھائے جانے والے رشتے میں تازگی اور زندگی بھر دی تھی— کچھ کچھ اس کی بھنک مریم بوا کو بھی لگ چکی تھی۔ سلہٹ پر مصالحہ پیستی ہوئی انہوں نے اس بات کا اقرار کیا تھا— چاہے جتنا چھپا لو۔ بوبو— مجھے سب معلوم ہے......

’کیا معلوم ہے؟‘

’ارے وہی کہ مولوی محفوظ یہاں کیوں آئے تھے؟‘

’اچھا معلوم ہے تو بس یہ بات دل کی دل میں رکھو— اور خبردار جو یہ بات یہاں سے نکل کر سارے محلے میں پھیلی۔‘

’لو بھلا سن لو بوبو کی بات— مجھے کیا بھانگ کا نشہ چڑھا ہے جو میں کسی سے بولنے جاؤں گی۔‘

’تمہارا کوئی ٹھیک بھی نہیں مریم بوا۔ لیکن ہاں— کہے دیتی ہوں زبان پر لگام ضروری ہے۔ کہیں بھی یہ زبان پھسلنی نہیں چاہئے......‘

گھر میں آنے والی تبدیلیوں کا میں بھی گواہ رہا تھا۔

ابّا کبھی کبھی زور زور سے اقبال، غالب اور داغ کے کلام گنگنانے لگتے۔ خاص کر داغ کے اشعار انہیں بے حد پسند تھے۔

سازیہ کینہ ساز کیا جانیں
نازوالے نیاز کیا جانیں
جن کو اپنی خبر نہیں معلوم
وہ مرے دل کا راز کیا جانیں
جو گزرتے ہیں داغ پر صدمے
آپ بندہ نواز کیا جانیں

ابّا کو کلاسیکل گانوں کی پریکٹس تھی — ابّا خوش ہوں تو گھر میں شاعری کا ماحول ہے — اور شاعری ابّا اکیلے نہیں کرتے تھے۔ بلکہ ساتھ میں مجھے بھی گانے کی دعوت دی جاتی...... میں بھی ابّا کے سر میں سر ملا کر شروع ہو جاتا......

سازیہ کینہ ساز کیا جانیں
نازوالے نیاز کیا جانیں

'نہیں بیٹا — ایسے نہیں — ' ابا ہنس کر کہتے۔ اب دیکھو میرے ساتھ گاؤ......' ابّا کی آواز صحن، اور آنگن سے ہوتی ہوئی گلیوں میں گونج جاتی......

مولوی محفوظ نے سچ مچ جادو کر دیا تھا۔

اور اس جادو کی پوٹلی سے برآمد ہونے والی نئی تہذیب میرے لیے بالکل نئی تھی —

دراصل میں اس تہذیب کو سمجھ ہی نہیں پا رہا تھا —

●●

ماضی کی ہولناک سرنگوں میں دوڑتی ہوئی ٹرین ٹھہر گئی تھی — لیکن ابھی بہت کچھ باقی ہے

جس کا ذکر مجھے آگے کرنا ہے—— خاص کر نور محمد کی شخصیت سے وابستہ وہ خط، جس نے میری راتوں کی نیند چھین لی تھی۔

مجھے پروفیسر نیلے کے گھر ان پر حملہ کرنے والے بندر یاد آ گئے۔ اُن میں ایک بندر، جو پروفیسر کا چشمہ لے کر بھاگ کھڑا ہوا تھا۔ مجھے پروفیسر نیلے کی بات یاد آ رہی تھی......

’عام طور پر مہذب سماج میں ہی/
جمہوری حملے تیز ہوتے ہیں/
اور یہ حملے بندر کرتے ہیں....../‘

جادو، جادوگری
اور
چوں چوں کا مربّہ

یہاں ہارے ہوئے لوگوں کے لیے کوئی جگہ نہیں ⁄
یہ دنیا ان کے لیے بنی ہی نہیں

●●

ہر ٹوٹنے کے عمل میں ⁄
کچھ نہ کچھ نیا بننے کا کام چل رہا ہے ⁄
ناکامی سے ہی
ہم کامیابی کی پہلی سیڑھی چڑھتے ہیں ⁄
☆☆
کمزور کے ہاتھ میں پستول
کسی کھلونے کی طرح ہے ⁄
اس سے نہ وہ اپنے حق کی لڑائی لڑ سکتا ہے
نہ اس پستول کو کسی ضروری مصرف میں لا سکتا ہے ⁄
☆☆
آخری جنگ
اُس تہذیب سے ہوگی
جو دھماکہ کرنے والی ہے۔

(۱)

یہاں اس علاقہ میں اچانک ٹھنڈ بڑھ جاتی ہے— کبھی اچانک گرمی چھا جاتی ہے— مجھے سارہ نے جگایا تھا۔ گھڑی دیکھی تو ۸ بج رہے تھے۔ پہاڑیوں سے چھن چھن کر دھوپ میرے کمرے میں داخل ہو چکی تھی۔

'دڈّو— ٹھنڈ پھر بڑھ گئی ہے—'

میں نے مسکرانے کی کوشش کی۔

'آپ کی چائے آ گئی ہے۔ ابو بابا بیمار تھے۔ اس لیے چائے میں ہی لے کر آ گئی—' وہ میری آنکھوں میں جھانک رہی تھی— 'ایک بات بولوں دڈّو۔ جب سے وہ خط آیا ہے، آپ ضرورت سے زیادہ پریشان نظر آتے ہیں۔ آخر اس خط میں ایسا کیا ہے...... آپ کچھ چھپانے کی کوشش کر رہے ہیں دڈّو—؟'

سارہ کو اپنے پاس کھینچتا ہوں— 'تم ناحق پریشان ہوتی ہو بیٹا— اُس خط میں ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔'

'آپ کے دوست کا خط ہے......؟'

'ہاں......'

'مجھے پتہ تھا—' سارہ مسکرائی۔ 'ایسے خط بھولی بسری یادوں کو تازہ کر دیتے ہیں۔ ہے نا دڈّو......'

●●

کھڑکی کھول کر پہاڑیوں کو دیکھتا ہوں۔ چکر کاٹتی پہاڑیاں— پہاڑیوں پر بنے ہوئے مکانات میں چہل پہل نظر آ رہی تھی۔ میں دس بجے تک فریش ہو کر صحن میں آیا تو پروفیسر نیلے کی کار اسی وقت مین گیٹ سے اندر داخل ہو رہی تھی—

اُن کے ساتھ مسز نیلے بھی تھیں۔

گاڑی سے اترتے ہوئے مسٹر نیلے نے کہا— 'دیکھیے۔ ہم خود ہی آپکی پوتی سے ملنے چلے آئے— آپ اسے لے کر نہیں آئے......'

'ارے نہیں— میں آج ہی اسے لے کر آپ کے پاس پہنچنے والا تھا۔ اس لیے کہ کل صبح سارہ چلی جائے گی۔'

پروفیسر نیلے کرسی پر بیٹھ گئے—

'آپ کی کہانی دلچسپ تھی— رہا نہیں گیا— اس لیے خود ہی آپ سے ملنے پہنچ گیا—'

مسز نیلے سارہ سے ملنے اندر چلی گئی تھیں— کچھ ہی دیر بعد، بیماری کے باوجود ابو بابا پہاڑیوں کی خاص موتیا چائے بنا کر لے آئے۔ پروفیسر کی اچانک آمد نے مجھے خوش کر دیا تھا— کتنی باتیں تھیں، جو میں ان سے شیئر کرنا چاہتا تھا۔ پھر میں نے اُنہیں جادو کے بارے میں بتایا۔ اس خزانے کے بارے میں بھی، جس کے نکلنے کی پیشن گوئی مولوی محفوظ نے کی تھی۔ پروفیسر ہمہ تن گوش ہوکر میری باتیں سنتے رہے۔

'یہ زندگی اپنے آپ میں جادو ہے کاردار صاحب— صبح نیند کا کھلنا— اور شب میں سو جانا— سارے دن کا سفر میرے لیے کسی جادو سے کم نہیں— لیکن کیا کیجئے— آسانی سے ملی ہوئی آزادی کبھی جادو نہیں لگتی— اور آہستہ آہستہ وہ ہمارے لیے اپنی قیمت کھوتی جاتی ہے—

وہ ہنس رہے تھے...... میں پوچھوں گا نہیں کہ خزانہ ملا یا نہیں۔ لیکن یہاں کا سارا خزانہ تو انگریز لے گئے۔'

چائے خالی کر کے پروفیسر نے کین کی میز پر رکھ دی۔ کھڑے ہوگئے— آنکھیں گھما کر آس پاس کی پہاڑیوں کو دیکھنے لگے......

'اب انہی پہاڑوں کو دیکھیے— ایڈونچر کے شوقین، فرنگیوں نے پہاڑوں کی عصمت بھی تار تار کردی—' وہ ماضی میں کھو گئے تھے— جیسے کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہے ہوں— 'سوچتا

ہوں وہ پہلا انگریز کون تھا، جو ہندستان آیا۔ یقیناً وہ اپنے مذہب کی تبلیغ میں آیا ہوگا۔ تاریخ کی کتابوں میں اس پہلے انگریز کو تھامس اسٹیفن کے نام سے جانا جاتا ہے — اُس کے آنے کے بعد یہاں سے آمد و رفت کے دروازے کھل گئے — ریڈ ہیگن، ریکٹر اور کانسنٹ — یہ تین خستہ حال جہاز تھے، جن میں سوار ہوکر دو سو کی تعداد میں نوجوان فرنگیوں نے ہمارے ملک کو خوش آمدید کہا — کم بخت لٹیرے —' پروفیسر نیلے دوبارہ کرسی پر بیٹھ گئے — 'وہ ہمارے ملک کی سونے کی چڑیا کو لوٹنے آئے تھے — اور آج یہ چڑیا کہیں نظر نہیں آتی۔ پہاڑ کے حسن کو برباد کرنے میں کم بختوں نے اپنا سارا زور لگا دیا — دراصل یہ علاقے ان کے لیے کام سے زیادہ عیش گاہیں تھیں۔ اراولی کی پہاڑیوں سے نیل گری اور گڑھوال تک...... وہ دردر نئے نئے آشیانوں کی تلاش میں بھٹکتے تھے — اور ہر بار نئے پہاڑ ان کے آشیانے بن جاتے تھے۔ گرمی سے راحت کے لیے وہ برفیلے پہاڑوں کو اپنا مسکن بناتے تھے۔ یہیں چھولداریاں لگتی تھیں...... یہیں گھوڑے باندھے جاتے — شملہ، مسوری، دارجلنگ، پچ مڑھی، نینی تال، الموڑا، رانی کھیت، کوسانی، مہابلیشور، یہ سب ان کے ٹھکانے تھے۔ یہیں ان کے شاندار بنگلے بنے۔ کلب کھلے — اور ان سہولتوں کے لیے فرنگیوں نے یہاں کے جاگیرداروں کو لالچ اور سبز باغ دکھائے —'

پروفیسر نیلے ہنس رہے تھے — 'وہی گمشدہ خزانہ، جہاں آپ کی حویلی ایک مستقبل تلاش کررہی تھی اور یہاں ان پہاڑیوں کے لوگ انگریزوں کی صحبت میں کہیں نہ کہیں ایک روشن مستقبل کی آس لگائے بیٹھے تھے —'

وہ زور زور سے ہنسے — کیا ہوا — خزانہ ملا؟

اب مسکرانے کی باری میری تھی — اس کے لیے تو آپ کو تھوڑا سا انتظار کرنا پڑے گا پروفیسر...... ابھی اُن کڑیوں کو جوڑنے میں لگا ہوں، جو ادھر اُدھر بکھری ہوئی ہیں — اور معلوم نہیں کہ اُنہیں جوڑ بھی پاؤں گا یا نہیں —'

مسز نیلے، سارہ کو لے کر باہر آگئی تھیں۔ 'ہم لوگ ذرا بازار جا رہے ہیں۔ دو ایک گھنٹے میں

واپس آجائیں گے۔'

میں نے دیکھا، سارہ کو کمپنی مل گئی تھی — وہ مسز نیلے کے ساتھ کافی خوش نظر آرہی تھی......

ان کے جاتے ہی پروفیسر نیلے میری طرف مڑے —

'اچھا آپ جادو پر یقین رکھتے ہیں —؟'

'مسلمان ہونے کے ناطے ان پر یقین کرنا ہی پڑتا ہے — کیونکہ ان کا ذکر قرآن مجید میں کئی جگہ آیا ہے —'

'ٹرو —' پروفیسر نیلے مسکرائے۔ جیسے حضرت موسیٰ اور سامری جادوگر کا ذکر — خود اللہ کے نبی پر جادو کیا گیا تھا۔ یہودیوں نے کتنی ہی بار اللہ کے نبی پر جادو کرنے کی کوشش کی۔ پھر آپ کے یہاں حضرت سلیمان بھی تھے — جنات، ہوا، چرند اور پرند پر حکومت کرتے تھے — میں نے ایک جگہ پڑھا تھا کہ جنوں میں بھی شیطان ہوتے ہیں...... وہ نظر نہیں آتے۔ وہ انسانوں کو سرگوشیوں کی شکل میں الگ الگ خیال سے نوازتے ہیں۔ اور انسان ان کے بہکاوے میں آکر الٹی سیدھی حرکتیں کرنے لگتا ہے — کتنی مختلف دنیا ہے کاردار۔ ایک ہی دنیا میں انسان اور شیاطین دونوں کی دنیائیں......'

میں غور سے پروفیسر کی باتیں سن رہا تھا۔

'آپ نے صحیح کہا پروفیسر — اور کتنی عجیب بات، یہ دونوں دنیائیں انسان کے ساتھ ساتھ چلتی رہتی ہیں — اور انسان کو اس کا پتہ بھی نہیں چلتا —'

'اور اسی لیے مجھے بعض اوقات لگتا ہے انسان پر اصل حکومت قدرت کی ہے۔ ان سب اچھائیوں اور برائیوں کے پس پردہ قدرت ہے جو ایک کھلے چیلنج کے لیے آپ کو آزاد چھوڑ دیتی ہے۔ اور جب انسان کچھ زیادہ آزادی کی توقع رکھنے لگتا ہے تو قدرت ریموٹ کا بٹن دبا کر دھاکہ کر دیتی ہے — مروسالو......'

میں نے پہلی بار پروفیسر کے منہ سے یہ گالی سنی تھی۔ شاید وہ بھی انسانی تہذیب کے تجزیہ

میں جذباتی ہوتے ہوئے قدرت کے آگے کمزور ہو گئے تھے۔

دو کی جگہ تین گھنٹے بعد مسز نیلے اور سارہ واپس آئے۔ ان دونوں نے اچھی خاصی شاپنگ کر لی تھی۔ پروفیسر نیلے نے اجازت چاہی — مسز نیلے نے سارہ کو قیمتی سوٹ کا تحفہ دیا تھا۔ جاتے ہوئے مسز نیلے کی آنکھیں بھی نم تھیں۔ کچھ یہی حال سارہ کا بھی تھا۔

لیکن ان دونوں سے برا حال میرا تھا، کہ سارہ چلی جائے گی تو میں یہاں ایک دم سے تنہا ہو جاؤں گا۔

لیکن اس تنہائی کا ذمہ دار بھی میں تھا۔

●●

دوسرے دن سارہ چلی گئی — ابو بابا اسے بس میں بیٹھا کر واپس آ گئے — میں ایک بار پھر ماضی کے دریچوں سے آتی ہوئی ہوا کے تھپیڑوں کو آواز دے رہا تھا — اور وہی یادوں کی خوفناک ٹرین، تیز آواز کے ساتھ ماضی کی پٹری پر رینگ رہی تھی۔ کچھ دھماکے سنائی دے رہے تھے......

شاید اس مخصوص جگہ کی کھدائی شروع ہو چکی تھی، جس کے بارے میں مولوی محفوظ نے کہا تھا کہ وہاں خزانہ دفن ہے......

(۲)

اس درمیان صرف ایک بات ہوئی کہ خانسامہ علی بخش جو اپنے گھر گئے ہوئے تھے، وطن سے واپس آ گئے اور انھوں نے گھر کے دوسرے انتظامات سنبھال لیے — ساری مشکل علی بخش سے ہی تھی۔ ابّا کو سب سے زیادہ خطرہ لے دے کر علی بخش سے تھا۔ اس لیے کہ علی بخش سے کوئی بات نہیں پچتی تھی — یوں وہ ہر بات پر اللہ کی جھوٹی قسم تو کھا لیتے تھے مگر باتونی اتنے کہ ہزار خود کو روکنے کے باوجود زبان پھسل ہی جاتی تھی — ابّا کو وہ پرانے زمانے کے دستور کے مطابق احترام سے بابو کہا

کرتے تھے—

'بابو کی بات— اللہ قسم یہ بات یہاں سے کہیں نہیں جائے گی— بس پیٹ میں دفن سمجھئے—'

آپ اُنہیں لاکھ سمجھا کر ہار جائیں کہ میاں، آپ گھر کے پرانے وفادار ہیں— زمانہ نازک ہے۔ باہر والوں سے گھر کی کوئی بات نہیں بتائی جاتی، مگر علی بخش ہر بار قسم کھاتے اور ہر بار بھولے سے اس بات کو عام کر کے آجاتے—

اماں کو فکر تھی— 'علی بخش آگئے اب کیا ہوگا—'

ابّا کا کہنا تھا— 'علی بخش کو بتائیں گے ہی نہیں۔'

'بتائیں گے کیسے نہیں— وہ بھی تو چھت پر ہی سوتے ہیں۔ اُنہیں کیا کھدائی کی آواز سنائی نہیں پڑے گی۔

اماں کی بے چینی کا راز یہ تھا کہ مولوی محفوظ نے کھدائی کا وقت مقرر کر دیا تھا— اور اب اس تاریخ کو ہی کھدائی شروع ہونے والی تھی— دوسری بات، گمشدہ خزانے کو لے کر اماں نے اپنی بہت ساری یا ہزاروں خواہشوں کو پوری کرنے کو سوچ لیا تھا— اماں تو ہنس کر کہتی تھیں— بس اب یہ خزانہ نکل جائے اور حویلی کے دن بدلیں— نوج— کب تک یہ پانی سے باقر خوانی بناتی رہوں گی—'

اماں کی طرح اُن کے محاورے بھی عجیب تھے۔ مجھے سوچ کر ہنسی آتی ہے— یہی اماں پہلے مولوی محفوظ کے خلاف تھیں اور اب یہی اماں بدل چکی تھیں— اماں پر جیسے جادو کر دیا گیا تھا۔

ایک جادو مجھ پر بھی ہوا تھا—

یہ جادو میری ننھی سی بڑھتی عمر کا تھا...... میرے اندر تیزی سے جسمانی تبدیلیاں آرہی تھیں— میرے اندر کے سنّاٹے میں اب نقرئی گھنٹیوں کی آوازیں سنائی دینے لگی تھیں— پہلے مجھے کسی بھی لڑکی سے بات چیت کرنا پسند نہیں تھا— لیکن اب یہی نازک سی لڑکیاں مجھے اچھی لگنے

لگی تھیں۔ میں عام طور پر اُن سے باتیں نہ کرنے کا دکھاوہ کرتا......مگر حقیقت یہ تھی کہ میں اندر ہی اندر ان لڑکیوں سے جی بھر کر بات چیت کرنا چاہتا تھا......اور ان لڑکیوں کی قربت کا احساس اب مجھ میں ایک نامعلوم سا نشہ پیدا کرنے لگا تھا۔

●●

یہ ہفتہ ہنگاموں سے بھرا ہفتہ رہا— جیسے اچانک ایک دوپہر ڈاکیہ ایک لفافہ میرے ہاتھ میں دے گیا— لفافہ کو جیسے جان بوجھ کر ذرا سا پھاڑ دیا گیا تھا— میں امی کے پاس لفافہ لے کر گیا—

اماں دیکھو تو...... یہ خط آیا ہے مگر کسی نے بدمعاشی کی ہے۔ لگتا ہے جیسے کسی بچے نے لفافہ کو ذرا سا پھاڑ دیا ہو......'

'لفافہ پھٹا ہوا ہے......؟'

ہاں—

'دیکھوں تو......'

اماں نے کانپتے ہاتھ سے لفافہ لیا— اور زور زور سے رونے لگیں......رونے کی آواز سن کر ابّا دوڑ کر آ گئے۔

اماں نے لفافہ آگے بڑھایا۔ 'پاکستان سے آیا ہے۔ پھٹا ہوا بھی ہے...... میری ہمت نہیں ہے......آپ دیکھئے—'

ابّا کا چہرہ اچانک بدل گیا۔ کانپتے ہاتھوں سے لفافہ لیا— اس وقت تک مجھے یہ علم نہیں تھا کہ لفافہ کے پھٹے ہونے کا مطلب کیا ہوتا ہے— اس وقت دنیا اس قدر تیزی سے نہیں پھیلی تھی— ہمارے چھوٹے سے بڑھتے سماج نے اپنی سہولت کے حساب سے زندگی کی رفتار طے کر رکھی تھی— مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ لفافہ کے پھٹے ہونے کا مطلب کیا ہے— لفافہ کے پھٹے ہونے کا مطلب

کسی منحوس خبر کے لیے پہلے سے خود کو تیار کرنا ہوتا ہے۔

ابّا نے خط چاک کیا— زور سے بولے......' انا للہ وانا الیہ راجعون۔ خود کو سنبھالو بیگم— بھائی کی اہلیہ انتقال کر گئیں—'

اماں نے دہاڑیں مار کر رونا شروع کر دیا۔ اماں کے ایک ہی بھائی تھے' جو تقسیم کے وقت پاکستان چلے گئے تھے۔ لیکن پاکستان اُنہیں بھی راس نہیں آ سکا— اس دن خط آنے کے بعد سے اماں مسلسل روتی رہیں— لیکن صبر کے علاوہ وہ کر بھی کیا سکتی تھیں— وہ اس موت کی ذمہ دار بھی تقسیم کو قرار دیتی تھیں۔

'نوج، نہ تقسیم ہوتی نہ اپنے بچھڑتے— پاگلوں نے ملک کا بٹوارہ کر دیا۔ آدھے ادھر تو آدھے اُدھر— یہ تقسیم ہے یا رشتے کی دیوار کھڑی کرنا— لے دے کر ایک ہی بھائی تھا میرا— وہ بھی تقسیم کے بعد پاکستان چلا گیا— اب کیا ہوگا— ایک چھوٹی سی بچی ہے— نادرہ— نادرہ کا کیا ہوگا— کیسے سنبھالیں گے بچی کو......

امی کو سب سے زیادہ فکر نادرہ کی تھی......ابّا، امی کے بھائی کو حکیم صاحب کہتے تھے۔

ابّا بتاتے تھے کہ حکمت میں حکیم صاحب کا کوئی جواب نہیں— ارے بغیر نبض دیکھے وہ مرض کی تشخیص کر لیتے ہیں— ابا حکیم صاحب سے بے حد متاثر تھے۔ اس لیے حکیم صاحب کی اہلیہ کے جانے کا ابا کو بھی بہت افسوس تھا۔ اب گھر میں ہر وقت نادرہ کی باتیں ہوتی تھیں— یہ نام تنہائی میں کچھ زیادہ ہی میرے وجود میں سانس لینے لگا تھا— تب مجھے معلوم نہیں تھا کہ ایک دن، آنے والے وقت میں یہ نام میری زندگی سے کچھ ایسے وابستہ ہو جائے گا کہ شاید ہزار کوشش کے باوجود میں اس نام کو خود سے الگ نہیں کر سکوں گا—

نادرہ......

نادرہ— حکیم صاحب کی بیٹی یعنی میری ممیری بہن......گھر میں نادرہ کی کوئی تصویر بھی نہیں تھی کہ میں دیکھ سکوں۔ مگر اس نام سے آہستہ آہستہ میں کچھ زیادہ ہی قربت محسوس کرنے لگا تھا۔

●●

علی بخش نے گھر کی ذمہ داریاں سنبھال لی تھیں۔ لیکن اُنہیں اس بات کا شدت سے احساس ہو گیا تھا کہ اُن سے کچھ چھپانے کی کوشش کی جا رہی ہے — وہ باتوں کو تاڑنے میں بھی استاد تھے۔ اُن کے پاس محلے بھر کی خبریں تھیں — جیسے نور محمد کی والدہ کے بارے میں انہوں نے آتے ہی پیشن گوئی کر دی۔

’نظر محمد گئے کام سے — شاہ جنات ان کی اہلیہ کو لے کر غائب ہو جائے گا —‘

وہ بھروسے اور مضبوطی کے ساتھ اپنی بات پوری کرتے تھے — ’بابو ارے میں گیا تھا نظر محمد کے یہاں۔ اس وقت شاہ جنات آئے ہوئے تھے......

’تم نے دیکھا......؟‘

’نہیں — دیکھا نہیں۔ مگر سنا — کمرہ بند تھا۔ کمرے سے باہر سارے لوگ ایسے کھڑے تھے جیسے مردے کو دیکھ لیا ہو — بابو کی بات ...... اندر سے مردانہ سرگوشیوں کی آواز آ رہی تھی —‘

’تم پاگل ہو علی بخش، ابّا ہنس کر کہتے......‘

’بابو کی بات ...... لیکن کانوں سنی کہہ رہا ہوں۔ شاہ جنات کو پسند نہیں کہ اب کوئی بھی دوسری کارروائی کی جائے —‘

ابّا کو اسی لمحے ایک نادر خیال آ گیا تھا۔ وہ علی بخش سے بولے — ’دیکھو علی بخش — ہر انسان کی زندگی قیمتی ہے۔ اس لحاظ سے نظر محمد کی اہلیہ کو بھی وہیں رہنا چاہیے نہ کہ شاہ جنات کے پاس؟

’سو فیصد درست — بابو کی بات —‘

’اور نظر محمد کی اہلیہ اچھی ہو جائیں — اس کے لیے ایک کارروائی یہاں سے بھی ہوگی — مگر دیکھو خبردار، اگر یہ خبر یہاں سے باہر گئی تو اس کا الٹا اثر تم پر ہو جائے گا......‘

’ہائیں...... بابو کی بات......‘

ابّا ہنسے—— ’یعنی پھر شاہ جنات تمہیں چھوڑیں گے نہیں—— ایسا اس لیے کہہ رہا ہوں کہ جمعہ کی رات مولوی محفوظ آئیں گے—— مگر خدا کے لیے اپنی زبان بند رکھنا......‘

’بابو کی بات......‘

علی بخش ڈر گئے تھے—— کسی گہری سوچ میں ڈوبے تھے—— مگر ابا نے سکون کی سانس لی تھی کہ وہ علی بخش کو قابو کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے......

علی بخش کو اس انجانے راز کا سراغ مل گیا تھا مگر وہ اس دن، سارا دن پریشان رہے۔ گھوم پھر کر میرے پاس آجاتے اور سوالوں کی بارش کرنے لگتے۔

’رحمٰن بابو...... کیا سچ مانو میں جنات مجھ پر سوار ہو جائے گا——؟‘

’ہاں......‘

’یعنی جو یہ بات باہر لے جائے گا، اسی پر سوار ہو گا نا......؟‘

’بالکل......‘

’یعنی اگر میں یہ بات باہر نہیں لے گیا تو پھر......؟‘

’نہیں سوار ہو گا——‘

اب علی بخش مطمئن تھے—— پھر کیا مجھے کتّے نے کاٹا ہے جو یہ خبر سارے زمانے میں پھیلاتا چلوں—— بابو کی بات......‘ وہ ہنس رہے تھے۔ بس کان سے سنی اور پیٹ میں دفن—— لیکن آئے گا مزہ۔ دیکھتے ہیں مح فوزوا...... کیا کرتا ہے—— وہ پیار سے مولوی محفوظ کو محفوزوا کہتے تھے......

●●

اماں ابھی تک پاکستان کی خوفناک تقسیم اور بھائی کی اہلیہ والی خبر سے خود کو باہر نکالنے میں کامیاب نہیں ہوئی تھیں۔ لیکن جیسے جیسے جمعہ کا دن قریب آرہا تھا، اماں کا آدھا دھیان گمشدہ خزانے

نے بھی کھینچ لیا تھا— اُنہیں بس ایک ہی فکر تھی......

'سارے گھر تو آس پاس ملے ہوئے ہیں— کھدائی ہوگی کیسے—؟ لیکن انہیں یقین تھا۔ مولوی محفوظ نے کچھ تو سوچا ہوگا......

جیسے جیسے وقت قریب آ رہا تھا، میرے اندر کا تجسس بھی بڑھتا جا رہا تھا—

جمعہ سے ایک دن پہلے مولوی محفوظ پھر تشریف لائے۔ اب تو جیسے وہ گھر کے ممبر کی حیثیت رکھتے تھے— ایک ایسے ممبر کی حیثیت جن کے سامنے اب گھر کی عورتوں کے لیے پردہ کوئی معنی نہیں رکھتا تھا— آج پھر وہ اسلم میاں کو لے کر آئے تھے۔ اسلم میاں مخصوص جگہ کو دیر تک انچ اور ٹیپ کی مدد سے ناپتے رہے۔ انگلیوں پر حساب کتاب چلتا رہا— وہ دیر تک ابا حضور کو بتاتے رہے، کہ خدا معلوم زمین کے اندر کتنے خزانے دفن ہیں۔ صرف قارون نہیں— طوطن خامن اور شدّاد کی دولت بھی تو اسی زمین میں دفن ہے— جتنا خزانہ اوپر نہیں ہے، اس سے کہیں زیادہ بیش قیمت خزانے زمین میں آرام کر رہے ہیں— اور یہ...... کہ بلند حویلی کے بیحد اچھے دنوں کی شروعات ہوگئی ہے—

●●

لیکن شاید شروعات بہت اچھی نہیں ہوئی تھی۔

جمعہ کے روز دس بجے کے آس پاس محلّہ شیخاں میں خون کی ایک واردات ہوگئی تھی۔ ایک دوسرے مذہب کے لڑکے نے محلّہ شیخاں کے ایک نوجوان مسلم لڑکے کو چاقو مار دیا تھا۔ ہاسپٹل لے جانے سے قبل ہی لڑکے کی موت ہوگئی تھی— معاملہ دو مذہب کے درمیان کا تھا— اس لیے صورتحال اس سے پہلے کہ بہت بگڑ جاتی، پولس نے، اور دونوں فرقہ کے لوگوں نے آپسی سمجھداری کا ثبوت دیتے ہوئے معاملے کو سلجھا دیا—

ابّا پریشان تھے—

’آزادی تو دنگوں کی سوغات لے کر آئی ہے۔ تقسیم نے دلوں میں زہر بو دیا۔ یہی بلند شہر تھا اور یہاں کے لوگ—ان کی محبت کی مثالیں دی جاتی تھیں۔ اور اب، بات بات میں چھرے چاقو نکل جاتے ہیں۔‘

ابّا کے رشتہ دار سلام بھائی اور بچو چا ایسے معاملے سن کر چپ رہنے والوں میں سے نہیں تھے—اور ان دونوں کی زہریلی باتوں کا لب ولباب یہ ہوتا کہ مسلمانوں کو کچھ نہ کچھ کرنا ہوگا......

ابّا غصہ ہوتے تھے—اب کیا کروگے۔ ایک پاکستان تو لے لیا—؟‘

’تو ایک اور لے لیں گے.....‘ یہ بچو چا تھے......

’اپنے ناپاک ذہن سے باز نہیں آؤ گے بچو......‘

’تو پھر کٹ کٹ کے مرتے رہیں......؟‘

’سمجھداری دنیا کی ہر سیاست پر بھاری ہے—‘

’یہ اچھی سمجھداری ہے کہ وہ مارتے رہیں اور ہم مرتے رہیں۔ بھئی واہ وسیع الرحمٰن کا ردار—‘

’تمہیں میری بات اچھی لگے یا بری، لیکن سمجھداری یہی ہے—اور کوئی بھی سمجھدار آدمی دنگا یا فساد نہیں چاہتا.....‘

●●

چھت سے سارا شہر دکھائی دیتا ہے۔ میں چھت پر آجاتا تو جیسے سارا بلند شہر میری آنکھوں کے سامنے ہوتا۔ دور کہیں آسمان میں دھواں سا نظر آتا تو میں ایک دم سے چونک جاتا—چولہا جلنے سے دھواں اٹھا ہے یا......؟

ذہن میں کتنے ہی سوال رینگ جاتے...... دنگے کیوں ہوتے ہیں؟ دو بھائی آپس میں ساتھ ساتھ رہ کیوں نہیں سکتے؟ پاکستان کیوں بنا؟ امّی ہر بار پاکستان کے نام پر آنسو کیوں بہانے

لگتی ہیں۔ کیا تقسیم ضروری تھی — واحد سولیوشن؟ کیا کوئی اور راستہ نہیں تھا —
معصوم ذہن کے پاس ان سوالوں کا کوئی جواب نہ تھا۔

●●

پھر وہ قیامت کی شب آ گئی، سارے گھر کو جس کا انتظار تھا — رات کے دس بجے مولوی محفوظ، اسلم میاں اور اپنے دو اور شاگردوں کے ساتھ تشریف لائے — ایک کامران تھے — عمر تیس کے آس پاس۔ بڑھی ہوئی داڑھی۔ سانولا رنگ۔ دوسرے غنی میاں — پچیس سال کے نوجوان — قد پانچ فٹ — لیکن جسم میں بجلی بھری تھی —

یہ سب لوگ مردان خانے میں بیٹھے — لیکن آج مولوی محفوظ کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں — آنکھیں خوفزدہ تھیں......

'دیکھئے — اچھے کام کا شگن بھی کیا نکلا —'

'شگن تو آپ ہی نے نکالا......'

'اب مجھے کیا معلوم تھا کہ آج ہی کے دن محلّہ شیخاں میں ہندو مسلم دنگا ہو جائے گا......'

'ارے دنگا کہاں ہوا — ہاں کچھ لوگ دنگا چاہتے تھے۔ مگر اپنے ارادوں میں ناکام رہے —'

'ایک مسلمان شہید ہو گیا —'

ابّا نے گفتگو درمیان میں روک لی۔ مسلمان نہیں — ایک نوجوان لڑکا — مارنے والا اس کا دوست تھا — اور جہاں تک مجھے اطلاع ملی ہے — اس لڑائی کے پیچھے ایک لڑکی تھی —

'ہندو لڑکی —'

'ہاں —'

'تو اس میں برائی کیا تھی......' مولوی محفوظ کے چہرے پر ناراضگی جھلک رہی تھی۔ سننے

میں آیا ہے کہ وہ بھی عشق کرتی تھی اور آرام سے مذہب تبدیل کرنے میں یقین رکھتی تھی— لیکن اس لڑکے سے یہ دیکھا نہیں گیا......اور اس نے ایک مسلمان کو شہید کر دیا......'

'یہ کیسی بات کر رہے ہیں آپ......یہی باتیں......یہی باتیں تو فساد کی وجہ بن جاتی ہیں۔ عشق میں یہ مذہب کہاں سے آ گیا۔ دونوں ایک لڑکی سے پیار کرتے تھے— دونوں میں جھگڑا ہوا اور ایک کی جان چلی گئی—'

'ارے واہ وسیع بھائی— مسلمان کی جان گئی ہے— کلمہ پڑھنے والے مسلمان کی جان گئی ہے۔ ارے میں تو کہتا ہوں، محلّہ شیخاں میں رہنے والوں نے اپنے ہاتھوں میں چوڑیاں پہن رکھی ہیں۔ ورنہ اس شہادت کا جواب بدلے کی کارروائی سے دیا جاتا......

●●

میں دروازے کے پاس کھڑا یہ گفتگو سن رہا تھا۔ ایک نئی اخلاقیات آہستہ آہستہ میرے وجود میں اتر رہی تھی۔ ہندو، مسلمان......گمشدہ خزانے کی تلاش کا موضوع کہیں کھو گیا تھا......

'آج فضا ٹھیک نہیں ہے۔ سڑکوں پر پولس بھی گشت کر رہی ہے— ہونے والی ہر کارروائی کو صبح کی واردات سے جوڑ کر دیکھا جائے گا......'

مولوی محفوظ اٹھ کھڑے ہوئے—

ٹھیک اسی وقت پولس کی ایک گاڑی خطرے کا سائرن بجاتی ہوئی گزر گئی—

'آپ شاید ٹھیک کہتے ہیں—'

'میں کامران اور غنی کو یہ جگہ دکھانے لایا تھا۔ مگر ہم دیر نہیں کریں گے۔ اب اللہ کا نام لے کر یہ کام کل شروع کریں گے—'

'جس میں ہماری بہتری ہو......' ابّا کمزور آواز میں بولے......

'اب ہمیں اجازت دیجئے—'

مولوی محفوظ اور ان کے تینوں شاگرد اٹھ کھڑے ہوئے — جانے سے پہلے دروازے تک آتے ہوئے مولوی محفوظ پھر رک گئے۔

'وسیع بھائی — اپنے ایمان کو پختہ کیجئے۔ آج دل رو رہا ہے — ایک مسلمان کی شہادت ہضم نہیں ہو رہی ہے —'

اس کے بعد مولوی محفوظ ٹھہرے نہیں۔ اپنے تینوں شاگردوں کے ساتھ تیز قدموں سے باہر نکل گئے۔

ابّا نے دروازہ بند کیا — یہ لوہے کا بڑا سا دروازہ تھا۔ دروازے کی کنڈی لگانے کے بعد۔ دونوں طرف کے دروازے میں لکڑی کے بڑے سے کنڈے کو پھنسایا جاتا تھا — زمانہ برا تھا — ابّا نے لکڑی کا بڑا سا کنڈہ دروازہ کے دونوں طرف کے سوراخ میں ٹھیک سے پھنسا کر دروازہ بند کیا —

آسمان پر چاند روشن تھا —

لیکن ہمارے دل بوجھل تھے — گھر میں اُداسی پسری تھی — علی بخش بھی منہ پھلائے ہوئے تھے۔ مریم بوا بھی چپ تھیں۔ جیسے سب کے سب کسی نہ کسی دلچسپ تماشہ کی امید لگائے بیٹھے تھے — اور تماشہ کے نہ ہونے کا غم سب کو کھائے جا رہا ہو۔ ابّا کمرے میں آگئے۔ لیکن ان کا غصہ اندر سے ابال لے رہا تھا۔

''انہی لوگوں نے مسلمانوں کو بدنام کیا ہوا ہے۔ ذرا سی بات کا بتنگڑ بنا دیتے ہیں۔ ان کے دل میں کتنے چھید ہیں۔ کتنی نفرت بھری ہے —'

'نفرت سب کے دلوں میں بھری ہے —'

'بھرا کرے — لیکن پڑھائی، تعلیم کا کیا فائدہ ہے۔ پڑھنے لکھنے کے بعد بھی ایسی نفرت بھری آنکھیں —'

'اس نفرت کا کوئی انت بھی ہے۔ تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی — وہ محبت دکھائیں تو ہم

بھی محبت دکھائیں۔‘

’تم تو وہی مولوی محفوظ کی زبان بول رہی ہو۔‘

’آپ کا کیا— آپ تو وہی نہرو اور گاندھی کی زبان بول رہے ہیں۔ ان کے دلوں کے بھید تو اللہ جانتا ہے۔ مگر اندر سے یہ دونوں بھی مسلمانوں سے نفرت کرتے تھے......‘

آج امّاں کو جانے کیا ہو گیا تھا۔

آج اماں بھی مولوی محفوظ کی زبان میں بات کر رہی تھیں۔

’کرا دیا بٹوارہ— بنا دیا پاکستان— دلوں کو جدا کر دیا کم بختوں نے— وہاں اکیلے مرنے کے لیے چھوڑ دیا۔ بھائی کے آنسو پوچھنا چاہوں تو سامنے سرحد ہے۔ بلند شہر اور دلّی ہوتی تو چلے بھی جاتے مگر یہاں تو دو طرفہ کانٹوں کی سرحدیں ہیں، جسے عبور نہیں کیا جا سکتا—‘

امّاں کے دل میں آگ لگی ہوئی تھی—ایک بار پھر بھائی کا زخم تازہ ہو گیا تھا—

اماں گلہ پھاڑ پھاڑ کر رو رہی تھیں۔

ابّا خاموشی سے چھت پر چلے گئے۔

ان کے پیچھے پیچھے میں بھی چھت پر چلا آیا۔ ٹھنڈی ہوا بہہ رہی تھی۔ آسمان پر جگمگاتے ستاروں کا رقص جاری تھا......تب پہلی بار احساس ہوا تھا، ہماری ہر کامیابی، ناکامی کے پیچھے یہ قدرت ہی ہے—

ہماری ہر جیت ہار کے پیچھے یہ قدرت ہے۔

ہم کھیلتے ہیں۔ تماشہ کرتے ہیں۔ لیکن ہم سے تماشہ کرانے والی بھی قدرت ہے—‘

آسمان پر بدلیاں چھا گئی تھیں—چاند کے چھپنے نکلنے کا کھیل شروع ہو گیا تھا—

●●

(۳)

شہر میں دوسرے دن بھی ماحول بہتر نہیں ہوسکا۔ گشتی پولس کی گاڑیاں گھوم رہی تھیں۔ محلّہ شیخاں میں امام عظیم بھائی کے گھر اس واردات کے بعد ایک میٹنگ ہوئی تھی۔ میٹنگ کس بات پر ہوئی، یہ معلوم نہیں ہوسکا۔ لیکن میٹنگ کی خبر اڑتی اڑتی ان علاقوں تک گئی جہاں دوسرے مذہب کے لوگ زیادہ تعداد میں تھے۔ پھر افواہیں گشت کرنے لگیں۔

'میئن بدلہ لینے کے فراق میں ہیں'

'کل سارا دن میئن گپ چپ میٹنگ کرتے رہے—'

'حملہ کرنے کا پروگرام ہے—'

'رات کے وقت سونا نہیں ہوگا......'

'میئن اسلحے جمع کر رہے ہیں۔'

'اب سالوں کو پاکستان کھدیڑنا ہی ہوگا......'

کچھ ایسی ہی خبریں اڑتی اڑتی مسلم گھرانوں میں بھی گشت کر رہی تھیں۔

'ہندو لڑکی کو بدنام کرنے کی سازش۔ ہندو چھوڑیں گے نہیں—'

'ایک کا بدلہ دس لوگوں سے لیں گے۔'

کم و بیش نفرت کا وہی رنگ دونوں طرف غالب تھا، جو تقسیم کے وقت رہا ہوگا— احتیاط کے طور پر شہر میں دھارا ۱۴۴ لگا دی گئی تھی—

ہم جیسے کسی قید خانے میں تھے۔ عام طور پر صبح میں دروازے پر لگا لکڑی کا کنڈہ الگ کر دیا جاتا تھا۔ پھر یہ کنڈہ رات گئے ہی دروازے پر لگا کر بند کیا جاتا— مگر ان خبروں کو سنتے ہوئے احتیاط کے طور پر ابّا نے گھر کو مقفل کر دیا تھا— محلے میں جتنی اڑتی اڑتی خبریں تھیں، ان سے کہیں زیادہ خبریں علی بخش کے پاس جمع تھیں— مگر افسوس یہ، کہ علی بخش کو، کسی کو بھی یہ خبریں سنانے کا موقع نہیں مل رہا تھا—

میں کتابیں پڑھ رہا تھا کہ علی بخش کمرے میں داخل ہوئے۔ وہ میری میز کے پاس ہی آ کر

کھڑے ہو گئے۔

'رحمٰن بابو...... کیا ہم پاکستان نہیں جا سکتے—؟'

'پاکستان؟'

میں ایک دم سے چونک گیا تھا— 'پاکستان کیوں؟'

'ارے آپ تو گھر میں رہتے ہیں۔ آپ کو کیا پتہ کہ لوگ کیسی کیسی باتیں بنا رہے ہیں۔ آپ کو تو اجازت بھی نہیں ہے گھر سے باہر نکلنے کی...... ذرا باہر جایئے...... اُف— ایسی باتیں کہ بس کان پھٹ جائیں اور ہم زمین میں دفن ہو جائیں—'

'اچھا—'

وہ کان میں پھسپھسائے۔ 'دنگے کی تیاری ہے رحمٰن بابو— بڑے دنگے کی۔ ہندوؤں نے میٹنگ کی تھی۔ سارے مسلمانوں کو پاکستان کھدیڑ کے دم لیں گے۔'

'اچھا—'

'اور کیا— یہاں تو سب کو مذاق لگتا ہے۔ مگر یہی سچ ہے۔ میں تو کہتا ہوں ابھی بھی وقت ہے— ابھی بھی ہم پاکستان جا سکتے ہیں......'

'اب نہیں جا سکتے—' تاریخ کی معلومات مجھے بھی تھی۔ میں آہستہ آہستہ اب اس تاریخ میں دلچسپی لینے لگا تھا— 'وہاں اس سے بھی برا حال ہے— یہاں سے بھی زیادہ جانیں جا رہی ہیں وہاں۔'

'اچھا— یعنی مسلمان، مسلمان کو مار رہے ہیں—'

'ہاں......'

'اوہ......' علی بخش گہری فکر میں ڈوب گئے تھے۔ مگر دنگا ابھی تک ان کے دل اور دماغ میں بسا ہوا تھا......

'شہر کی فضا اچھی نہیں ہے۔' وہ گہری سانس لے کر بولے۔ اب یہ فضا ایسی ہی رہے

گی.....'

علی بخش واپس لوٹ گئے تھے......

مگران کے آخری الفاظ دیر تک ذہن و دماغ میں ہلچل مچاتے رہے......

●●

میں کتابیں لیے بیٹھا تھا— لیکن جیسے کتابوں سے سارے لفظ مٹ گئے تھے......دھماکے ہو رہے تھے......میں آسمان پر تیزی سے پھیلتے دھویں کو دیکھ رہا تھا......

جیسے گدھ اتر رہے ہوں......

سڑک پر بلوا کرنے والے شور کر رہے ہوں......

ہر طرف مارو......پکڑو......کے گندے شور دل و دماغ میں طوفان مچا رہے تھے......یہ کس صدی میں آ گئے ہیں ہم......میری سوچ کا زاویہ تنگ ہوتا جا رہا تھا— کیا ملک صرف ایک ہی موسم، یا ایک ہی تہذیب میں گم ہے۔ دنگوں کا موسم یا دنگوں کی تہذیب......؟

●●

مولوی محفوظ اکیلے آئے تھے......گمشدہ خزانے کی کھدائی کچھ دنوں کے لیے روک دی گئی تھی......جب تک کہ فضا سازگار نہ ہو جائے—

یہ بہتر فیصلہ تھا—

اور اس فیصلے کے سوا کوئی دوسرا راستہ بھی نہ تھا......

●●

اُس دن، دیر شام تک افواہوں کا بازار گرم رہا۔ رات میں ہم چھت پر نہیں— بلکہ نیچے والی دالان میں سوئے تھے۔ علی بخش اور مریم بوا اپنے اپنے کمرے میں تھیں۔

نیند غائب تھی — دنگے اور فساد کی خبروں نے آنکھوں سے نیند چھین لی تھی — مگر کسی کو کیا معلوم تھا کہ ایک انہونی ہمارا انتظار کر رہی ہے —

رات کے ۳ بجے ہوں گے۔

سارا شہر سنّاٹے میں ڈوبا تھا — حویلی اندھیرے میں کھوگئی تھی۔ باہر سڑک سے ٹھہر ٹھہر کر کتّوں کے بھونکنے کی آواز آجاتی۔ کبھی بھی سڑک سے گزرتی گاڑیوں کے شور بھیانک معلوم ہوتے...... اٹھ کر باتھ روم جاتے ہوئے بھی ڈر محسوس ہو رہا تھا۔ اس کے لیے آنگن کو پار کرنا ہوتا تھا۔ میں ڈرتے ڈرتے باتھ روم گیا۔ واپس آتے ہوئے اچانک قدم تھر تھر کانپنے لگے......

دروازے پر دستک ہو رہی تھی......

'اس وقت دستک؟ اس وقت کون ہوسکتا ہے۔؟

میں کمرے میں آیا تو امّی، ابّا دونوں جاگ چکے تھے۔ یقیناً یہ دستک میرے اپنے گھر کے باہری دروازے سے آرہی تھی...... میں نے آگے بڑھنا چاہا تو امی نے روک دیا —

'خبردار......'

اماں کے چہرے پر کاٹو تو خون نہیں —

اس وقت کون ہوگا......؟

میں کیا جانوں......، ابا بھی ڈرے سہمے کھڑے تھے......

دستک بڑھ گئی تھی۔

اپنے کمرے سے علی بخش بھاگے بھاگے آئے تھے۔

'یہ دستک سن رہے ہیں آپ؟' علی بخش کے چہرے پر سنّاٹا چھایا تھا۔ ہو نہ ہو وہی ہوں گے......'

'وہی —؟ وہی کون......؟

'جنھوں نے محلّہ شیخاں میں خونی واردات کو انجام دیا ہے......

اللہ......اماں زور زور سے رونے لگ گئی تھیں۔

ابا نے علی بخش کو ڈانٹا— پاگل مت بنو۔ یہ کیا الٹی سیدھی باتیں بنانے لگتے ہو— تمہیں کسی کا کوئی خیال بھی نہیں رہتا۔'

اماں رو رہی تھیں۔ 'ہائے اللہ— وہ ہمارے گھر بھی آ گئے۔ سب کو مار دیں گے۔ میرا بچہ—'

ایک جھٹکے سے اٹھ کر انہوں نے مجھے اپنی بانہوں کے گھیرے میں لے لیا تھا—

'اب کیا ہوگا......؟' وہ سہمی نگاہوں سے ابّا کو دیکھ رہی تھیں......

'پاگل مت بنو......' ابّا اٹھ کر دو قدم آگے بڑھے— امّی نے زور سے چیخ لگائی—

'کیا کر رہے ہیں......؟ کہاں جا رہے ہیں......؟ میری قسم......'

ابّا کے قدم ٹھہر گئے تھے۔ ابّا نے ہاتھ کے اشارے سے علی بخش اور امّاں کو روکا— دستک سننے کی کوشش کی—

'کیا تمہیں نہیں لگتا کہ یہ صرف ایک آدمی کی دستک ہے—'

'ہائیں......اس کے معنی......'

'یعنی بہت سے لوگ نہیں ہیں۔ جیسا کہ علی بخش کہہ رہا تھا......' ابّا نے فساد کی طرف اشارہ کیا......

'آپ کا مطلب ہے......'

'کوئی ایک آدمی......'

'لیکن کوئی ایک آدمی رات کے ۳ بجے بلند حویلی کیا کرنے آئے گا—؟ اور کیوں؟'

'یہ تو وہی جانے......'

'گمشدہ خزانہ......' آہستہ سے میرے منہ سے نکلا......

اماں ڈر گئی تھیں— 'کہیں کوئی جنات......یا پولس والے......'

پولس کے نام پر ابّا کی آنکھوں میں بھی شک کے ڈورے لہرائے۔ 'مولوی محفوظ بیوقوف آدمی ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ انجانے میں اس نے اس کا تذکرہ کسی سے کر دیا ہو—اور بات گھومتی ہوئی پولس تک پہنچ گئی ہو......'

'ہائے اللہ— اب تو وہ سارا گھر کھود ڈالیں گے۔ ہم کھانے کھانے کو محتاج ہو جائیں گے—'

'چپ—، ابّا نے زور سے روتی ہوئی اماں کو ڈانٹ پلائی— 'مگر پولس صبح سویرے بھی تو آسکتی تھی......؟ اس وقت—؟ آدھی رات کے وقت......'

'ہوسکتا ہے گشتی پولس کو اب خبر ملی ہو— وہ گھر کی تلاشی لینا چاہتے ہوں......' علی بخش نے کہا—اور اپنی اس دور کی کوڑی پر اس عالم میں بھی وہ مسکرائے بغیر نہیں رہ سکے۔

'تم پاگل ہو علی بخش......'

'بابو کی بات......'

لیکن دستک مسلسل جاری تھی۔

'کہیں یہ آواز......' امّاں نے گھبرا کر ابّا سے پوچھا...... وہاں سے تو نہیں آ رہی' جہاں خزانہ......' علی بخش کی طرف دیکھ کر انہوں نے جلدی سے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا......

چوپ...... ابا نے علی بخش کو پھر ڈانٹ پلائی۔ مگر ابّا خود حیران تھے— اس وقت رات کے تین بجے...... بھلا کون آسکتا ہے۔ کسے اس حویلی کی ضرورت پڑسکتی ہے......؟

'کوئی دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے......' آنکھیں ملتی ہوئی مریم بوا بھی آ گئی تھیں۔ اُنہیں حیرت تھی۔ اس وقت کون ہوگا۔ کوئی ڈاکو، چور...... رات میں تو وہی لوگ آتے ہیں۔ دروازہ کھٹکھٹاتے ہیں پھر دروازہ کھلنے پر چاقو دکھا کر اندر آ جاتے ہیں۔ اور گھر کا سارا خزانہ لوٹ کر لے جاتے ہیں۔ اے بو بو...... ایسے پھٹی پھٹی آنکھوں سے کیا دیکھ رہی ہو......' مریم بوا امّی کی طرف دیکھتی ہوئی بولیں— ارے آج کل یہی ہو رہا ہے۔ جہاں دیکھو یہی ہو رہا ہے۔ آزادی کے بعد تو اب یہی ہونا

تھا بو بو......‘

ابّا کو مریم بوا کی بات میں وزن لگ رہا تھا۔ ایسا ممکن ہے...... ورنہ اگر کوئی دروازے پر ہے تو وہ بولتا کیوں نہیں۔ ڈر کس بات کا ہے—‘

دستک بڑھتی جا رہی تھی......

’اماں نے جھٹ سے قرآن شریف نکال لیا۔ تلاوت شروع کر دی۔ علی بخش دالان کے باہر ٹہل رہے تھے۔ مریم بوا دیوار سے ٹیک لگائے کھڑی تھیں۔

’اب کافی دیر ہو گئی ہے......‘ ابّا کا فیصلہ آ چکا تھا۔ مجھے دیکھنے دو۔ اس طرح شک اور خوف میں جینا کوئی جینا نہیں ہے۔

امّی زور سے چلائیں— مت جایئے۔ دروازہ مت کھولیے۔ کسی نے چاقو چلا دیا تو...... کون جانے دشمن ہے یا ڈاکو۔ آپ کو خدانخواستہ کچھ ہو گیا تو......‘

’دروازہ نہیں کھول رہا ہوں بیگم۔ صرف مین گیٹ تک جا رہا ہوں۔ یہ معلوم تو ہونا چاہئے کہ کون ہے......‘

’لیکن دروازہ مت کھولیے گا۔ علی بخش کو ساتھ لے جایئے......‘

اماں دوبارہ قرآن شریف کی تلاوت میں گم ہو گئیں۔

ابّا آگے بڑھے— علی بخش پیچھے پیچھے— اور ان دونوں سے پیچھے میں— ذہن میں مسلسل آندھیاں چل رہی تھیں...... اس وقت کون ہوگا...... جانے کہاں سے‘ اس عالم میں بھی نادرہ کا نام میرے ہونٹوں پر چپکے سے آ گیا...... نادرہ تو نہیں آ گئی......؟

ابّا دروازے کے پاس پاؤں دابے چلتے ہوئے آ کر کھڑے ہو گئے۔ علی بخش اور میں بھی پاؤں دابے گہرے سنّاٹے میں آواز کا سراغ لگانے میں مصروف تھے۔

دستک ایک لمحے کو رکی تھی— کوئی بات کر رہا تھا...... ایک چھوٹی سی بچی کی آواز بھی پہلی بار سنائی دی۔ ابّا نے چونک کر میری طرف دیکھا— پھر علی بخش کی طرف...... پھر دھیرے سے

بولے......کیا تم لوگ وہی سن رہے ہو......جو میں سن رہا ہوں......'

'ہاں......'

'کوئی بچی ہے......' یہ علی بخش کی آواز تھی......

ابّا ایک لمحے کو سوچ میں گم ہو گئے— پھر فیصلہ سنا دیا۔ دروازہ کھول دو—

علی بخش سوراخ میں لگے کنڈے کو پوری طاقت سے الگ کرنے لگے— ایسا کرتے ہوئے بھی وہ جیسے خوف سے خود کو الگ نہیں کر سکے تھے......

'ٹھہرو......' ابّا نے اُنہیں روکا......

'مگر، بچی......اس وقت......؟' ابّا نے پھر کان لگا کر سننے کی کوشش کی۔ وہ پر امید تھے۔ اب جو ہوگا دیکھا جائے گا— ممکن ہے بُرے وقت کا مارا کوئی مسافر ہو— کھول دو دروازہ—'

علی بخش نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا......

●●

(۴)

اماں سفیان ماموں کے گلے لگ کر بری طرح رو رہی تھیں۔ میں ننھی سی نادرہ کو دیکھ رہا تھا۔ ہاتھ میں نازک سی چوڑیاں...... گورا رنگ، لمبا چہرہ......شلوار اور جمپر پہنے۔ سفیان ماموں کا لباس گندہ ہو رہا تھا۔ وہ سفید خان سوٹ میں تھے۔ پاؤں میں ہوائی چپل ڈالے۔ بڑی مشکل سے ایک تانگے والا اُنہیں حویلی کے دروازے تک چھوڑ کر گیا تھا۔ ان کے ساتھ کئی چھوٹے بڑے سامان بھی تھے......ابّا کو حیرت تھی......

'حکیم صاحب— آپ آواز کیوں نہیں دے رہے تھے......'

'وہ......گاڑی سے اترنے کے بعد ہی پتہ چل گیا تھا کہ شہر کی فضا ٹھیک نہیں۔ پہلے سوچا

کہ ریلوے گیسٹ ہاؤس میں رات گزارلوں......مگر نادرہ......بن ماں کی بچی روئے جارہی تھی......

'ہائے...... بن ماں کی بچی.....' اماں دہاڑیں مارتی ہوئی نادرہ کو لپٹا کر روئے جارہی تھیں۔نادرہ بھی ان کے ساتھ ساتھ آنسو بہارہی تھی۔

'مت رو— میری لعل۔میری لاڈو— ہم ہیں نا یہاں.....' اماں پھر چیخ کر بولیں۔ ہم سب دے دیں گے لیکن تجھے تیری ماں کہاں سے دیں گے......'

ابّا نے زور سے ڈانٹا— 'یہ کیا اناپ شناپ بکنے لگیں آپ۔نادرہ کو چپ کرائیے...... اسے تسلی دیجئے۔اس کے سامنے ایسی باتیں نہ کیجئے، جس سے معصوم کا دل پھٹ جائے......'

اماں نے آنسو پوچھے—

'میری پھول سی بچی' کہہ کر نادرہ کو دوبارہ سینے سے لگایا۔حکیم صاحب رو رہے تھے...... آنکھیں مسلسل گنگا جمنی بنی ہوئی تھیں۔

'یہ سب اچانک کیسے ہوا بھائی.....' ابّا کے لہجے میں اداسی پسری ہوئی تھی......

'سب اللہ کی مصلحت— فرزانہ کی موت کے بعد وہ ملک بھی مجھے کاٹ کھانے لگا— کہنے کو اپنے تھے وسیع بھائی ....مگر غیروں سے بدتر..... جانے کس بری ساعت میں، میں نے پاکستان جانے کا ارادہ کیا تھا۔اب سوچتا ہوں تو احساس ہوتا ہے— فرزانہ کتنا روئی تھی۔کتنا سمجھایا تھا، مت جائیے— وہاں کون اپنا ہے، جو دکھ کے موقع پر ہمارے آنسو پوچھے گا۔ یہاں سارے اپنے ہیں۔ہندو ہوں یا مسلم.....مت جائیے.....وسیع بھائی، اس کی آواز کانوں میں گونجتی ہے تو خود سے نفرت ہونے لگتی ہے۔وہ سمجھاتی تھی۔آخر آخر وقت تک سمجھاتی رہی۔مت جائیے پاکستان...... مجھے اس نام سے ہول آتا ہے— یہی ملک ہے اپنا۔سب مل کر رہتے ہیں اور سب مل کر رہیں گے۔انگریزوں کی چھوڑی گئی آتش بازی ہے بس— جو اپنا کام کررہی ہے— جنہیں جانا ہے اُنہیں جانے دیجئے— لیکن آپ مت جائیے......اس کا چہرہ یاد آتا ہے وسیع بھائی— اور جب اس کے باوجود میں اپنے فیصلے پر اڑا رہا تو اس نے بھی اپنا فیصلہ سنا دیا۔آپ شریک سفر

ہیں۔ آپ کی مرضی— لیکن میرا ملک ہمیشہ سے یہی ہے۔ یہی رہے گا۔ پاکستان کبھی میرا ملک نہیں رہے گا— اور کہے دیتی ہوں میں ایک دن بھی وہاں خوش نہیں رہوں گی— اور ہاں یہ بھی کہے دیتی ہوں۔ زیادہ لمبے سفر تک آپ کا ساتھ نہیں دے پاؤں گی.....'

'اماں چیخ چیخ کر رونے لگیں...... پھر کیوں گئے تھے بھیّا۔ بھابھی ساتھ گئی تھیں تو اکیلے کیوں آئے.....'

نادرہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے سب کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ جیسے اس دردناک منظر سے خود کو وابستہ کرنے کی تیاری کر رہی ہو۔ حکیم صاحب پھر رونے لگے تھے—

'میں نے اس کی ایک نہیں سنی۔ میں نے سمجھا ہی نہیں کہ وہ کس سفر کی بات کر رہی ہے— اور دیکھو بہن— آدھے راستے میں ہی ساتھ چھوڑ کر چلی گئی— بس اپنی یاد اس ننھے سے تحفے میں رکھ گئی— اب فرزانہ کی یہ ننھی سی یاد کے سہارے جی لوں گا میں...... لیکن اسے بھولوں تو کیسے بھولوں۔ بس اسی لیے قتل کے بعد پاکستان کاٹ کھانے کو دوڑنے لگا۔ گھر بھر میں، گھر کی ایک ایک شئے میں اس کی یادیں زندہ تھیں— مجھے احساس ہوا، یہاں رہا تو جی نہیں پاؤں گا۔ پھر نادرہ کو کون سنبھالے گا۔ بس جلدی جلدی ویزا لیا اور اس کے بعد ایک پل رکنا بھی گوارہ نہیں کیا...... یہ میں اور میرا ہی خدا جانتا ہے کہ فرزانہ کی موت کے بعد میں اتنے دن تک وہاں پر کیسے رکا رہ گیا— نادرہ کا چہرہ دیکھتا تھا تو جیسے دل پھٹ جاتا تھا۔ مگر اس معصوم سی بچی کو دیکھو۔ اس نے وہ صبر کیا کہ مجھے بھی دلاسہ دیتی رہی۔ فرزانہ کی موت کے بعد کیا تم یقین کرو گی بہن— کہ اسی نادرہ نے سارے گھر کی ذمہ داری اٹھالی۔ مجھے جگانا، چائے دینا، میرے آنسوؤں کو پوچھنا، قرآن شریف کی تلاوت کرنا...... ہاں...... چپکے چپکے تنہائی میں اسے ماں کو یاد کر کے روتے دیکھا ہے...... مگر سامنے آنے پر یہ تو دوسری فرزانہ بن جاتی ہے— یہ تو خود مجھے ہی چپ کراتی ہے.....'

اماں ایک بار پھر نادرہ کو لپٹا کر رو رہی تھیں۔ میں نادرہ کو دیکھ رہا تھا...... جو مشکل سے اپنے آنسوؤں کو روک پا رہی تھی...... سرخ شلوار...... اسی سے میچ کرتا کرتا ہوا آنچل— سفیان ماموں

کی تمام باتوں میں صرف ایک یہی جملہ میرے آگے آکر ٹھہر گیا تھا...... یہ دوسری فرزانہ بن جاتی ہے......

دوسری فرزانہ......

فرزانہ، سفیان ماموں کی بیوی تھیں...... میری ممانی......جسم آپس میں گڈمڈ ہو رہے تھے...... یہ دوسری فرزانہ بن گئی تھی......آواز کا Echo میرے کانوں کے پاس چنگھاڑ رہا تھا...... میں یکا یک بیحد غور سے نادرہ کا جائزہ لے رہا تھا— اور یہ کیا......اچانک نادرہ کا جسم پھولنے لگا......میری آنکھیں حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہی تھیں...... جیسے مجھے موٹا کرنے کے لیے ایک دن اماں نے مجھے بھالو سے پھکوایا تھا۔ تب میری عمر سات سال کی تھی— اور میں بہت دبلا پتلا تھا۔ اماں کو موٹے بچے کا شوق تھا۔ بس ایک دن ڈگ ڈگی بجاتے بھالو والے کو اماں نے بلایا۔ اس زمانے میں مشہور تھا کہ بھالو کے پھکوانے سے بچے موٹے ہو جاتے ہیں۔

لیکن میں تو ویسا ہی رہا—

ذرا بھی موٹا نہیں ہوا۔ لیکن یہاں تو بھالو والا بھی نہیں۔ اس کی ڈگ ڈگی بھی نہیں۔ نادرہ پھول رہی ہے۔ بڑی ہو رہی ہے......اس کے پاؤں بڑے ہو رہے ہیں......لباس......جسم......اور یہ کیا...... وہ پوری کی پوری ایک جوان لڑکی میں قید ہو گئی...... یہ میری دوسری فرزانہ ہے......حکیم صاحب مجھے گندے لگ رہے ہیں— نہیں حکیم صاحب نہیں— سفیان ماموں— سفیان ماموں نہیں— حکیم صاحب...... میری دوسری فرزانہ— دوسری بیگم...... پیار سے ادا کیا گیا......ایک بے حد معمولی محبت سے بھرا لفظ میرے لیے بجھو گھاٹی بن گیا ہے...... نادرہ...... یہی نام پچھلے کئی دنوں سے گھر میں برابر گونج رہا تھا— اور یہ نام پچھلے کئی دنوں سے میری یاد میں رہ رہ کے شامل ہو رہا تھا— اور جس وقت آدھی رات کی دستک میں گھر والے گمشدہ خزانے سے لے کر چور، ڈاکو، جن اور بلوائیوں کا سراغ لگانے میں لگے تھے، تب بھی میرے ہونٹوں پر یہی لفظ چپکے سے تھرایا تھا......

نادرہ......

کیا یہ...... ٹیلی پیتھی تھی......؟

کوئی روحانی وائبریشن...... نہ خط نہ کتابت—— نہ آنے کی کوئی خبر—— پھر بھی اس دہشت سے بھرے ماحول میں دستک کی آواز سن کر میرے ہونٹوں پر صرف اسی نام کا شعلہ کیوں لپکا تھا؟ بھالو غائب تھا...... نادرہ پھر سے ننھی ہو گئی تھی—— اس کی آنکھیں خشک تھیں مگر پھولی ہوئی۔ اب وہ بغیر پلکیں جھپکائے میری طرف دیکھ رہی تھی—— اور جیسے اسے بھی اس بات کا احساس ہو کہ میں بھی اس کی طرف دیکھ رہا ہوں—— اُس نے منہ پھیر لیا——

اماں کی آواز سنائی دی—— مریم...... ارے پتہ نہیں کتنے بجے یہ لوگ چلے ہوں گے۔ کمرہ ٹھیک کرو—— نہانے دھونے کا پانی رکھو—— اور کھانا گرم کرو......،

’جی بوبو......‘

مریم بوا بھی اپنے آنسو پوچھ رہی تھیں......

سفیان ماموں بستر پر بیٹھ گئے تھے۔ یا پھر یادوں کے ریلے میں دور بہتے ہوئے چلے گئے تھے......

●●

اس زمانے میں ہندستان اور پاکستان کو لے کر اتنی مشکلات، پیچیدگیاں نہیں تھیں۔ اکثر یہاں کے لوگ پاکستان جا کر بس جایا کرتے تھے۔ پاکستان سے کئی کئی لوگ ہندستان آ کر پھر واپس پاکستان نہیں گئے۔ یہ سلسلہ آزادی کے بعد بھی بہت دنوں تک چلتا رہا تھا۔ سفیان ماموں بھی پاکستان واپس نہیں جانے کے خیال سے آئے تھے۔ اماں اور ابا نے ان کے اس فیصلے کا خیر مقدم کیا تھا۔

ایسے ماحول اور نازک وقت میں بھی سفیان ماموں سارے گھر کے لیے تحفہ تحائف لانا نہیں بھولے۔ میرے لیے پینٹ، شرٹ اور خان سوٹ کے کپڑے تھے—— اماں کے لیے شلوار اور

جمپر کا سوٹ — ابّا کے لیے جانماز، تسبیح اور خاص کر پاکستان کے اردو رسائل...... وہ بکسے سے اک ایک رسالہ نکال کر ابّا کو دیتے جاتے تھے — اور ابّا خوش ہو کر واہ واہ کیے جارہے تھے۔

'یہ نقوش کا نمبر...... یہ ادبِ لطیف کا سالنامہ...... یہ نگار کے شمارے، یہ سیپ بھی نکلنے لگا ہے...... یہ کچھ وہاں کے اردو اخبار ہیں —'

'بھئی واہ حکیم صاحب۔ اس قیمتی اثاثے نے بہت خوش کردیا۔ ابّا پاکستانی رسائل کے عاشق تھے۔ پاکستان سے آنے والوں کے لیے خصوصی طور پر فرمائش کی جاتی کہ پاکستان سے اردو اخبار اور رسائل لانا نہ بھولیں۔ جیسے پاکستان کے لوگ یہاں آ کر یہاں کے پان اور سپاری بندھوا کر پاکستان لے جانا نہیں بھولتے۔ اس زمانے میں پاکستان میں پان بہت مہنگا ہوا کرتا تھا۔ پاکستان سے کوئی ملنے والا آتا تو اماں سفیان ماموں کے لیے خاص کر پان کا تحفہ ضرور بھجواتیں۔

صبح ہوتے ہی سفیان ماموں نہا دھو کر لنگی پہن کر تیار ہو گئے۔ اُنہوں نے سینے پر ایک بنیائن ڈالی ہوئی تھی۔ ایک پن ڈبّہ تھا...... جس کا اندرونی حصہ کتّھے اور چونے کے ملنے سے سیاہ ہو چکا تھا۔ یہ پن ڈبہ ہر وقت ان کے ساتھ ہوتا۔ پان کی گلوری بنتی — منہ میں ڈالتے — اور اماں کے آگے پیچھے گھومتے ہوئے گفتگو کا سلسلہ جاری رہتا...... گردن سے دانت کھودنے کے لیے ایک چھوٹی سی شمشیر دھاگے سے لٹکی ہوئی سینے سے جھولتی رہتی۔ جب کوئی سپاری دانتوں میں پھنس جاتی تو بڑی شان سے سفیان ماموں اس دانت کھودنے کو منہ میں لے جاتے۔ پھر جادو کی طرح لہراتی یہ تلوار دوبارہ ان کے سینے سے جھول جاتی۔

میں دیکھ رہا تھا، نادرہ مجھ سے بچنے کی کوشش کر رہی ہے۔ وہ میرے پاس آتے ہوئے گھبراہٹ سی محسوس کر رہی ہے۔ وہ مجھ سے دو سال چھوٹی تھی۔ ہوسکتا ہے، جس طرح خاموشی سے میں اس کے بارے میں مسلسل سوچ رہا تھا، اسی طرح نادرہ بھی وہاں پاکستان میں میرے بارے میں سنتی رہی ہو۔ اور اچانک مجھے سامنے دیکھ کر وہ مجھ سے گفتگو کرتے ہوئے گھبراہٹ سی محسوس کر رہی ہو —

صبح سویرے چولہے سلگ گئے۔ آنگن میں چولہے کا دھواں پھیل گیا۔ آنگن سے لگا ہوا ایک کھلا کمرہ تھا۔ کھلا کمرہ اس لیے، کہ اس کمرے میں کوئی دروازہ نہ تھا۔ اس کمرے کے اوپر والی چھت سے، رسیوں سے ایک بڑی سی طشت ہوا میں لٹکی رہتی تھی۔ تب یہی ہماری فریج تھی۔ کھانے یا تو نعمت خانے میں رکھے جاتے یا اس کمرے کی چھت سے لٹکی 'سینی' یا 'سکھر' پر— نعمت خانے میں عام طور پر جب جگہ نہیں رہتی تھی تو کھانے کے سامان اسی سکھر پر رکھ دیئے جاتے...... سکھر کے ٹھیک نیچے آم کی لکڑی سے بنی ہوئی مضبوط چوکی تھی۔ جس پر عام طور پر دری اور چادر بچھی ہوتی— صبح صبح ابا اسی چوکی پر بیٹھ کر ہاتھ منہ دھوتے تھے...... یا پھر نماز کے لیے وضوء کرتے تھے۔ تب چادر اور دری کا کونہ الٹ دیا جاتا— اس وقت بھی ابا چوکی پر بیٹھے ہاتھ منہ دھو رہے تھے— اماں کے آنسو رک چکے تھے۔ ابا کے حکیم صاحب ٹہل ٹہل کر ابا کو پاکستان کے بارے میں بتا رہے تھے......

میں نے دیکھا، چاپاکل سے پانی چلاتی ہوئی نادرہ منہ پر پانی کے چھینٹے مار رہی ہے۔ لیکن چاپاکل چلانے میں اسے دقت ہو رہی تھی۔ میں مدد کے لیے آ گیا۔ لیکن یہ کیا۔ نادرہ مجھے دیکھ کر چاپاکل سے ہٹ گئی تھی۔ اب وہ امی کے پاس تھی— مگر مجھے احساس تھا، وہ مجھے دیکھے جا رہی ہے......

ابا نے ایک بار پھر رات کا تذکرہ چھیڑ دیا۔ ابا مزے لے لے کر بتاتے رہے کہ دستک کی آواز سن کر آدھے گھنٹے تک اس گھر میں کیسا کہرام برپا رہا—

پہلی بار میں نے سفیان ماموں کو ہنستے ہوئے دیکھا۔ اُن کے دانت زیادہ پان کھانے کی وجہ سے کالے ہو گئے تھے...... وہ مسکرا رہے تھے۔ اسٹیشن پر تانگے والے نے ہی ڈرا دیا...... صاحب بلند حویلی تک پہنچ گئے تو پہنچ گئے— مگر کوئی دروازہ نہیں کھولے گا، کہے دیتا ہوں......

'کیوں نہیں کھولے گا......' اماں سب کے لیے چائے تیار کرتی ہوئی بولیں—

'ارے بھائی— میں تو پاکستان سے آیا تھا۔ لیکن مجھ سے کہیں زیادہ وہ ڈرا ہوا تھا—

دروازے پر پہنچ کر کئی بار احساس ہوا کہ آواز لگاؤں مگر ہر بار نادرہ مجھے روک دیتی تھی...... کہ ابّو اس وقت آواز لگانا مناسب نہیں۔ دروازہ نہیں کھلا تو ہم یہیں کھڑے کھڑے پو پھٹنے کا انتظار کر لیں گے۔'

'کیسی ذہین اور پیاری بچی ہے — بالکل بھابھی کی کاپی......' اماں کے لب ولہجہ میں پھر سے اداسی چھا گئی تھی......

چائے کے بعد ناشتہ لگ گیا — ابّا، حکیم صاحب اور امی جان گفتگو کرنے بیٹھ گئے۔ مگر میں نادرہ کو تلاش کر رہا تھا۔ اُسے کیا ہو گیا ہے...... میں نے کتنا انتظار کیا تھا اس کا — مگر وہ مجھ سے بات کیوں نہیں کرتی — بار بار مجھ سے بچنے کی کوشش کیوں کر رہی ہے......

میں جتنا سوچتا، دماغ اُتنا ہی الجھنے لگتا — میں نفسیات کی اس عجیب وغریب کہانی سے بالکل ناواقف تھا۔ یا اس بات سے کہ یہ لڑکی آنے والے وقتوں میں میرے لیے بیحد خاص ہونے والی ہے۔ میں نے کئی بار دیکھا، وہ کنکھیوں سے میری طرف دیکھ رہی ہے۔ پھر مجھے اپنی طرف دیکھتا ہوا محسوس کر کے وہ اپنی نگاہیں دوسری طرف کر لیتی تھی۔

دالان سے ملحق ایک بڑا سا کمرہ مہمانوں کے لیے تھا۔ اسی کمرے میں سفیان ماموں کے سامان رکھ دیئے گئے۔ آج سے یہ کمرہ سفیان ماموں کے لیے تھا۔ مریم بوا نے کمرے میں نادرہ اور سفیان ماموں کے لیے بستر بچھا دیا —

میرے لیے چونکنے کی بات صرف ایک تھی، کیا نادرہ جانتی ہے کہ میں اسے مسلسل سوچتا رہا ہوں...... کیا انجانے طور پر انسانی نفسیات جسم کے ایسے راز یا اشارے خود بہ خود جان جاتی ہے — اگر یہ ممکن نہیں تو پھر نادرہ مجھ سے آنکھیں کیوں نہیں ملاتی۔ مجھ سے باتیں کیوں نہیں کرتی۔ آخر کو میں اس کا ممیرا بھائی بھی تھا...... میں تو خوش تھا کہ اگر نادرہ آئے گی تو ہم گھنٹوں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر باتیں کرتے رہیں گے۔ میں اسے اپنا کمرہ، اپنی کتابیں دکھاؤں گا۔ وہ مجھ سے پاکستان اور اپنے بارے میں گھنٹوں باتیں کرے گی۔ وہ کیا پڑھتی ہے؟ پاکستان کے شب وروز کیسے ہیں؟ وہ

کتنے بجے اٹھتی تھی۔ اس کے سفر کا وقت کیا تھا۔ ہزاروں باتیں—ہزاروں سوال— مگر یہ سوال گم تھے—یہ وہ نادرہ نہیں تھی، جس کے بارے میں، میں مسلسل اپنی سوچ میں الجھا ہوا تھا۔

دوپہر تک یہ بات اماں کی علم میں بھی آچکی تھی۔ وہ نادرہ کو سمجھا رہی تھیں۔

'بھائی کے ساتھ کیوں نہیں کھیلتی......؟'

پلٹ کر نادرہ نے مجھے عجیب نظروں سے دیکھا—اُفّ—اس لمحے جانے کہاں سے پھر وہ بھالو آ گیا......

وہی ڈگ ڈگی کی آواز پر ناچتا بھالو— بھالو والے نے اس کے منہ کو باندھ رکھا ہے......

اور یہ کیا......نادرہ اور اس کے درمیان ذرا سا فاصلہ ہے۔ اور اس فاصلے کے درمیان بھالو ہے......

نادرہ کا جسم تبدیل ہو رہا ہے...... وہ پھول رہی ہے...... میری آنکھیں ایک ٹک اس کے جسم پر مرکوز ہوگئی ہیں......

وہ پھول رہی ہے......

بڑی ہو رہی ہے......اس کا جسم ......اس کے لباس......میں اچانک چونک جاتا ہوں......

نادرہ میری طرف دیکھ رہی ہے......مگر کن نظروں سے؟

شاید اس وقت کی، اس کی نظر کو میں اپنی طرف سے کسی مفہوم کے دائرے میں نہیں باندھ سکتا۔

وہ اس وقت مجھے اپنی عمر سے کافی بڑی لگ رہی تھی......

(۵)

سفیان ماموں کی آمد کے ان دو دنوں میں سارا گھر جیسے اس گمشدہ خزانے کو بھول بیٹھا تھا۔ اس درمیان شہر سے دھارا ۱۴۴ ہٹا دی گئی۔ پولس نے کچھ بلوائیوں کو گرفتار کیا اور دنگے پھیلانے کے جرم میں حراست میں لے کر کارروائی شروع کر دی۔ محلّہ شیخاں میں لوگ اس خونی واردات کو

بھول کر عام زندگی میں لوٹنے کی کوشش کر رہے تھے — بلند شہر کی زندگی ایک بار پھر معمول پر آ گئی تھی —

فضا سازگار ہوتے ہی گمشدہ خزانے کا سراغ ایک بار پھر امی اور ابّا کو پریشان کرنے لگا تھا —

'مولوی محفوظ آئے تو اُنہیں کیا کہا جائے گا؟'

'بھائی کو واپس پاکستان تو نہیں بھیج سکتی۔ اماں کا لہجہ ناگواری سے بھرا تھا۔

'لو، میں نے یہ کب کہا......؟' ابّا کا لہجہ اکھڑا ہوا تھا۔

'تو پھر یہ پوچھنے کی بات ہے کہ مولوی محفوظ سے کیا کہا جائے۔ بھیّا کیا بلند حویلی کی حالت سے آگاہ نہیں — ارے اُنہیں سب پتہ ہے — کیا وہ بوسیدہ ہوتی حویلی کو کھنڈر میں بدلتے دیکھ کر خوش ہوں گے۔ ارے بھائی ہیں اپنے — سگے بھائی ہیں۔ بھائی اور بہن کے درمیان راز کیسا اور پردہ کیسا — بھائی سے بھی اس موضوع پر بات کریں گے۔ ممکن ہے وہ کوئی بہتر مشورہ دیں......'

'حکیم صاحب ہمیں پاگل سمجھیں گے۔'

'نہیں کرنے پر پاگل سمجھیں گے — حویلی کے برے دن آ گئے ہیں۔ مالگذاری کے دن نہیں رہے — گولے اور باقی جگہوں سے آمدنی کے سارے راستے بند — بس وہی، جو دو تین دکانیں نکلی ہیں، اللہ اللہ خیر صلیٰ اور تھوڑی بہت زمین جائیداد — لیکن جب جائیداد ہی بیچنا ہے — جائیداد ہی کھانا ہے، تو یہ سب کتنے دن تک چلے گا — بولیے — ایک دن تو قارون کا خزانہ بھی ختم ہو جاتا ہے — ٹھیک ویسے ہی ایک دن حویلی بھی نیلام ہو جائے گی......' اماں کے کوسنے شروع ہو گئے تھے۔

ابّا نے ہمیشہ کی طرح اس بار بھی سپر ڈال دی۔

سفیان ماموں اب یہاں رہنے کے خیال سے آئے تھے۔ پاکستان میں اُن کی حکمت کا کوئی قدردان نہیں تھا۔ یہ بات اُنہیں ستاتی تھی۔ لیکن اب وہی حکمت وہ یہاں آزمانا چاہتے تھے۔

ان کا خیال تھا کہ کچھ روز کے بعد وہ یہاں ایک کرائے کا مکان دیکھیں گے — اور وہیں ایک کمرے میں اپنی حکیمی بھی شروع کر دیں گے۔ لیکن امی اور ابّا ابھی اس کے سخت خلاف تھے۔ جب تک پاکستان نہ جانے کا معاملہ پوری طرح ان کے فیور میں، نہیں آ جاتا، اُنہیں ایسا قدم نہیں اٹھانا چاہئے — یہ ابّا کا مشورہ تھا۔ ابّا کے سامنے ایسی کئی مثالیں تھیں۔ جب پولس ایسے لوگوں کے لیے وارنٹ تک لے کر آئی۔ لیکن ان کے نہیں ملنے یا کھوج نہیں پانے پر پیسہ لے دے کر معاملہ دبا دیا گیا۔ تعلقات اس زمانے میں بھی کشیدہ تھے۔ لیکن تب ایسی افراتفری نہیں تھی اور لوگ چھپتے چھپاتے بہت آسانی سے اپنے شہر کی شہریت اختیار کر لیتے تھے — ابّا کو اپنی خاندانی پہنچ کا بھی اندازہ تھا — اور وہ اس بات کا بھی اعتراف کرتے تھے کہ بھلے حکیم سفیان کی حکمت پاکستان کو راس نہ آئی ہو، لیکن ہندستان میں اس حکمت کی قدر کرنے والے بے شمار مل جائیں گے۔ دانت کھودتے اور پان کھاتے ہوئے سفیان ماموں ابّا کی بات کو بغور سنا کرتے۔ جیسے ابّا کے روپ میں اُنہیں سچ مچ کا قدر دان مل گیا ہو —

اماں نادرہ پر فدا تھیں۔ کبھی نادرہ کا منہ دھلایا جا رہا ہے۔ کبھی اس کے کپڑے بدلے جا رہے ہیں — یہاں تک کہ باورچی خانے میں بھی نادرہ اماں کا ساتھ دینے کو موجود تھی۔ دو دنوں میں نادرہ گھر کے تمام طور طریقے سیکھ گئی تھی — اماں خوش تھیں۔

'سب بھابھی کی تربیت کا نتیجہ ہے...... وہ نم آنکھوں کو خشک کرتی ہوئی کہتیں — ماشاءاللہ نادرہ کو سارے کام آتے ہیں۔ آج کل کی لڑکیاں جوان ہو جانے پر بھی ایک کپ چائے تک بنانا نہیں جانتیں — اور ذرا اس چھوٹی سی بچی کو دیکھو —

اماں نے سفیان ماموں کو صاف طور پر اپنا فیصلہ سنا دیا تھا —

'آپ اکیلے نہیں ہیں۔ نادرہ ہماری بیٹی بھی ہے۔ اس لیے فی الحال کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہے — ماشاءاللہ حویلی کے ابھی اتنے بھی برے دن نہیں آئے کہ میں اپنے سگے بھائی کو کرائے کے مکان میں بھیج دوں۔ آپ کے لیے ماحول جب پوری طرح سازگار ہو جائے تو جو کرنا ہے وہ

کیجیئے گا— مگر ابھی آپ جب تک ہیں۔ ہمارے ہی ساتھ رہیں گے......

سفیان ماموں ٹہلتے ہوئے پاکستانی قصے لے کر بیٹھ جاتے— گوشت کباب کے قصے، تقسیم سے ہوتے ہوئے فرزانہ پر آکر ٹھہر جاتے— پھر دونوں کافی دیر تک گلے مل کر روتے دیکھے جاتے......ایسے میں نادرہ کی گھومتی ہوئی آنکھیں خاموشی سے اس منظر کو دیکھ رہی ہوتیں۔

اب میں نادرہ سے خاصہ ناراض تھا۔

یعنی یہ تو حد ہوگئی—ایسی بھی کیا دشمنی کہ بات چیت کی نوبت ان دودنوں میں نہیں آسکی۔ میں تو اسے پہلی بار دیکھ رہا تھا۔سفیان ماموں بھی آزادی کے وقت ہی پاکستان کوچ کر گئے تھے— نادرہ وہیں پیدا ہوئی—ہاں مختلف موقعوں پر مجھے اس بات کا احساس ہوتا رہا کہ نادرہ کی خاموش آنکھیں میری طرف دیکھ رہی ہیں۔ایک دوبار میں نے اسے روک کر بات کرنے کی کوشش بھی کی......

نادرہ......سنو......

ارے بات کیا ہے......تم مجھ سے بات کیوں نہیں کرتی......؟

اماں کہتی تھیں—یہ بھی مرحومہ بھابھی کی تربیت ہے۔ بیٹی بھائیوں سے بھی جلدی بات نہیں کرتی— پھر وہ مجھے سمجھاتی تھیں— کرنے لگے گی بات—اس گھر میں اس کی عمر کا اور ہے ہی کون......ابھی شروعات ہے پھر دیکھنا۔وہ تم سے جی بھر کر باتیں کرے گی۔

لیکن میرے لیے یہ سمجھنا آسان نہیں تھا کہ آخر وہ دن کب آئے گا جب نادرہ اور میرے درمیان کی یہ خاموشی ٹوٹ جائے گی......اوراس میں شک نہیں کہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے جانے کہاں سے میں اپنے بدن میں ہزاروں انگارے اکٹھے کرلیا کرتا تھا......

سرخ انگارے......

جیسے میرے جسم میں ایک نا معلوم سی کنپکپی چھا جاتی۔شریانوں میں خون کا دوران تیز ہوجاتا—اورشاید میں نادرہ کی طرف ایسے نہیں دیکھتا تھا، جیسے ایک بھائی اپنی بہن کی طرف دیکھتا

ہے—اور مجھے یہ بتانے میں کوئی پریشانی نہیں کہ وہ مجھے اچھی لگتی تھی......

اور میں اس کا نازک سا ساتھ پانے کے لیے بیقرار تھا......

●●

دن کے کھانے کے بعد ابّی اور امی نے سفیان ماموں سے مشورہ کرنے کے لیے مولوی محفوظ کا ذکر چھیڑ دیا—

سفیان چونک گئے— 'ارے وہ......سالا فراڈ ہے......'

ابّا کھوں کھوں کر کے زور سے ہنسے......

'فراڈ نہیں—اب بدل گیا ہے۔ گھر گھر جاتا ہے۔ بلایا جاتا ہے......'

'ارے فراڈ ہے—میں کہہ رہا ہوں نا......سفیان ماموں زور سے ہنسے......میرے ساتھ ہی تو پڑھتا تھا۔ اُس کا باپ بھی فراڈ تھا۔ وسیع بھائی...... یہ وقت بھی کتنا ظالم ہے—ارے ہم ساتھ ساتھ کبڈی سے لے کر فٹ بال تک کھیلتے تھے—یہیں عیدگاہ کے پاس والے مکان میں— کھیل میں بھی بے ایمانی کرتا تھا—'

سفیان ماموں ہنس رہے تھے— 'تو اب پیری مریدی کرنے لگا ہے۔ ارے وسیع بھائی—ایسے پیر پگاڑو کی وہاں بھی کمی نہیں۔ جسے دیکھئے— ڈھائی گز کی زمین پر قبضہ کیے بیٹھا ہے۔ کہیں مجاور، کہیں پیر پگاڑو بنا۔ پاکستان میں یہ سب سے بڑی کمائی ہے وسیع بھائی۔ اب تو ایسا لگتا ہے جیسے پاکستان کی آدھی سے بڑی آبادی یہی پیری مریدی کر رہی ہو۔

'اچھا—' ابا چونک جاتے تھے......'

'اور کیا—' اب دیکھئے دنیا کا کون سا ایسا خاندان ہے جہاں دکھ، تکلیف یا پریشانیاں نہ ہوں۔ بس انہیں بلایئے۔ یہ آجاتے ہیں۔ عورتیں حال بیان کرتی ہیں۔ یہ جو بتاتے ہیں اُن میں کئی بات سچ بھی ہو جاتی ہے۔ اس طرح ان کے چکر شروع ہو جاتے ہیں......' سفیان ماموں ہنس رہے

تھے—تب تو مسخرہ لگتا ہوگا محفوظ......

'ہاں بھائی— کافی بڑی سی داڑھی ہے— آنکھوں میں سرمہ لگاتے ہیں۔ بڑا سا چوغہ پہنتے ہیں—اور ہمیشہ اپنے مریدوں میں گھرے ہوتے ہیں—

'ارے تب تو ملنا پڑے گا اس سے......'

ابّا جیسے یہی بہانہ تلاش کر رہے تھے۔

'آج وہ آئیں گے کسی وقت— میں آپ سے کچھ دریافت کرنا چاہتا تھا حکیم صاحب......؟'

ابّا نے ڈرتے ڈرتے زبان کھولی۔ اماں کی طرف دیکھا۔ اماں مسکرائیں—اب بھیّا سے پردہ کیسا—بلا جھجھک ان سے سب کچھ بتا دیجئے—بھیّا جو بھی مشورہ دیں گے وہ ہمارے حق میں ہوگا۔

'مشورہ......'اب چونکنے کی باری سفیان ماموں کی تھی......

'ہاں بھائی حکیم صاحب......'ابّا نے آنکھیں جھکا لیں۔

'تو پوچھئے—'

'اچھا...... یہ......آپ زمین کے نیچے کے بارے میں ......کیا جانتے ہیں......؟'ابا اپنے ہی سوال میں گڑبڑا گئے تھے۔

'زمین کے نیچے......ارے ایک دن اسی خمیر میں سو جانا ہے......بس۔ اور کیا جاننا ہے...... مسلمان ہوں— بحمد اللہ۔ مرنے سے گھبراتا نہیں—ہاں، نادرہ کو سوچ کر ترس آتا ہے......

ارے نہیں بھیّا— وہ زمین کے نیچے نہیں ......اماں کو ابّا پر غصہ آ رہا تھا......ارے پوچھئے نا......

'ارے وہ......زمین کے نیچے......'

'نیچے......'

’خزانہ......زمین کے نیچے جو خزانہ ہوتا ہے......‘ ابّا پھر گڑبڑا گئے تھے۔ کیا آپ مانتے ہیں حکیم صاحب......‘

’لو بھئی— اب یہ ماننے نہ ماننے سے کیا ہوتا ہے— سب تقدیر کے کھیل— اب ہوتا ہے کہ نہیں، ارے کیوں نہیں ہوتا ہے......آپ کو بتاؤں۔ پاکستان میں بھی یہ پیشہ خوب چمک رہا ہے۔ خزانے والا بھی خوش۔ اسے نکالنے والا بھی— سب کو پتہ نہیں ہوتا کہ خزانہ اگر ہے تو کہاں ہے سمجھے آپ وسیع بھائی— سفیان ماموں پورے جوش میں بول رہے تھے...... ویسے ایک بات ہے، یہ بھی حکمت کی طرح ہی ایک علم ہے۔ جیسے اچھے سے اچھے ڈاکٹر مرض کی تشخیص نہیں کر پاتے اُسی طرح اچھے اچھے عامل خزانے کا سراغ نہیں پا سکتے۔ میاں یہ دولت بھی کم لوگوں کے نصیب میں ہے۔ لیکن ایسے عالم یا عامل لوگوں کو یہ خزانہ خود ہی اپنی آواز سنا دیتا ہے۔ یعنی اُنہیں خود بہ خود گمشدہ خزانہ اپنے ہونے کا سراغ دے دیتا ہے۔ مگر ایک بات ہے وسیع بھائی۔ جیسے ہی سراغ ملے ویسے ہی کھدائی شروع کر دینی چاہئے۔ ورنہ آپ تو جانتے ہیں۔ دنیا گھومتی ہے...... ویسے ہی خزانہ بھی گھومتا رہتا ہے۔ پتہ نہیں ابھی یہاں ہے، گھومتا ہوا کب کہاں چلا جائے—

امّی کے چہرے پر فخر یہ احساس تھے۔ جیسے وہ بھیّا کی معلومات سے خوش ہوں— دیکھا— بھیّا کو سب معلوم ہے......‘

’بات معلوم ہونے کی نہیں ہے۔ معاملہ کیا ہے......‘ سفیان ماموں ابّا کی آنکھوں میں جھانک رہے تھے......

’ہاں کچھ ہے......‘ ابّا کو جھجک ہو رہی تھی۔

’اب آپ سے کیا چھپانا بھیّا۔ آپ کوئی غیر تھوڑے ہی ہیں۔ بلند حویلی کی بدحالی کی کہانی تو آپ دیکھ ہی رہے ہیں...... کل اور آج میں کتنا فرق آ گیا— آج نہ وہ لوگ نہ حویلی کی وہ شان باقی ہے— بس میت تیار ہے حویلی کی...... آؤ اور نماز جنازہ پڑھ لو......‘

ابّا کو امی کی یہ بات ناگوار نا گزری تھی......

’بھئی یہ بات سب جگہ ہے۔صرف ہندستان کو قصوروار کیوں ٹھہرایا جائے— چھوٹے، بڑے اور بڑے چھوٹے بن گئے— آزادی کی یہی سوغات ہے— ہم بڑے تھے۔اس لیے صرف حکم دینا جانتے تھے۔محنت اور مشقت سے واسطہ ہی نہیں تھا۔کسی نے بھی کبھی نہیں سوچا کہ ایک دن تو بادشاہت بھی ختم ہو جاتی ہے۔جاگیرداری چلی گئی تو کیا کریں گے۔اس لیے آزادی کے بعد وہی لوگ اٹھ رہے ہیں یا آگے بڑھ رہے ہیں جو ہمارے جاگیردارانہ نظام میں کولھو کے بیل بنے ہوئے تھے— سچ پوچھو تو آج اسی کولھو کے بیل کا زمانہ ہے— جاگیر سنبھالنے والے بس بیل پالنا جانتے تھے۔تیل نکالنا نہیں— ہاں، یہ تیل نکالنا بھی سیکھ گئے ہوتے تو آج کسی کی بھی یہ حالت نہ ہوتی......‘

’آپ ٹھیک کہتے ہیں حکیم صاحب......‘

ابّا کی آواز کانپ رہی تھی۔آپ ٹھیک کہتے ہیں۔بس یہی ہوا۔نئے نظام میں ہماری بولتی بند ہو گئی— ایک دن تو یہ ہونا ہی تھا— لیکن سوال ہے اب کیا کریں۔محنت نہیں کر سکتے۔پھر بچی کھچی جاگیریں ہی تو چاٹیں گے نا......

’آخر کب تک— جب یہ بچی کھچی جاگیریں بھی کھا جائیں گے تب......؟‘

’اسی لیے......‘ اماں اس بھیانک سچ سے مزید گزرنا نہیں چاہتی تھیں۔’کچھ دن پہلے مولوی محفوظ کا اس راستے سے گزرنا ہوا تھا......‘

’پھر......‘

’وہ حویلی میں آئے اور اُنھوں نے انکشاف کیا کہ یہاں خزانہ دفن ہے— پچھلے جمعہ کو اگر حالات خراب نہ ہوئے ہوتے تو کھدائی شروع ہو چکی ہوتی......‘

’لیکن اب تو حالات سازگار ہیں......‘

’ہاں—‘

’پھر؟ دیر کرنا مناسب نہیں بہن— ایسے تو خزانہ آپ کی بدقسمتی کا اعلان کر کے گھومتا ہوا

کہیں اور پہنچ جائے گا......'

'خدا نہ کرے......پھر کیا مشورہ ہے بھیّا—'

'آسان نہیں ہے— لیکن مشکل بھی نہیں ہے۔ جب دولت نے خود چل کر آپ کے دروازے پر دستک دی ہے تو ایک بار دیکھ لینے میں حرج ہی کیا ہے......'

اماں خوش تھیں— 'آپ نے سر سے بوجھ اتار دیا بھیّا۔'

'ارے بوجھ کیسا...... میں خود پاکستان میں ایسے کتنے ہی واقعات کا گواہ ہوں۔ ایسے کتنے ہی گھر، حویلیاں ہیں جو نئے سرے سے بننے کو آئیں تو پوچھو مت۔ جیب سے ایک پیسہ لگنے کی ضرورت نہیں پڑی— اندر خزانے دفن تھے۔ اور مفت میں کئی کئی منزلہ عمارتیں کھڑی ہوگئیں......اور میں ایسے عالموں کو بھی جانتا ہوں جو بیحد اللہ والے ہیں— اور جنہیں غیب سے علم ہو جاتا ہے کہ کہاں خزانہ دفن ہے...... یہاں آنے سے کچھ دن پہلے کی بات ہے۔ تب فرزانہ زندہ تھی۔ پڑوس میں ایک نیا گھر آباد ہوا تھا— میلاد کے لیے مولوی صاحب لائے گئے۔ مولوی صاحب نے آنکھیں بند کیں اور کہا— فلاں جگہ ایک بلّی دفن ہے— اس بلّی پر جادو کیا ہوا ہے......'

اماں کو حیرانی تھی— یا اللہ اب بلّی چوہے پر بھی جادو ہونے لگا......

'اور کیا— جادو کرنے والے تو سب سے پہلے پالتو جانوروں پر ہی ہاتھ صاف کرتے ہیں......'

'تو آپ کا فیصلہ ہے کہ مولوی محفوظ کو بلا کر کھدائی کا کام شروع کرا دینا چاہئے—' یہ ابّا تھے۔

'ہاں— اور اب مزید تاخیر نہیں ہونی چاہئے—'

●●

کھدائی کا راستہ اب صاف تھا—

اس دن دو پہر کے وقت مولوی محفوظ اپنے شاگردوں کے ساتھ آ گئے— سفیان ماموں کے گلے مل کر دونوں دیر تک روتے رہے— مولوی محفوظ کو اب اپنے بچھڑے دوست کا ساتھ مل گیا تھا...... یہ طے ہوا کہ دو دنوں کے بعد پھر جمعہ کی تاریخ ہے۔ اور اس دن یہ کام شروع ہو جائے گا......

حویلی اور ماضی کی کہانیاں زندہ تھیں—

ابّا اور سفیان ماموں کے ٹھہاکے گونج رہے تھے......

میرے لیے یہ سب نیا تھا۔ کتنی ہی بار چھت پر سوتے ہوئے ابّا نے طلسم ہوشربا کے افسانے سنائے تھے— جن اور پریوں کی سدا بہار کہانیاں— میں جیسے طلسم ہوشربا کا ایک کردار تھا۔ یا اس وقت گھر کے تمام افراد اس طلسمی دنیا کے کردار—

لیکن شاید وقت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

یا وقت کوئی اور ہی کہانی لکھنے جا رہا تھا—

(٦)

بڑے ماموں نے نادرہ کی اچھی تربیت کی تھی...... پڑوس کی مسجد سے اذان کی صدا بلند ہوتے ہی نادرہ سب کام چھوڑ کر وضوء بنانے لگ جاتی— نماز سے فارغ ہو کر پھر امی کے ساتھ باتیں کرنے میں اس کا سارا دن گزر جاتا— مگر اب آہستہ آہستہ وہ مجھ سے کھلنے لگی تھی۔ دودھ کا گلاس یا چائے لے کر میرے پاس آنا— کہتی کچھ نہیں— میرے کچھ پوچھنے پر بھی جواب نہیں دیتی۔ بس خاموشی سے میری طرف دیکھنا اور چلے جانا......

گرمیاں شروع ہو گئی تھیں—

صحن سے مرغیوں کے کڑکڑانے کی آواز آ رہی تھی۔ میں نے دیکھا، نادرہ مرغیوں کو دانہ ڈال رہی ہے۔ میں پاؤں دابے چلتا ہوا اس کے پاس آ کر ٹھہر گیا—

اس وقت صحن کے آس پاس کوئی نہ تھا— ابّا، سفیان ماموں کے ساتھ اپنے کمرے میں

تھے۔علی بخش اور مریم بوا بھی کام ختم کر کے آرام کرنے جا چکے تھے—یہ میرے لیے نادرہ سے گفتگو کا ایک اچھا بہانہ تھا—مرغیوں کو دانہ کھلاتی ہوئی وہ خود ایک بڑی سی خوبصورت مرغی میں تبدیل ہوگئی تھی۔

ککڑوں کوں......میں نے منہ سے آواز نکالی—

اس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا—مرغیوں کو دانہ کھلانا جاری رکھا۔

نادرہ......

ہونہہ......

مجھ سے باتیں کیوں نہیں کرتی......؟

بس نہیں کرتی......اُس کا خاموش سا جواب تھا۔

لیکن آج وہ پہلی بار کھلی تھی۔اور مجھے اس کے اس جواب نے بھی مطمئن کیا تھا۔

لیکن کیوں......؟

نہیں جانتی......

ارے ایسے کیسے،نہیں جانتی— کچھ تو وجہ ہوگی......

ہونہہ......

تمہیں پتہ بھی ہے۔میں تمہارا کتنا انتظار کررہا تھا۔مجھے معلوم تھا ایک دن تم ضرور آؤ گی۔

اس بار اس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا تھا۔

اور تم آ گئی......

ہاں......

اب میں تمہیں یہاں سے کہیں جانے نہیں دوں گا......

ارے اچھی زبردستی ہے۔

زبردستی ہے تو ہے— مگر تم یہاں سے کہیں جاؤ گی نہیں۔

کیوں؟

وہ دوپٹے والی، عقیدت سے نماز پڑھنے والی ننھی سی نادرہ کہیں کھوگئی تھی۔ اس وقت کوئی اور ہی نادرہ میرے سامنے تھی۔ میں اس کے ہونٹوں کو دیکھ رہا تھا— اس کے چہرے پر ایک خاص طرح کی شوخی تھی......

کیوں نہیں جانے دوگے؟

میری مرضی......

'مجھ پر مرضی ورضی نہیں چلنے والی— ہاں— کہے دیتی ہوں۔

مگر میری تو چلے گی......

نا......

چلے گی......میں مسکرا رہا تھا۔

مگر کیسے......

ایسے......اچانک میں نے اس کے ننھے سے ہاتھوں کو تھام لیا تھا۔ ہاتھوں میں پہنی ہوئی چوڑیاں کھنکھنائیں۔

چھوڑو......

نہیں......

چھوڑو......مجھے......

نہیں چھوڑتا......

مجھے یہ اندازہ کرنے میں پریشانی نہیں آئی کہ نادرہ کو اس وقت اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوئی جلد بازی نہیں تھی۔ اس کے نازک ہاتھ بے حد نرم تھے۔ لیکن اس کی نازک انگلیوں نے میرے جسم میں اچانک ایک طوفان برپا کر دیا تھا......

اس کی پلکیں جھکی تھیں۔

جسم کانپ رہا تھا— مرغیوں کو دانہ دینے والے ہاتھ اچانک گرم ہو گئے تھے—

اچھا...... مجھ سے بھاگتی کیوں تھی......؟

پہلے ہاتھ چھوڑو۔

پہلے بتاؤ......

پہلے ہاتھ......

میں نے ایک جھٹکے سے ہاتھ چھوڑ دیا......

وہ خوش تھی۔

بتاؤں......

ہاں......

ٹھینگا— اس نے انگلیوں کو حرکت دی اور صحن سے بھاگ کھڑی ہوئی۔

اچھا بچو— میری بلّی— مجھ سے ہی میاؤں......

میں اس کے پیچھے دوڑا......اور کچھ ہی قدموں کے فاصلے پر پیچھے سے اسے ادھر دبوچا......

اب وہ میری گرفت میں تھی۔ بلکہ میری بانہوں میں تھی— میں سارے جسم میں سنسناتے گرم خون کی یورش محسوس کر رہا تھا......

اس نے سپر ڈال دی تھی......

اب بھاگ کر کہاں جاؤ گی......

ہونہہ......

صحن میں سناٹا تھا— مرغیاں خاموش تھیں......میرا جسم اس کے جسم سے چپک کر رہ گیا تھا۔ نادرہ خاموش تھی— میں محسوس کر رہا تھا...... ننھے ننھے لاوے اس کے جسم کے اندر بھی مچل رہے ہوں گے......

کچھ دیر کے بعد اس نے خاموش احتجاج کیا......

اب چھوڑو......

میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا...... چلو میرے کمرے میں۔ تمہیں اپنی کتاب دکھاتا ہوں۔

نادرہ خوش تھی۔ اس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا۔ ہاتھ چھڑانے کی اسے اب ایسی کوئی جلد بازی بھی نہیں تھی۔

چلتے چلتے وہ ٹھہر گئی — غصے سے میری طرف دیکھا۔

لیکن تم ہو شیطان ایک نمبر کے — مجھے پتہ تھا......

دوسرے ہی لمحے وہ زور سے ہنس پڑی تھی۔ ہیرے جیسے خوش نما دانت سامنے آ گئے تھے......

شیطان کیسے؟

بس ہو شیطان......

اور تمہیں پتہ تھا؟

ہاں جی......

اور اسی لیے مجھ سے بات نہیں کر رہی تھی......؟

اور کیا — پکّے بدمعاش ہو تم......

مجھے نادرہ پر جی بھر کر پیار آ رہا تھا —

وہ دیر تک میری کتابوں کو دیکھتی رہی۔ کبھی وہ مسکراتی۔ کبھی ایک نوخیز سی شرارت خود بخود مجھے دیکھتے ہوئے اس کے ہونٹوں پر طلوع ہو جاتی —

کچھ دیر کے بعد امی جان نے اسے آواز دے کر بلا لیا تو وہ شرارت سے دیکھتی ہوئی امی جان کے پاس چلی گئی —

کتابیں بکھری ہوئی تھیں۔ ذہن میں ہلکے ہلکے دھماکے اب بھی موجود تھے۔ لیکن میں سوچنے سے قاصر تھا —

یہ سب کیا تھا—

نادرہ کی جھجک آخر کس لیے تھی......؟

یا پھر میری گرفت میں آتے ہی اس نے سپر کیوں ڈال دی......؟

لیکن جو بھی تھا، اس کے جانے کے باوجود ایک کسک، ایک چبھن بن کر، الاؤ کی طرح میرے سینے میں روشن تھا—

کمرے میں ابھی بھی اس کے ہونے کی خوشبو موجود تھی۔

میرا دل تیز تیز دھڑک رہا تھا......

اس وقت میں جس ذہنی اور جسمانی کیفیت سے گزر رہا تھا، اسے میں کوئی بھی نام دینے سے قاصر تھا—

یہ پہلا لمس تھا...... کسی لڑکی کا لمس...... جس نے میرے لیے انجانی دنیاؤں کے نئے دروازے کے کھول دیئے تھے......

جیسے میری خواہش تھی۔ میں وقت کو اپنی مٹھیوں میں قید کرلوں اور نادرہ بس میری گرفت، میری بانہوں میں سما جاتی—

اور سچ یہ ہے کہ اچانک مجھے یہ زندگی بیحد جگمگاتی اور بیحد خوبصورت لگنے لگی تھی—

●●

(۷)

رات کے دس بجے مولوی محفوظ، اسلم میاں، غنی اور کامران کے ساتھ چوروں کی طرح اندر داخل ہوئے۔ اس وقت بھی ان کے حلیے سے یہی لگ رہا تھا جیسے پیچھے چور یا ڈاکو پڑ گئے ہوں۔ شہر کی گلیاں اندھیرے میں ڈوب گئی تھیں— سڑکیں سنسنان— دو گھنٹے تک ادھر اُدھر کی

باتیں چلتی رہیں۔ پھر بارہ بجے کے آس پاس محفوظ میاں، قافلے کے ساتھ صحن میں آ گئے۔ پورے دو گھنٹے تک اس کے لیے پوری تیاری کی گئی تھی۔ ان کے تینوں شاگرد اس طرح تیار تھے جیسے جنگ کے میدان میں فتح کے ارادے سے اترنے والے ہوں— علی بخش اور سفیان ماموں بھی اس کھدائی کی مہم کا حصہ تھے۔ عورتوں کو باتیں نہ کرنے کی ہدایت کی گئی تھی— اور بچوں کے لیے یہ حکم جاری ہوا تھا کہ وہ جتنی جلد سو جائیں بہتر ہوگا—

لیکن میری آنکھوں میں نیند کہاں...... کچھ یہی حال اس وقت نادرہ کا تھا— ہم دونوں اس تماشہ کا حصہ بننا چاہتے تھے مگر ابا اور سفیان ماموں کی ناراضگی کا ڈر تھا— اس لیے چھت کی منڈیر پر میں نادرہ کے ساتھ چھپ کر یہ تماشہ دیکھ رہا تھا— اس وقت رات کے اندھیرے میں نادرہ کا ساتھ میرے اندر وہی انگارے جمع کر رہا تھا— میں اس پر جھک گیا تھا— اس کی پشت میری جانب تھی۔ میرا جسم اس کے جسم سے خاموش سرگوشیاں کر رہا تھا۔ نادرہ نے دو ایک بار پلٹ کر میری طرف دیکھا لیکن میں اسے یہی احساس دلاتا رہا کہ میں اس تماشہ کا ایک حصہ ہوں۔ اور اس کی طرح ہی چھپ کر یہ منظر دیکھ رہا ہوں۔

میری کنپٹیاں سرخ ہوگئی تھیں۔ رگیں تن گئی تھیں۔ جانے کیوں احساس ہوا، اس کے معصوم جسم سے اس وقت آگ کی بارش ہو رہی ہو......

نیچے تماشہ شروع ہو چکا تھا۔ علی بخش کے ہاتھ میں پھاوڑہ تھا۔ ابّا بے چینی کی حالت میں ٹہل رہے تھے۔ اماں، مریم بوا کے ساتھ صحن کے دوسری طرف دروازے سے لگ کر یہ منظر دیکھ رہی تھی— مولوی محفوظ کی حیثیت اس وقت جہاز کے کپتان کی تھی— انہوں نے آسمان کی طرف دیکھا— دعا پڑھی اور حکم ہوا—

'کھدائی شروع کی جائے—'

پھاوڑے چلنے شروع ہو گئے— اور ادھر ابّا کی بے چینی بڑھ گئی— وہ بار بار سر کھجلاتے ہوئے صحن میں ادھر اُدھر دیکھ رہے تھے...... کہیں کوئی دیکھ تو نہیں رہا ہے۔ کبھی گھبرائے ہوئے

دروازے کے پاس آتے— کبھی صحن سے اٹھنے والی کھدائی کی آواز کو سنتے اور سوچتے...... کہیں یہ آواز باہر تو نہیں جارہی ہے......

علی بخش جوش میں تھے۔

ابّا نے سمجھایا— اتنی زور سے کھدائی کروگے تو آواز باہر تک چلی جائے گی۔

غنی میاں مسکرائے— کھدائی بچوں کا کام نہیں ہے۔اس وقت یہ آواز کہیں نہیں جانے والی—

کامران میاں بھی مسکرائے— آپ فکر نہ کریں۔بہتر ہے کہ ہمیں کام کرنے دیں اور آپ جاکر آرام کریں—

مولوی محفوظ کو بھی یہ بات پسند آئی تھی— وسیع بھائی— یوں بھی آپ کا دل بیحد کمزور ہے۔آپ آرام کیجئے۔ہم باری باری سے پو پھٹنے تک اس کارروائی کو جاری رکھیں گے۔

سفیان ماموں پن ڈبّے سے پان کی گلوریاں بنا کر منہ میں ڈال چکے تھے۔' جایئے۔آپ آرام کیجئے— گمشدہ خزانے کی تلاش آسان نہیں ہے وسیع بھائی— ابھی تو شروعات ہے۔ابھی تو ہفتوں لگیں گے۔پاری بدل بدل کر ہمیں اس کھدائی کو انجام دینا ہوگا'

'ارے بھائی، ہم جتنا آسان سمجھ رہے تھے...... ابّا کہتے ہوئے رک گئے—

'دنیا میں کون سا کام آسان ہے وسیع بھائی؟ ایمان سے کہیے گا۔جینا بھی کوئی آسان کام ہے کیا۔لیکن دیکھئے— پھر بھی ہم سب جیئے جارہے ہیں۔اپنے ہمیں چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔لیکن زندگی کا سفر جاری رہتا ہے......'

'لیکن یہ آواز باہر گئی تو آفت آجائے گی......'

'کوئی آواز باہر نہیں جائے گی۔' یہ غنی میاں تھے—

'ہم نے اس سے پہلے بھی خزانے نکالے ہیں......' یہ کامران تھے— اور کامران میاں کی بات پر ابّا چونک اٹھے تھے......

’آپ نے پہلے بھی......‘

’ہاں......اور کیا......پہلی بار کوئی تجربہ تھوڑے ہی کر رہے ہیں۔ یقین نہ آئے تو پیرومرشد سے پوچھ لیجئے— انہی کا حکم ہوتا ہے اور ہم جہاں راستہ بلاتا ہے، وہاں چلے جاتے ہیں—‘

مولوی محفوظ مسکرا رہے تھے......

ابّا نے اطمینان کی سانس لی۔ شکر ہے— ورنہ میں تو سمجھ رہا تھا— یہ پہلا تجربہ ہے جو میرے گھر کیا جا رہا ہے......

مولوی محفوظ ہنس پڑے— آپ بھی کیسی باتیں کرتے ہیں محفوظ بھائی۔ اور تجربہ کیسا— ہم تو اب اس تجربے کے عادی ہو گئے ہیں......

’اوہ......‘ ابّا کی آنکھیں نیند سے بوجھل تھیں......تو میں سونے جاؤں؟

’بالکل جایئے— اور گھوڑے بیچ کر......‘

’اب گھوڑے کہاں ہیں...... بھائی......‘

’خزانہ مل گیا تو ایک کیا، سو گھوڑے آجائیں گے۔ اب جایئے وسیع بھائی—‘

علی بخش تھک چکے تھے۔ اب غنی نے کھدائی کی کمان سنبھال لی تھی......

مریم بوا اور اماں سونے کے لیے جا چکی تھیں— ابّا بھی اٹھ کر چلے گئے—

میں نادرہ کو اب بھی بانہوں کے دائرے میں لیے تھا......اور وہ مجھ میں سمٹی ہوئی یہ سارا تماشہ دیکھنے مصروف تھی۔ مجھے احساس تھا کہ اس کی آنکھیں بھی بوجھل ہوں گی۔ عام طور پر وہ جلدی سو جانے کی عادی تھی۔ مگر شاید......اس وقت نیلے آسمان اور تاروں کی برات کے نیچے، کھلی چھت پر اسے میری ضرورت تھی......میری بانہوں کی۔

’نیند تو نہیں آرہی ہے......‘

آرہی ہے......

پھر چلو تمہیں سلا دوں......

تم سلاؤ گے؟......

ہاں کیوں نہیں......

پھر میں سو نہیں پاؤں گی۔

اچھا— دیکھنے میں کیا حرج ہے۔ نہیں سوئی تو باتیں کریں گے۔ چھت پر چار پائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ ابّا، امی کے ساتھ نیچے والے کمرے میں سونے چلے گئے تھے۔ سفیان ماموں نے ابّا والی چار پائی پر قبضہ کرلیا تھا—

نادرہ اور میں پاس پاس چار پائیوں پر لیٹ گئے۔ ابھی بھی اس کی نازک ہتھیلیاں میری ہتھیلیوں کی گرفت میں تھیں...... میں آہستہ آہستہ اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا......

وہ کسی اور دنیا میں گم تھی......

’تم جانتے ہو رحمٰن...... مجھے امی ہر وقت یاد آتی ہیں۔ لیکن ابو کی وجہ سے بول نہیں پاتی...... آنکھوں آنکھوں میں سارے آنسو پی جانا پڑتا ہے۔ لوگ کیوں چلے جاتے ہیں رحمٰن......؟ ایک دن سب کو جانا ہے...... ہے نا......؟ زندگی کے کھیل تماشے چلتے رہتے ہیں۔ پھر ایک دن یہ آنکھیں ہمیشہ کے لیے موند جاتی ہیں۔ میں نماز پڑھتی ہوں...... اس لیے نہیں کہ مجھے نماز میں اپنے لیے کوئی دعا مانگنی ہوتی ہے...... میں امی کو دیکھتی ہوں۔ دعا کے لیے ہاتھ اٹھتے ہی امی کا چہرہ میری آنکھوں کے آگے ہوتا ہے۔ میں ان سے ڈھیر ساری باتیں کرتی ہوں......‘

نادرہ کی آنکھوں میں مچلتے آنسوؤں کو میں نے دیکھ لیا تھا۔ مجھے اس پر ترس سے زیادہ پیار آرہا تھا— خدا کیوں اپنوں کو چھین لیتا ہے؟ یہ کیسی آزمائش ہوتی ہے؟ کیسا امتحان......؟

میں نے نادرہ کے آنسو پوچھے......

’یہاں تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی......‘

’جانتی ہوں...... وہ دیکھو...... اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ نیلے آسمان میں جگمگاتے تاروں کے درمیان سب سے چمکتا ستارہ......‘

وہ مسکراتی ہوئی میری طرف مڑی — بدھو...... وہی تو ہیں میری امی جان۔

●●

کھدائی کی آواز اب صاف صاف سنائی دے رہی تھی...... ابّا دوبارہ بستر سے اٹھ کر صحن میں آ گئے تھے۔

نادرہ کو نیند آ گئی تھی...... میں پھر منڈیر پر چلا آیا......

اب پھاوڑا سفیان ماموں کے ہاتھ میں تھا۔ غنی اور کامران کرسیوں پر آرام کر رہے تھے...... بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ ان کے سر ڈھلک چکے تھے۔ مولوی محفوظ، سفیان ماموں کو چھیڑ رہے تھے۔

ارے تم تو بالکل نہیں بدلے سفیان......

اور تم پیر پگاڑو — تم بھی تو نہیں بدلے......

کوئی نہیں بدلتا — صرف وقت بدل جاتا ہے — یہ ابّا تھے......

رات کے تین سے زیادہ بج چکے تھے۔

باہر کتّے اب بھی رہ رہ کر بھونک رہے تھے......

لیکن اب میری آنکھیں بھی بوجھل ہونے لگی تھیں......

●●

تین دن گزر گئے تھے۔

کھدائی کا کام بدستور جاری تھا۔ دو دن مولوی محفوظ نہیں آئے — اپنے بدلے تینوں شاگردوں کو بھیج دیا۔ صبح ہونے سے پہلے ہی کھدائی کے کام کو روک دیا جاتا — اور کھدائی والی جگہ پر لکڑی کی کانتی والی بڑی سی ٹوکری لا کر رکھ دی جاتی — تین دنوں میں کوئی خاص کھدائی نہیں ہو پائی

تھی۔اس کی وجہ تھی......شک اور خوف کے دائرے میں رہتے ہوئے اس کام کو انجام دینا— سب سے پہلا ڈر تو یہی تھا کہ آس پاس والے نہ جاگ جائیں۔نظر محمد کی کوٹھی بھی قریب میں تھی۔اس لیے حتی الامکان اس بات کی کوشش کی جاتی کہ خاموشی کے ساتھ کھدائی کا کام چلتا رہے۔ چاہے ایک ہفتہ کی جگہ ایک مہینہ لگ جائے— رات کے اس تماشہ نے مجھے اور نادرہ کو کچھ زیادہ ہی قریب کر دیا تھا۔اب اس کی جھجک بہت حد تک مٹ چکی تھی۔ میں اکثر تنہائی پا کر، یا رات کے سناٹے میں اس کے اردگرد اپنی بانہیں حمائل کر دیتا۔اور وہ اطمینان سے میری بانہوں میں سمٹ جاتی......

چوتھے دن اسکول میں بہت دنوں بعد نور محمد سے میری ملاقات ہوئی— مجھے ایسا لگا جیسے وہ خود بھی مجھ سے ملنے کے لیے بے تاب ہو— جبکہ حقیقت یہ تھی کہ کئی دنوں سے وہ مجھ سے ملتے ہوئے کنّی کاٹتا رہا تھا— جب سے صحن میں امی نے اسے ڈانٹ پلائی تھی، اس نے مجھ سے ملنا ہی بند کر دیا تھا—

نور محمد کی امی کے بارے میں اطلاعات مسلسل ملتی رہتی تھی......مولوی محفوظ کے آنے کا ایک فائدہ یہ بھی تھا کہ نظر محمد کے گھر کی ساری معلومات ان سے مل جاتی تھی......

نور محمد مجھے کچھ بیمار سا نظر آیا......

وہ کئی دنوں بعد ملا تھا، اس لیے میں خود بھی اس کی خیریت جاننے کو بے چین تھا— وہ بجھا ہوا تھا— اس کی امی کی حالت اب غیر ہونے لگی تھی۔اس نے بتایا کہ اس کے ابّا کی صحت بھی دنوں دن خراب ہوتی جا رہی ہے۔لیکن شاید وہ کسی اور مدعا پر آنے کے لیے اپنے پر تول رہا تھا— اور آخر اس نے انکشاف کر ہی دیا......

ایک بات پوچھوں......

ہاں......

شاہ جنّات تمہارے یہاں تو نہیں چلے گئے......؟

کیوں؟ میں ایک دم سناٹے میں تھا......

تمہارے گھر سے رات گئے آوازیں آتی ہیں......

آوازیں......؟

ہاں...... یہ آواز ابو نے بھی سنی ہے......

اور......؟

نہیں جانتا۔ مگر...... شی' اس نے ہونٹ پر انگلی رکھ کر کہا—— ٹھیک بارہ بجے کے بعد آواز آنی شروع ہو جاتی ہے......

'مگر کیسی آواز......؟'

میرا دل رہ رہ کر کانپ رہا تھا......

'جیسے تمہارے گھر میں زلزلہ آ گیا ہو...... یہ ابّا بتا رہے تھے......'

'زلزلہ...... ہاں...... ابّا بتا رہے تھے کہ جیسے بہت سے بھوت مل کر تمہارے گھر کو ہلانے کی کوشش کر رہے ہوں......'

'ارے نہیں، میں زور سے ہنسا—— تمہارے ابّا کا وہم ہے۔ میرے گھر کوئی جنات شاہ جنات نہیں ہیں۔ اور ہاں یہ زلزلے کی کہانی صرف وہم ہے—— آجکل ہم لوگ دیر میں سوتے ہیں......

کیوں——

میں نے اسے بتایا—— اس لیے کہ پاکستان سے سفیان ماموں اور ان کی بیٹی آئے ہوئے ہیں—— ہم لوگ دیر تک چھت پر باتیں کرتے ہیں۔ تمہارے ابو کو وہم ہو رہا ہوگا—— اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو کیا ہمیں پتہ نہیں چلتی......

'ہاں یہ تو ہے......'

'ہو سکتا ہے تمہارے ابو نے ہماری گفتگو کی آواز سنی ہو......'

'ہے...... وہ ہنسا—— گفتگو کرنے سے کہیں مکان ہلتا ہے۔ زلزلہ آتا ہے۔ ابّا نے

تمہارے گھر کو ہلتے ہوئے دیکھا ہے۔ اس لیے میں نے پوچھا...... ورنہ مجھے کیا ضرورت پڑی تھی......'

'اپنے ابّا سے کہہ دینا......ایسی کوئی بات نہیں ہے......'

مگر نور محمد اپنی بات پر قائم تھا— 'لیکن تمہارے گھر سے آوازیں آتی ہیں— ایک دن رات میں مجھے نیند نہیں آ رہی تھی...... میں کوٹھی کے چھت پر چڑھا تو تمہارے گھر سے ہی کچھ ٹوٹنے کی آوازیں آ رہی تھیں......' نور محمد پھسپھسا کر بولا— اب چھت پر مت سونا۔ ارے شاہ جنات جب میری کوٹھی آ سکتے ہیں تو بلند حویلی کیوں نہیں جا سکتے—؟ فاصلہ ہی کتنا ہے۔ سمجھے گئے نا......'

●●

اس دن نور محمد تو چلا گیا مگر اس کی گفتگو سن کر میں پریشان ہو گیا— میں نے گھر آ کر یہ باتیں امی جان اور ابّا کو بتائیں تو دونوں پریشان ہو گئے......

'لو...... باتیں بننے لگیں نا......

اب کیا ہو گا— اماں کے چہرے پر فکر کے آثار تھے......

یہ محلے والے نا......بس انہیں اسی بات سے مطلب رہتا ہے کہ فلاں کے گھر میں کیا ہو رہا ہے—

اماں کو گھبراہٹ تھی۔ نظر محمد کو بھنک بھی لگ گئی تو سارے شہر میں بلند حویلی کی تھوتھو ہو جائے گی۔

'لیکن ان لوگوں کی زبان کون بند کرے......؟'

'افواہوں کے سر پیر نہیں ہوتے...... اور افواہیں جنگل کی آگ ہوتی ہیں......' اماں کی آنکھوں میں الجھن کے آثار تھے۔ نظر محمد کو جانتی ہوں— وہ چپ رہنے والوں میں سے نہیں ہیں۔ یقیناً وہ بلند حویلی کے بارے میں خاموش نہیں رہے گا— اگر ذرا بھی انہیں ایسی کسی سچائی کا علم ہوا تو

وہ محلے بھر میں ڈھنڈھورا پیٹ دیں گے......

'لیکن کیا کیا جائے—' یہ ابّا تھے—

'نظر محمد کی زبان بھی تو بند نہیں کی جاسکتی۔ سب حویلی کے دشمن ہیں— ہماری خوشی کسی سے برداشت نہیں ہوتی......'

'اب چپ بھی ہو جاؤ۔ سوچنا یہ ہے کہ اگر نظر محمد کو یہ بات معلوم ہوئی ہے تو یہ پتہ لگانا ضروری ہے کہ اس کے دل میں کیا ہے— اور یہ بات مولوی محفوظ ہی پتہ لگا سکتے ہیں۔'

'پھر ان سے کہیے— کسی طرح وہ اپنی دعا یا جادو سے نظر محمد کے دماغ پر قابو پانے کی کوشش کریں۔'

ابّا کے لیے اب یہی راستہ بچا تھا— کیونکہ بات اب بلند حویلی کی عزت کی آ گئی تھی—

●●

گھر والوں کو سب سے بڑا خطرہ علی بخش سے تھا اس لیے کہ ان سے اچھی یا بری کوئی بھی بات ہضم نہیں ہوتی تھی۔ مگر جنات والا پتّہ اپنا کام کر گیا تھا اور وہ اسے ثواب کا کام سمجھ کر خاموش تھا۔ یا کہنا چاہئے ڈرا ہوا تھا......اور مجھے اس بات کا کئی بار احساس کرا چکا تھا......

'دیکھیے......ہم نے کہیں بھی اس کا ذکر نہیں کیا؟'

'بڑی بہادری کی آپ نے—'

'ارے رحمٰن بابو صحت سے بڑھ کر کوئی چیز ہے کیا—' وہ پھسپھسا کر بولے— اور جنات سے کس کو ڈر نہیں لگتا۔ ہم تو گاؤں میں بھوت پریت کے بڑے بڑے کارنامے دیکھ چکے ہیں—'

'اور اسی لیے آپ ڈر گئے ہیں......'

'لو...... بابو کی سنو......علی بخش زور سے ہنسے......جن بھوت سے کون نہیں ڈرتا۔ ارے پہلوانوں کو بھی ڈر لگتا ہے۔ پھر ہم تو انسان ٹھہرے......'

●●

ابّا کو حویلی اور حویلی کی عزت کی فکر ہو رہی تھی— کہیں ایسا نہ ہو کہ خزانہ بھی نہ ملے اور حویلی بھی بدنام ہو جائے— صبح ہوتے ہی گھر میں بیٹھک جم گئی—

سفیان ماموں کا خیال تھا...... کسی نے آگ لگائی ہے۔ ورنہ ہم اتنے آرام سے کھدائی کر رہے تھے کہ آواز باہر جانے کا سوال ہی نہیں......'

'پھر وہ نظر محمد اور اس کے بیٹے کی بات......؟'

'وہی تو کہہ رہا ہوں......کوئی مخبر ہے— کسی نے یہاں کی خبر باہر پہنچائی ہے۔'

اتنا کہہ کر وہ مریم بوا اور علی بخش کی طرف گھوم گئے۔ پھر ان کی تیز نظریں کافی دیر تک میری آنکھوں میں اپنے شک کا ازالہ کرتی رہیں......

کوئی تو ہے...... یہ بات باہر نہیں جا سکتی تھی......'

لیکن کون ہو سکتا ہے......؟ ابّا کا لہجہ کمزور تھا......

'کوئی بھی— علی بخش، مریم بوا یا پھر...... وہ میری طرف گھوم گئے...... رحمٰن میاں بھی۔ اسی لیے ایسی باتوں کو چھپانے کی کوشش کی جاتی ہے۔'

'تم بھی کمال کرتے ہو بھیّا، یہ اماں تھیں— اتنی بڑی کھدائی...... کیا یہ بات چھپی رہ سکتی تھی......؟'

اسلم میاں، غنی اور کامران کیوں نہیں؟ ابّا نے پلٹ کر سفیان ماموں کو دیکھا— یہ لوگ بھی تو کسی سے ذکر کر سکتے ہیں۔ مولوی محفوظ نہیں کر سکتے مگر یہ تو ان کے شاگرد ہیں۔ کیا پتہ چائے پان کھاتے ہوئے زبان پھسل گئی ہو—'

'ہاں، یہ بھی ممکن ہے......سفیان ماموں نے سینے پر جھولتے دانت کھدوا کو ہاتھوں میں لیا اور دانت کھودنے لگے......

'مگر اب کیا کیا جائے— میری تو عقل کام نہیں کرتی—' ابّا نے سہمے ہوئے لہجے میں

پوچھا......

'کیا کھدائی کا کام کچھ دنوں کے لیے روک دیا جائے......؟' امّاں کے لہجہ میں تھرتھراہٹ تھی......

بالکل بھی نہیں......

کیوں......؟

بدنامی ہونے لگی تو......؟ ابّا ایک بار پھر کھدائی روک دینے کی وکالت کررہے تھے......

'دیکھئے— تقدیر ہر کسی کے لیے زندگی میں دروازہ نہیں کھولتی— بس ایک موقع دیتی ہے۔اور آپ کے پاس جیتنے ہارنے کے لیے یہی ایک موقع ہے۔اور میری مانئے تو افواہوں کا کوئی علاج نہیں— آپ کسی کا قتل نہیں کررہے ہیں۔کسی کے یہاں چوری یا ڈکیتی نہیں ڈال رہے ہیں— جو کچھ کررہے ہیں وہ اپنے گھر میں کررہے ہیں—اور یہ کوئی جرم نہیں ہے—ابھی خزانے کو جانے دیجئے،صرف یہ سوچئے کہ یہ آپ کا گھر ہے—اور آپ کوئی ناجائز نہیں کررہے ہیں تو پھر خوف کیسا......؟

سفیان ماموں کی بات میں وزن تھا—

'بھیّا ٹھیک کہہ رہے ہیں—' اماں مطمئن تھیں۔

'پھر ٹھیک ہے۔مولوی محفوظ کو آنے دو—دیکھو، وہ کیا خبر لےکر آتے ہیں......

سفیان ماموں دانت کھودنے کے بعد صحن میں الٹی رکھی ہوئی لوہے کی بالٹی پر بیٹھ گئے۔

'ویسے وسیع بھائی—پاکستان میں ایسے ایسے کنگالوں کو جانتا ہوں جنھوں نے کبھی روپے کا منہ تک نہیں دیکھا تھا— لیکن واہ رے گمشدہ خزانے......راتوں رات دنیا بدل گئی—اللہ جب دیتا ہے تو چھپڑ پھاڑ کر دیتا ہے......اس کی لاٹھی میں آواز نہیں......'

گفتگو جاری تھی......

میں اپنے کمرے میں آ گیا— شاید اب ان تمام واقعات کا تجزیہ میرے لیے آسان

تھا— ایک مشکل زندگی کو ایک آس، ایک امید لے کر ہم کتنا آسان بنا دیتے ہیں— مجھے اس بات کا احساس تھا کہ دنیا کے پنکھ لگ گئے ہیں۔ آزادی کے بعد ملک میں بھی کامیابی اور ترقی کی خوشگوار ہوا نے دستک دی ہے۔ لیکن مجھے اس بات کا بھی احساس تھا کہ ترقی کی یہ ہوا اپنے ساتھ توہمات اور اندھ وشواس کو بھی ساتھ لے کر آئی ہے......اور—

انسانوں سے زیادہ آج کا انسان بھوت پریت اور جناتوں کے ساتھ زندگی بسر کرنے لگا ہے—

●●

(۸)

ہمیشہ کی طرح مولوی محفوظ اپنے شاگردوں کے ساتھ آئے۔ لیکن آج ان پر وجد کی کیفیت تھی......وہ سب کی باتیں سن چکے تھے......لیکن آج ان کا موڈ کچھا کھڑا اکھڑا تھا......

'پھر کھدائی بند کر دیجئے......'

اماں نے پلٹ کر ابّا کو دیکھا......

'نہیں میرا مطلب ہے......'

'افواہوں سے کب تک پیچھا چھڑائیں گے۔ چھت پر ایک لڑکا لڑکی جاتے ہیں تب بھی کہانیاں بنتی ہیں— کسی کو کہانی بنانے سے روک پائیں گے آپ— محلے میں رہتے ہیں— جائیے محلے والوں کی پیٹھ پیچھے کی باتیں سنیے— اسی، آپ کی بلند حویلی کو لے کر کیسی کیسی باتیں کی جاتی ہیں۔ لوگ مذاق اڑاتے ہیں کہ کاردار خاندان کا زوال آ گیا— اب کیا حویلی لے کر چاٹیں گے— یہ وہی لوگ ہیں جو آپ کے سامنے آنے پر مہذب بن جاتے ہوں گے— مگر پیٹھ پیچھے— کس کس کی زبان بند کریں گے......نظر محمد تو پھر بھی شریف ہے— وہ آپ لوگوں کی کبھی

برائی نہیں کرتا......مگر حبیب صاحب......وہ فرقان میاں، وہ بڑے پھاٹک کے نواب ذوالفقار......'

اچھا......ابّا سکتے میں تھے......

'ان کی بھی تو جاگیریں چھن گئیں— چھن کیا گئیں ضبط ہو گئیں۔ یہ کون سا آسمان پر محل بنا رہے ہیں— اماں اپنے رنگ میں واپس آ گئی تھیں— بس لے دے کر بلند حویلی پر نظریں گڑائے بیٹھے ہیں......'

'ٹھیک کہا بہن......'

مولوی محفوظ نے ٹھنڈی سانس بھری— اسی لیے محلے والوں کی چھوڑیئے۔ انہیں افواہیں پھیلانے دیجئے اور آپ خاموشی سے اپنا کام انجام دیجئے......'

'کیا آپ نظر محمد سے ملے......؟' ابا نے دبی زبان میں پوچھا......

'ہاں ملا— پاگل ہے— کہہ رہا تھا، حویلی رات میں ہل رہی تھی۔ میں نے سمجھا دیا— حویلی نہیں تم ہل رہے تھے۔ تم بھی آسیبی اثرات میں ہو— رات کے وقت جاگنے اور چھت پر جانے کے لیے کس نے کہا— جاؤ گے تو پھر مجھے مت کہنا......'

'اچھا......' سفیان ماموں ہنسے......واہ پیر پگاڑو— تم تو استاد نکلے یار......'

'کیا کروں سفیان بابو۔ ادھر کے تار اُدھر نہ جوڑوں تو یہی لوگ زندگی حرام کر دیں۔ اب دیکھئے آسیب کی بات سن کر چپ ہے۔ کہنے لگا، میں بھی کچھ دنوں سے پوربی ہوا محسوس کر رہا ہوں......'

پھر؟ اماں کی آنکھوں میں چمک تھی—

'میں نے کہہ دیا— میں جو کر رہا ہوں اسے کرنے دو— کیونکہ اب تمہاری اہلیہ کے ساتھ تمہارے سحر کو بھی ہٹانا ہو گا۔ اس لیے آپ لوگ...... میں پھر کہے دیتا ہوں، افواہوں سے دور رہئے— ورنہ میں خود کھدائی کو روک دوں گا......'

یہ دھمکی تھی یا وارننگ، لیکن ابّا کے ساتھ امی بھی سکتے میں آ گئی تھیں۔

●●

آسیب، جادو، خزانہ — ترقی کے راستے میں اب میرے سامنے یہ جادونگری تھی — ہر شئے گم تھی...... صرف جادو زندہ تھا۔

سفیان ماموں بتا رہے تھے کہ دنیا کا کوئی بھی جادوگر سورہ بقر کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ جس گھر میں اس کی تلاوت ہو وہاں شیطان داخل نہیں ہو سکتے۔

ابّا بتا رہے تھے — وہ پہلے ان جادو وادو کو نہیں مانتے تھے۔ میں پہلے یہی سمجھتا آیا تھا کہ یہ سب ڈھونگی ہیں۔ نجومی ہوں یا کہانت، ان کا دھندہ لوگوں کو بیوقوف بنانا ہے۔ ہر آدمی مشکل میں ہوتا ہے — اور اس لیے آسانی سے ان کا شکار ہو جاتا ہے......'

سفیان ماموں دل کھول کر ہنسے...... 'ہاں وسیع بھائی — آپ کی بات میں کچھ تو صداقت ہے۔ بہت سے ایسے نجومی ہیں جو علم نجوم کے بارے میں بالکل بھی نہیں جانتے اور محض لوگوں کو بیوقوف بناتے ہیں۔ لیکن یہ بات سب کے بارے میں نہیں کہی جا سکتی۔ حدیث شریف میں ہے کہ ایسے بہت سے نجومی ہیں جن کے شیطانوں سے رابطے ہیں۔ اور یہ رابطے اس طرح ہیں کہ ایک جن شیطان پر دوسرا جن شیطان کھڑا ہے۔ دوسرے پر تیسرا — اس طرح یہ آسمان کی بلندیوں تک ایک دوسرے کو کندھا دیتے ہوئے پہنچ جاتے ہیں — اور سچی بات کہ آسمان میں بھی شگاف ہے — کچھ ایسے شگاف ہیں جہاں سے یہ شیطان فرشتوں کی باتیں سن لیتے ہیں اور پھر نجومی کو اس کی اطلاع دے دیتے ہیں۔ جب آخری نبیؐ کی ولادت ہوئی تو یہ شگاف بند کر دیئے گئے —'

'لیکن اب زمین کا یہ شگاف کھل گیا ہے —'

ابّا ہنس رہے تھے۔ ابا کا اشارہ گمشدہ خزانے اور کھدائی کی طرف تھا —

سفیان ماموں بھی زور زور سے ہنسنے لگے —

●●

ایک جادو نگری تھی — یہ حویلی......

ایک جادوگر تھا...... مولوی محفوظ......

اور ایک جادو کا ڈبہ...... یہ گمشدہ خزانہ......

میری تنہائی مجھے ڈس رہی تھی...... عمر کا گھوڑا سرپٹ ہوا میں بھاگ رہا تھا۔ میرے جسم کو خوشبو مل گئی تھی...... اور یہ خوشبو اب لذتوں کے لباس میں گم ہونا چاہتی تھی......

میرا جسم شور کرنے لگا تھا......

اور میں شور کرتے جسم کی آواز میں قید تھا......

دنیا اچانک نشیلی ہو گئی تھی...... نیلا آسمان، پیڑ پودے...... سرسراتی ہوا...... کسی کا لمس......

ایک جادو وہاں تھا اور ایک جادو یہاں ہولے ہولے میرے جسم میں اترتا ہوا......

میں اور نادرہ شاید دونوں ہی ایک دوسرے کے لیے تنہائی چاہتے تھے — میرے چھت پر جاتے ہی وہ بھی چھت پر پہنچ جاتی — یا پھر ہم دونوں گھر والوں کی نگاہوں سے بچتے ہوئے ایسی جگہوں کو تلاش کر لیتے جہاں کسی کے آنے کا امکان نہ ہو......

پھر میں اسے گود میں لے لیتا...... یا وہ خود ہی میری گود میں سمٹ آتی...... میں ہولے ہولے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتا۔ کبھی کبھی اس کے پیارے سے گال کو سہلا دیتا یا پھر...... لیکن شاید ابھی تک اس سے زیادہ آگے بڑھنے کا احساس یا حوصلہ مجھ میں پیدا نہیں ہوا تھا —

وہ ایک پیارے سے میمنے کی طرح میری گود میں سمٹ آتی...... یقیناً اسے میرے جسم کی تپش کا بھی احساس ہوگا، مگر وہ ظاہر نہیں کرتی تھی......

میں انگارے سنبھال رہا تھا......

اور شاید آہستہ آہستہ اب یہ انگارے مجھے جلانے لگے تھے —

●●

کھدائی دوبارہ شروع ہوگئی تھی......لیکن اب میرے لیے یہ تماشہ بے مزہ ہو چکا تھا...... میں نئے سوالوں کی زد میں تھا......شاید یہ ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے۔ بڑھتی عمر ہر بار نئے سوالوں کے بادبان کھول دیتی ہے......اور اب ان سوالوں کو شیئر کرنے کے لیے نادرہ کا ساتھ تھا۔ عمر میں چھوٹی ہوتے ہوئے بھی وہ غور سے میری باتوں کو سنتی تھی— میرے لیے اچھی بات یہ تھی کہ میں اپنے طور پر سوچ کے پل صراط سے گزرنے لگا تھا— میں دیمک کھاتی حویلی اور ماضی کے قصوں سے خود کو نکالتے ہوئے اپنے راستے تلاش کر رہا تھا اور شاید اسی لیے کھدائی کے ان چند دنوں میں، میں خزانے کے ساتھ نفرت کا بوجھ بھی ڈھو رہا تھا......

میری عمر اپنی فکر کے ساتھ مجھ میں سانس لے رہی تھی......جیسے میں نے پہلی بار نادرہ سے پوچھا تھا......

'تم بتا سکتی ہو— آنے والے وقت میں میرا کیریئر کیسا ہوگا؟' نادرہ ناسمجھوں کی طرح میری طرف دیکھ رہی تھی......

'کیسا ہوگا میرا مستقبل......؟ نادرہ......مجھ میں میری عمر جاگنے لگی ہے اور یہ بڑھتی عمر اب مجھ سے سوال پر سوال کیے جاتی ہے۔ حویلی کا مستقبل کیا ہے اور تمہارا مستقبل؟ یہاں آج بھی اس حویلی کے لوگ پرانی دیمکوں کو چاٹ رہے ہیں— میں حویلی میں روز آنے والے ملاقاتیوں کو دیکھتا ہوں......سب ایک زمانے کے بگڑے نواب یا جاگیردار— لیکن آج......؟ ان سب کے پاس کوئی آج نہیں ہے— ان کی زندگی ایک گھر سے دوسرے گھر گھومتے ہوئے ختم ہو جاتی ہے۔ سڑکوں پر آوارہ گردی— صبح اٹھتے ہی یہ اپنا ٹھکانہ چھوڑ کر دوسرے کا قیمتی وقت ضائع کرنے پہنچ جاتے ہیں— ان لوگوں کے پاس وقت ہی وقت ہے نادرہ......لیکن وقت بدل رہا ہے......اور میں اس بدلتے وقت کی آہٹ کو محسوس کر رہا ہوں— کیا تم بھی میری طرح اس بدلتے وقت کی آہٹ کو محسوس کر رہی ہو......؟'

نادرہ خاموش تھی......'تمہاری کچھ باتیں سمجھ میں نہیں آتیں— لیکن اتنا جانتی ہوں کہ

ابھی سب سے ضروری کام پڑھنا ہے......اتنا کیوں سوچتے ہو...... بولو......؟'

میں اس کی کانپتی ہتھیلیوں کو سہلا رہا تھا......

'کیونکہ سوچنا پڑتا ہے نادرہ— ان کے دن گزر گئے— ہمارے شروع ہو رہے ہیں— ان کے پاس جاگیریں تھیں— ہمارے پاس حویلی کا ڈھانچہ— ان کے پاس کرنے کو کچھ نہیں تھا— ہمارے پاس کرنے کو بہت کچھ ہے اور اندھیرا— اور...... مجھے اندھیرے سے ڈر لگتا ہے......'

'میں ہوں نا......'

وہ مجھ سے لپٹ گئی تھی......

میں ایک بار پھر اس کے نوخیز جسم کے سحر میں گم تھا......

●●

کافی کھدائی ہو چکی تھی......

مولوی محفوظ کو یقین تھا کہ ایک دو روز میں اتنی جگہ بن جائے گی کہ ایک آدمی اس گڈھے میں داخل ہو سکے......لیکن ابھی تک کچھ بھی برآمد نہیں ہوا تھا— ہاں پچھلی رات ٹھن...... سے آواز آئی تھی تو سب چونک پڑے تھے......مولوی محفوظ اور ان کے ساتھیوں کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی— مگر ایک چھوٹے سے لوہے کے ٹکڑے کے سوا کچھ بھی برآمد نہ ہو سکا۔

دراصل پھاوڑے کا تیز لوہے والا حصہ، ایک لوہے کے چھوٹے سے ٹکرے سے ٹکرایا تھا اور ٹھن سے آواز ہوئی تھی......

جیسے جیسے زمین گہری اور گہری ہوتی جا رہی تھی، سب کی آنکھوں کی نیند اڑنے لگی تھی...... سب کسی معجزہ کے انتظار میں تھے......

پو پھٹنے سے پہلے' اندھیرے میں ہی کھدائی بند کر دی جاتی اور مولوی محفوظ اور ان کے ساتھی اس خیال سے بھاگ کھڑے ہوتے کہ کوئی اُنہیں دیکھ نہ لے—

لیکن کھدائی کے ساتھ ساتھ خزانہ ملنے کی امید بھی بڑھتی جارہی تھی......

●●

(۹)

محلے کی حویلی اور کوٹھیوں کے دروازے، گھوم گھوم کر پھیری کرنے والی عورتوں کے لیے کھلے تھے۔اس سے ان حویلی اور کوٹھیوں میں رہنے والیوں کو بھی آسانی ہو جاتی۔ پردہ کا نظام تھا— دادا مرحوم کے وقت تک تو پالکی کا رواج تھا— مگر پالکیوں کے دن لد گئے تھے— لیکن عورتیں زبردست پردہ کیا کرتی تھیں۔اس لیے پھیری لگانے والی عورتوں سے مرد بھی خوش رہتے تھے کہ چلو اب خواہ مخواہ عورتوں کو بازار کا رخ نہیں کرنا پڑے گا— اب یہ پھیری لگانے والیاں دراصل ایسے خاندانوں کے لیے ایک جانا پہنچانا نام بن گئی تھیں— اس لیے ان کے آنے پر نہ صرف گھر کی عورتیں خوش ہو جاتیں بلکہ اُنہیں عزت دے کر انہیں چائے بھی پلائی جاتی— ایسی کتنی ہی عورتیں تھیں۔ایک بولن بوا تھیں— عمر ۶۰ کے آس پاس...... جھک کر چلتی تھیں۔سفید ساڑی پہنتی تھیں۔ مین گیٹ سے ہی آواز لگاتیں— بوبو...... بولن آئی ہے......

بولن بوا کے ساتھ ایک جوان لڑکا ہمیشہ ہوتا تھا جو کپڑوں کا تھان اٹھائے رہتا تھا— بولن بوا کے آتے ہی مریم بوا تک اپنا کام چھوڑ کر آجاتیں— پھر کپڑوں کے تھان کھلتے— ساڑیاں...... شلوار جمپر......گھر میں بچھانے کی چادریں......توشک، جازم......تکیہ غلاف......

بولن بوا تھان کھول کر آرام سے چوکی پر بیٹھ جاتیں۔ پھر گھنٹوں ان کپڑوں کو لے کر پسند کرنے اور قیمت طے کرنے کی کارروائی چلتی رہتی—

اسی طرح جمیلہ تھیں— نازک سی— عمر پینتس کے آس پاس— دبلی پتلی— وہ نان خطائی اور کباب لے کر آتی تھی۔وہ بھی دروازے سے چلاتی......نان خطائی......

ابّا نان خطائی کے شوقین تھے اور کباب کے بھی— بھلا گھر میں کباب لگانے کی کتنی الجھنیں تھیں۔ جمیلہ کے آتے ہی آٹھ۔دس سیخ کباب تو اسی وقت چٹ ہو جاتے— مگر ہر بار جمیلہ کو کوسہ جاتا......

'ارے...... یہ کوئی کباب ہے— سیخ لو اور منہ میں ڈال دو...... ٹھگتی ہو تم......'

اماں کی بات پر جمیلہ ناک بھوں چڑھاتی...... اب دس پیسے کی کتنی بڑی سیخ آئے گی بو بو......تم بھی کمال کرتی ہو بو بو...... ذرا گوشت کے دام تو دیکھو، کتنے چڑھ گئے ہیں—

'خاک چڑھے ہیں— ہاں تمہارے دام ہر بار چڑھ جاتے ہیں۔' لیکن جمیلہ امی کی بات کا برا نہیں مانتی تھی—

اسی طرح ایک مچھلیا تھی، جو ہمیشہ مچھلی لے کر آتی تھی اور اسی لیے اس کا نام ہی پڑ گیا تھا مچھلیا— زیادہ عمر نہیں تھی مگر جسم بے ڈول— وہ آتی تو بک بک کر کے سب کا جینا دوبھر کر دیتی— اسی طرح دہی والی، پھل پھول بیچنے والی بسمتیا— مہینے میں ایک بار شہد...... تازہ تازہ شہد لے کر آنے والی فجیلن—

یہ سب اماں کے کلائنٹ تھے اور ساتھ ہی علی بخش کے بھی۔علی بخش کی ان پھیری کرنے والی عورتوں سے خوب بنتی تھی۔ یہ پھیری کرنے والیاں محلے کے ہر گھر میں جاتی تھیں— اور کہتے ہیں ان پھیری کرنے والیوں سے ہی گھر کی خبریں بھی ایک گھر سے دوسرے گھر پہنچ جایا کرتی تھیں...... کس کا بیٹا پاس ہوا— کس کی بیٹی کا کس سے عشق چل رہا ہے۔کس گھر میں فاقہ ہے۔کس گھر میں پلاؤ کی خوشبو اڑی— بڑی سے بڑی اور چھوٹی سے چھوٹی باتوں تک یہ پھیری والیاں، کان بھرنے میں خوشی محسوس کیا کرتیں—

اس میں قصور گھر والوں کا بھی ہوتا— خرید فروخت تو اپنی جگہ ہوتی لیکن مقصد آس پاس کے گھروں کی تاک جھانک بھی ہوتی۔اماں اور مریم بوا ان پھیری والیوں سے سب کچھ اگلوا لینا اپنا اپنا فرض سمجھتی تھیں—

نظر محمد کے یہاں کیا ہو رہا ہے؟

ان کی بیوی پر کیا سچ مچ جنوں کا سایہ ہے؟ یا کوئی اور بات ہے؟ کہیں کوئی دوسرا چکر وکّر تو نہیں......؟

فلاں نواب صاحب آج کل فلاں جگہ جاتے ہیں یا نہیں — یا پھر — بھولا میاں کو ۹واں بچہ ہوا ہے — دیکھو اس بڑھاپے میں بھی بچہ پیدا کیے جارہے ہیں —

اور جو گھر کی عورتیں نہ پوچھ پاتیں وہ علی بخش پوچھ لیتے...... 'سنا فلاں کی لڑکی کی آنکھ مٹکائیاں چل رہی ہیں......'

'فلاں کی لڑکی دورات باہر رہنے کے بعد واپس آئی...... اللہ — اب یہ محلّہ رہنے کے لائق نہیں رہا......'

'فلاں کی بیٹی کے رنگ ڈھنگ تو دیکھو — ماں باپ پر حکم چلاتی ہے۔ برا ہو اس نئی تہذیب کا......'

لیکن خود کو سب سے زیادہ سمجھدار ٹھہرانے والے علی بخش بس ایک دن چوک گئے اور یہ چوک اُنہیں مہنگی پڑی۔

بازار سے سامان لاتے ہوئے کہیں جمیلہ مل گئی — وہ پڑوس کے کسی گھر سے نکلی تھی کہ علی بخش مل گئے — سوال جواب کا تبادلہ ہوا اور جمیلہ نے پوچھ ہی لیا......

میاں سچ بتانا...... جھوٹ بالکل نہیں —

اللہ قسم — بالکل سچ بولوں گا — مگر بات کیا ہے۔

حویلی میں سب ٹھیک ہے نا......؟

لو، اب حویلی کو کیا ہوگا......

کہیں کچھ گڑبڑ تو نہیں......؟

'ارے بلند حویلی ہے، مرا ہوا ہاتھی بھی سوا لاکھ کا — اب بھلا حویلی میں کیسی گڑبڑ

ہوگئی......

لیکن جمیلہ بھی کہاں چوکنے والی تھی۔

’ارے تم تو خدمتگار ہو— تمہیں کیا پتہ— ان بڑے بڑے گھروں میں سب کچھ ہوتا ہے جو ہمیں نہیں پتہ ہوتا— جتنی بڑی حویلی— اُتنا بڑا چھید— یہی تو زمانے کا مزاج ہے—‘

علی بخش کو غصہ آ گیا— بلند حویلی کے بارے میں کبھی بھی، کسی سے بھی وہ غلط بات برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ وہ کہتے بھی تھے۔ یہیں آنکھیں کھولیں— حویلی کا نمک کھایا— نمک حرامی کیسے کر سکتا ہوں— اس لیے جمیلہ کی بات سن کر علی بخش برہم ہو گئے—

’دوسری جگہ ہوتا ہوگا لیکن حویلی میں برے کام نہیں ہوتے— حویلی بڑی ہے تو دل بھی بڑا ہے......‘

’بڑے دل میں چھید نہیں ہوتا کیا......؟‘

— ہوتا ہوگا— لیکن یہاں چھید نہیں— بڑے بابو تو بادشاہ آدمی ہیں— اور بوبو کو سارے زمانے کی فکر رہتی ہے۔ ہاں کہے دیتا ہوں— حویلی کے بارے میں کوئی بری بات نہیں—

جمیلہ نے ترپ کا پتہ چلا— ارے تم تو برا مان گئے علی بخش— میں کیا حویلی کی دشمن ہوں— میرا تو خود حویلی سے آنا جانا لگا رہتا ہے۔ لیکن کیا بتاؤں......

کہہ کر وہ ایک لمحے کے لیے رکی، جیسے اپنی آدھی بات کا اثر علی بخش کے چہرے پر دیکھنے کی خواہش مند ہو—

علی بخش کے چہرے پر جھلاّہٹ تھی—

’لیکن کیا— جو ہوا ہے یا سنا ہے وہ بتاؤ......‘

اب جو زبان کٹ کے گر جائے......‘

’ارے نہیں— ایسی کیا بات ہوگئی......‘

جمیلہ نے سر سے ٹوکری اتاری اور دو گرم نان خطائی علی بخش کی طرف بڑھائی— علی بخش

نے مال مفت کو لینے میں ذرا بھی جھجک نہیں دکھائی۔ نان خطائی کے اندر جاتے ہی ان کا غصہ بھی اڑن چھو ہو چکا تھا......

علی بخش خوش تھے...... نان خطائی بھی کمال کی چیز ہے — منہ کے اندر جاتے ہی گھل جاتی ہے......'

'اب بتائیے — میں حویلی کی دشمن ہوں یا......' جمیلہ نے اپنا پانسہ چل دیا......

'ارے — تم دشمن کیسے ہوسکتی ہو — تمہیں آج سے جانتا ہوں۔ تم ہمیشہ حویلی کی بہتری چاہتی ہو......'

'وہی تو...... جمیلہ کے لہجے میں اداسی تھی — لیکن اس بات کو تم کہاں سمجھتے ہو علی بخش — بھلا کوئی حویلی کی برائی کرے اور مجھے پسند آئے......'

'حویلی کی برائی؟ بھلا حویلی کی برائی کرنے کی کس میں ہمت ہے......؟'

'اب ہمت اپنے پاس رکھو — کیا کوئی کسی کی زبان کو روک سکا ہے — جتنے منہ اتنی باتیں — لیکن کہے دیتی ہوں آج کل سب سے زیادہ باتیں تمہاری حویلی کو لے کر ہو رہی ہیں......'

'میری حویلی کو......؟' علی بخش کا سینہ چوڑا ہو گیا — مگر میں بھی تو سنوں — آخر کس قسم کی باتیں کی جا رہی ہیں میری حویلی کو لے کر......'

'نہ سنو تو بہتر ہے — ناراض ہو جاؤ گے —'

'ارے نہیں —'

'لیکن خبردار — کسی سے کہنا مت —' جمیلہ نے پھسپھساتے ہوئے کہا۔

'خبر ہے کہ تمہاری حویلی میں کچھ چکّر چل رہا ہے......'

'چکر......؟'

'ارے بدھو — یہ میں تھوڑے ہی کہہ رہی ہوں — لوگ کہہ رہے ہیں — سارے محلے میں چرچا ہے کہ رات گئے اس حویلی سے ٹھک ٹھک کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ اب بولو......اور وہ

نظر محمد بھی کہہ رہے تھے......'

وہ نظر محمد......ہی ہی......ہی......'

علی بخش جی کھول کر ہنسے اور یہیں غلطی کر گئے— جمیلہ کو اپنا سمجھ کر کھدائی کی بات بتادی— ساتھ ہی یہ لقمہ بھی جوڑ دیا کہ کسی سے کہیو مت—اور یہ کام تو ہم نظر محمد کی اہلیہ کو بچانے کے لیے کر رہے ہیں......'

'اچھا میں چلی......'

جمیلہ نے دوبارہ ٹوکری سر پر رکھ لیا۔

'ارے سنو تو......'

لیکن جمیلہ اب کہاں رکنے والی تھی۔ مفت میں سارے محلے والوں کو بتانے کے لیے اسے ایک بے حد قیمتی خبر ہاتھ لگ گئی تھی۔

اور علی بخش کو یہ دھیان نہیں تھا کہ جانے انجانے ان سے کتنی بڑی غلطی سرزد ہو چکی ہے—

لیکن تیر کمان سے نکل چکا تھا......

●●

(۱۰)

حویلی میں چلنے والی کارروائی کی خبر جنگل کی آگ کی طرح چاروں طرف پھیل گئی— محلے کی گلی سے دس قدم آگے شاہ جی کا تکیہ تھا۔ تکیے کے آخری متولی کے انتقال کے بعد اس تکیے کو ختم کر دیا گیا— کیونکہ کچھ ایسے لوگ تکیے پر قابض ہونے کے لیے سوچ رہے تھے جو کردار کے اچھے نہیں تھے— وہاں نشہ کیا جانے لگا اور شاہ جی کا تکیہ دیکھتے ہی دیکھتے اوباشی کا اڈہ بن گیا— اب اس اطراف میں چائے اور پان کی دو ایک دکانیں کھل گئیں— دوپہر سفیان ماموں پان کھانے گئے تو

محلے کے نوجوانوں میں حویلی کا ہی چرچا تھا— وہ دوڑے دوڑے گھر پہنچے—

’غضب ہو گیا— بات تو سارے محلے میں پھیل گئی— ‘

’اب کیا ہوگا— ‘اماں نے فوراً جانماز بچھالیا—

ابا پریشانی کے عالم میں ٹہل رہے تھے...... مجھے معلوم تھا...... ایک دن یہ ہوکر رہے گا۔ لیکن یہاں میری سنتا کون ہے......‘

’اب اسے چھوڑیئے وسیع بھائی اور یہ سوچئے کہ آگے کیا کرنا ہے۔ محلے میں بدنامی ہو رہی ہے— ‘

ابھی یہ گفتگو چل رہی تھی کہ دروازے پر دستک پڑی...... کسی نے آواز لگائی— بھیّا،

ابا کے کان کھڑے ہو گئے— ارے یہ تو نظر محمد کی آواز ہے۔ اب کون سی آفت آ گئی— یا اللہ اپنی امان میں رکھیو......

ابا، سفیان ماموں کے ساتھ باہر آئے تو نظر محمد کی تیوریاں چڑھی ہوئی دیکھیں— وہ کافی غصے میں تھے۔

’میرے ایک سفید کاغذ مانگنے سے آپ ناراض ہو گئے تھے اور آپ اب کیا کر رہے ہیں؟ کہیے کوئی جواب ہے آپ کے پاس...... سارے محلے میں اس بات کی خبر اڑ چکی ہے کہ آپ کے یہاں میری کوٹھی کے نام پر جادوئی کارروائی کی جا رہی ہے......‘

ابا سناٹے میں تھے— آنکھوں کے آگے پردہ چھا گیا تھا۔

سفیان ماموں نے انہیں سنبھالا— وسیع بھائی...... سنبھل کے......‘

’میرے گھر میں کیا ہو رہا ہے اس سے آپ کو کیا مطلب ہے؟ اور یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ مولوی محفوظ آپ کا ساتھ دے رہے ہیں۔ میرے اتنے پیسے خرچ کرانے کے بعد وہ اب الٹا توڑ میری کوٹھی کے نام کر رہے ہیں......‘

’ارے نہیں— نظر محمد۔ آپ غلط سمجھ رہے ہیں......‘ ابا کا لہجہ کمزور تھا—

'غلط سمجھ رہے ہیں یا جب آپ کا پول کھل گیا ہے تو آپ سکتے میں آ گئے —— ارے میری بیوی تو پہلے سے ہی اتنی بیمار ہے۔ اب کیا اس کی جان لے کر چھوڑیں گے آپ……؟

پردہ میں اماں اور مریم بوا نظر محمد کی غصے بھری آواز سن کر کانپ گئی تھیں —— ایک طرف اماں سے لپٹی ہوئی نادرہ تھی……

'اب آپ کی بولتی کیوں بند ہوگئی —— ' نظر محمد کا لہجہ تیکھا تھا —— ہم کریں تو ناجائز۔ آپ کریں تو جائز —— ہم بھی کوٹھی والے ہیں۔ ہم بھی آپ سے کوئی کم نہیں ہیں —— لیکن آج —— آج آپ کی اوقات سامنے تو آ گئی —— میں تو مولوی محفوظ کا انتظار کر رہا ہوں —— اس بار وہ سامنے تو آئے۔ خرچ ہوئے اک ایک پیسے کا حساب نہ لے لیا تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا —— '

نظر محمد جانے کے لیے مڑے پھر ٹھہر گئے —— اور ہاں —— آئندہ کے لیے یہ کارروائی بند کر دیجئے —— میں آپ اور آپ کے خاندان کی عزت کرتا ہوں۔ اس عزت کو قائم رکھیے —— بس اتنا ہی کہنے آیا تھا……'

نظر محمد چلے گئے ——

ابا کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے —— وہ گہرے سناٹے میں تھے……سفیان ماموں نے انہیں آہستہ سے ہلایا ——

'وسیع بھائی —— بلا ٹل گئی —— خود کو سنبھالیے —— زندگی میں یہ سب ہوتا ہے وسیع بھائی —— اب ان جاہلوں کو کون سمجھائے کہ ہم کیا کرنے والے تھے……'

مگر ابّا دروازے کو تھامے ہوئے بت بن گئے تھے۔ جیسے جسم میں خون کا ایک بھی قطرہ نہ ہو —— سارا جسم پتھر —— سفیان ماموں انہیں سہارا دے کر دالان میں لائے۔ حکم ہوا ——

'نادرہ —— ایک گلاس پانی لے کر آؤ……'

نادرہ پانی لے کر آئی تو ابّا نے منع کر دیا —— آنسو آنکھوں میں خشک ہو چکے تھے۔ کافی دیر تک خاموش رہے……

پھر آہستہ سے بڑبڑائے— آج اس نے انتقام لے لیا حکیم صاحب— بلند حویلی کی عزت کو تھپڑ مار کر گیا ہے— تقدیر کو یہی دن دکھانا منظور تھا......'

سفیان ماموں کا گلہ بھی بھر آیا تھا— 'وسیع بھائی، یہ بدلے ہوئے زمانے کا دستور ہے۔ یہ ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے اور ہمیشہ ہوتا رہے گا— بڑی سے بڑی حکومتیں ختم ہو جاتی ہیں۔ قدرت اپنا کھیل دکھاتی رہتی ہے وسیع بھائی— کبھی کسی نے سوچا تھا کہ مغلیہ شاہی خاندان کو بھی زوال آجائے گا اور اس خاندان کے ایک وارث بہادر شاہ ظفر کو نصیب کے سوآنسو بہانے پڑیں گے۔ لیکن یہی تقدیر کا لکھا ہے وسیع بھائی اور ایک دن اس آگ میں سب کو جلنا پڑتا ہے—

اماں رو رہی تھیں......

نادرہ سہمی ہوئی ایک کونے میں کھڑی تھی......

ابا کے آنسو خشک ہو چکے تھے......لیکن ابّا اس حقیقت سے واقف نہیں تھے کہ ابھی یہ تماشہ کچھ اور رنگ بھی دکھانے والا ہے—

●●

شام ۵ بجے دروازے پر تھاپ پڑی اور سارا گھر جیسے لرز کر رہ گیا—

کوتوالی تھانے سے انسپکٹر آیا تھا۔ انسپکٹر کے منہ میں پان دبا ہوا تھا— اماں نے سفیان ماموں کو باہر نہیں آنے دیا۔ کیا پتہ، کوتوالی کا انسپکٹر سفیان ماموں سے کچھ اور نہ اگلوا لے۔ ویسے بھی ہندستان پاکستان کے رشتے تو ہمیشہ شک سے دیکھے جاتے رہے ہیں—

انسپکٹر کی تیوریاں چڑھی ہوئی تھیں......

تو آپ ہی وسیع الرحمٰن کاردار ہیں......

'جی ہاں......'

'آپ کی حویلی کا تو بڑا نام ہے۔ لیکن یہ کیا سننے میں آ رہا ہے؟

ابّا نے مسکرانے کی کوشش کی — کیا سننے میں آ رہا ہے......؟

کوتوالی کے انسپکٹر کو یونیفارم میں دیکھ کر محلے کے دو ایک لوگ جٹنے لگے تھے۔ ابّا نے پردہ کر لیجئے کی آواز لگائی — پھر انسپکٹر سے کہا —

'باہر بات کرنا مناسب نہیں ہے۔ آپ اندر تشریف لایئے۔'

'ٹھیک ہے —'

پان چباتا ہوا انسپکٹر ابا کے ساتھ اندر آ گیا — ابّا اسے لے کر مردان خانے میں آ گئے —

'چائے پئیں گے یا......'

'کچھ بھی......' انسپکٹر کرسی پر بیٹھتا ہوا مردان خانے کو چور نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ یہ بھی ایک عالیشان کمرہ تھا — پرانے زمانے کے صوفے پڑے تھے — دیوار پر شیر کی کھال، حویلی کی آن بان اور شان کی گواہی دے رہی تھی — چھت کافی اونچی تھی......اور ایک پرانا ہنڈولہ اس سے جھول رہا تھا — انسپکٹر پر حویلی کے رکھ رکھاؤ کا اثر تھا — وہ دیر تک آنکھیں نچا نچا کر کمرے کی ایک ایک شے کو اپنی نگاہوں میں اتارتا رہا — ابا نے نفیس چاندی کا اگالدان بڑھایا — انسپکٹر نے پان کی پیک تھوکی — پھر ابّا سے بولا......

'آپ تو خاندانی آدمی ہیں......آپ جانتے ہیں کچھ دن پہلے شہر کی فضا خراب ہو گئی تھی۔ ہمیں اک ایک بات کا خیال رکھنا پڑتا ہے — آپ سمجھ سکتے ہیں......

چائے آ گئی تھی۔ انسپکٹر نے گلاس میں پانی لے کر اگالدان میں کلی کیا۔ چائے کے ساتھ ناشتے کا جائزہ لیا۔ سموسہ، گلاب جامن....بسکٹ اور چائے — اس نے گلاب جامن اٹھایا — منہ میں ڈالا — مسکرایا۔

'لذیذ ہیں —' وہ آہستہ آہستہ سر ہلا رہا تھا — آپ جانتے ہیں ہمارا محکمہ کتنا سخت ہے۔ کوئی بھی شکایت آ جائے تو ہمیں موقعۂ واردات پر پہنچنا پڑتا ہے......'

موقعۂ واردات......ابّا کے الفاظ کانپ رہے تھے۔

انسپکٹر ہنسا— گھبرایئے مت— اب ہم آگئے ہیں نا......، اس نے دوسرا گلاب جامن بھی منہ کے حوالے کیا— اب آپ کا کوئی بال بھی بانکا نہیں کر سکتا...... ہم کس لیے ہیں— اور ایک بات بتادوں کاردار صاحب— ہم سے کوئی پنگا بھی نہیں لیتا— بانکنے بہاری نام ہے— اس کوتوالی میں دس سال سے ہوں— مجال ہے کوئی کچھ کر کے نگل جائے— ہم کس لیے ہیں مگر...... وہ پچھلے دنوں محلّہ شیخاں میں جو ہوا، برا ہوا— نہیں ہونا چاہیئے تھا— ساری ساری رات ہماری ڈیوٹی لگ گئی— اب شہر میں ٹینشن ہو تو کس کی ڈیوٹی لگے گی؟ ہماری ہی لگے گی نا کاردار صاحب......

ناشتے کی پلیٹ خالی ہوگئی تھی۔ اس نے چائے کا گلاس تھام لیا......

’آپ کیا کرتے ہیں......؟ سوال کرتے ہوئے وہ زور سے ہنسا...... ارے خاندانی آدمی کچھ کرتے کہاں ہیں۔ حویلی ہے— زمین جائیداد ہوگی— کھیت بدھار ہوں گے۔ کرنا تو آپ کے بعد کی پیڑھی کو ہوگا— کیوں کاردار صاحب— آپ لوگوں کی تو چاندی تھی— کٹ گئی— اب بچوں کی باری ہے......‘

گرم چائے ایک ہی سانس میں خالی کر کے انسپکٹر بانکے بہاری نے ٹیبل پر رکھ دیا—

’خبر ملی تھی کہ آپ کے یہاں کچھ ناجائز کارروائی چل رہی ہے۔ ہمیں رپورٹ تو دینی ہوگی— بتایئے یہاں کیا چل رہا تھا؟

’کچھ بھی نہیں......‘ ابّا نے مسکرانے کی کوشش کی۔

’کچھ تو چل ہی رہا ہوگا کاردار صاحب— رائی ہو تبھی پہاڑ بنتا ہے...... آپ کچھ چھپانے کی کوشش کر رہے ہیں— اب محلے والے بتا رہے تھے کہ رات کے وقت آپ کے گھر سے آوازیں آتی ہیں...... آخر ایسا کیا ہے، جس کی وجہ سے سارا محلّہ آپ سر پر اٹھائے ہیں......‘

’کچھ بھی ایسا نہیں ہے— آپ دیکھ سکتے ہیں......‘

’وہ تو ہم دیکھیں گے ہی— لیکن بہتر یہ ہے کہ آپ ہی اپنے منہ سے بتا دیجیے......

ناشتہ کرنے اور چائے پینے کے باوجود انسپکٹر بانکے بہاری وہ جاننے کی ضد کر رہا تھا، جسے ابّا کسی بھی حال میں بتانے کو تیار نہیں تھا......

'ارے بتایئے — ہمارا وقت بہت قیمتی ہے۔ آخر ایسا کون سا کام تھا جو رات کے وقت ہو سکتا تھا، دن کے وقت نہیں......'

'کچھ بھی نہیں —'

'دیکھئے آپ شریف آدمی ہیں۔ لیکن آپ کا چہرہ بتا رہا ہے کہ کچھ نہ کچھ بات ضرور ہے —' انسپکٹر ہنسا — رات میں مکان بنوا رہے تھے؟

'نہیں —'

وہ تو حویلی کی دیواروں کو دیکھتے ہوئے ہی لگتا ہے۔ مکان بناتے تو بالو اور سیمنٹ نظر آتا — اور مکان بنانے کے لیے مزدور رات میں نہیں ملتے — کچھ تو ناجائز کر رہے تھے آپ......'

ابا کی آواز بھرا گئی تھی — آپ یقین مانیے — کس منہ سے سمجھاؤں آپ کو۔ ہم ایسا کچھ بھی نہیں کر رہے تھے جو غیر قانونی ہو اور ناجائز ہو۔ ہم ایسا کچھ کر بھی نہیں سکتے......

بانکے بہاری کی آواز سرد اور تیکھی تھی۔ 'ایسا سب کہتے ہیں۔ کوئی اپنے آپ کو چور یا مجرم کہتا ہے کیا؟ بولیے......'

چور...... مجرم......؟ ابّا سناٹے میں تھے —

'کوئی نہیں کہتا — آزادی کے بعد تو سینکڑوں غلط کام ہو رہے ہیں اور کون کر رہا ہے، کیا ہم نہیں جانتے۔ جاگیریں چھن گئیں۔ حویلیاں نیلام ہو گئیں — کل کے نواب راجے مہاراجے، زمین پر آ گئے تو عزت بچانے کے لیے کچھ بھی کرنے لگے...... یہ حویلی بھی کتنی پرانی ہے — دیواریں دیکھئے — انسپکٹر نے انگلیوں سے دیوار کو چھوتے ہوئے کیا — چونا جھڑ گیا — دیواریں کمزور ہو گئیں — کچھ تو گڑبڑ ہے — ہم آ گئے ہیں تو پتہ کر ہی لیں گے۔ مگر ہم آپ کے منہ سے سچ سچ سننا چاہتے ہیں......'

ابا کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا تھا— انسپکٹر غور سے ابّا کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔

’ کچھ نہیں تھا تو یہ محلے والے پاگل ہیں— ذرا باہر جایئے......سب یہی بول رہے ہیں۔ حویلی میں کچھ گڑبڑ چل رہا ہے— آپ سمجھتے نہیں، ہمیں رپورٹ دینی ہوتی ہے— باہر جائیں گے تو ہم سے بھی یہی پوچھا جائے گا— اس بار اس کا لہجہ سخت تھا— کاردار صاحب— لاسٹ وارننگ— بتا دیجئے— یہاں کیا ہو رہا تھا—‘

’اب بہت ہو چکا تھا— ابّا کے صبر کا باندھ ٹوٹ گیا تھا— ’کیا جاننا چاہتے ہیں آپ؟ یا محلے والے......ہمیں چین سے جینے بھی نہیں دیا جاتا— اگر جاگیردارانہ نظام میں پیدا ہونے کا قصور ہے تو ہم مجرم ہیں— چور ہیں— یہ ہم بھی جانتے ہیں کہ زمانہ ایک جیسا نہیں رہتا— تقدیر اپنے کھیل کھیلتی رہتی ہے— لیکن ہم بھی کیا کریں کبھی کبھی مجبوریاں، نہ ختم ہونے والی ذلت بن کر ہمارے راستے میں کھڑی ہو جاتی ہیں—‘

اس سے پہلے کہ انسپکٹر کوئی سوال کرے، ابا نے روک دیا— جیب میں ہاتھ ڈالا— کچھ پیسے تھے— پیسے نکالے......انسپکٹر کے ہاتھ میں دیا— میں نہیں جانتا کہ یہ صحیح ہے یا غلط، لیکن اسے رکھ لیجئے—‘

ابّا کی آواز میں ٹھہراؤ تھا— انسپکٹر نے خاموشی سے پیسے لیے— اور جیب کے حوالے کر دیجئے—

اب آیئے میرے ساتھ...... میں آپ کو سب کچھ بتاتا ہوں— اور بالکل سچ— سچ کے سوا کچھ نہیں— پردہ کر لیجئے......‘

ابا کی تیز آواز گونجی—

میں ابا کے پیچھے تھا— سہا ہوا— سانس تیز تیز چل رہی تھی— بدن میں لرزش تھی مگر اس کے باوجود میں وہ سب اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا تھا، جو ابّا بتانا چاہتے تھے......

اندر پردہ ہوگیا—

مردان خانے سے نکل کر ابّا انسپکٹر کے ساتھ صحن میں آئے— انسپکٹر کو اشارہ کیا— اور لکڑی کے سیکچوں سے بنی ٹوکری ہٹادی گئی—

'یہ...... اپنی قبر کھود رہا تھا— لوگ تو اپنے مرنے کے بعد قبر میں دفن ہوتے ہیں۔ قبر بھی گورکن کھودتے ہیں۔ لیکن میں، وسیع احمد کاردار، ولد سمیع احمد کاردار...... کاردار خانان کا یہ بدنصیب وارث، اس آزاد ہندستان میں بدنصیب حویلی کی میت اٹھاتے اٹھاتے اتنا تھک گیا کہ خود اپنے ہاتھوں سے اپنی قبر کھودنے لگا...... اگر اپنی زندگی میں اپنی قبر کھودنا ناجائز ہے تو پھر جو سزا چور کی وہ میری— لے چلئے کوتوالی۔ میں چلنے کے لیے تیار ہوں—'

'آپ اپنی قبر کھود رہے تھے......؟'

انسپکٹر کی پیشانی پر پسینے کی بوندیں جھلملا گئی تھیں۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے ابا حضور کی طرف دیکھ رہا تھا...... آپ کے گھر والے کہاں تھے؟ کسی نے کچھ نہیں کہا......

جلدی سے، ٹوکری سے اس نے وہ جگہ چھپادی......

'چھما کیجئے گا— آپ کو سمجھنے میں غلطی کی—'

انسپکٹر کے لہجے میں ٹھہراؤ تھا— 'میں کسی کو نہیں بتاؤں گا— لیکن مہربانی کر کے یہ خیال اپنے دل سے نکال دیجئے...... وہ جو...... کر رہے تھے آپ...... اپنی قبر کھودنا— خوامخواہ رات کے وقت عام لوگوں کو شک وشبہ ہوتا ہے۔

جاتے ہوئے بھی اس نے تنبیہ کی— 'کل یہ گڈھا بھروا دیجئے گا— سمجھ گئے نا...... آپ......'

ابا نے سر ہلایا......

انسپکٹر سرعت سے، بڑے دروازے سے باہر نکل گیا— ابّا جیسے گہرے سناٹے سے واپس اپنی دنیا میں آگئے—

لیکن مجھے اسی دنیا میں چھوڑ گئے—

●●

شام ہوگئی تھی......سورج غروب ہوگیا تھا......میں اپنے کمرے میں آ گیا—ابا کے ساتھ ساتھ انسپکٹر کی آوازیں بھی کانوں میں گونج رہی تھیں......

تو ابا اپنی قبر کھود رہے تھے......

گمشدہ خزانہ تو جیسے صرف خواب و خیال کی باتیں تھیں، دراصل یہ کچھ اور تھا— بھیانک—بھیانک سے زیادہ عبرت آمیز......

میری آنکھوں کے آگے دائرے بن رہے تھے......

وقت نے حویلی کے در و دیوار کھوکھلے کر دیئے اور کہیں زیادہ کھوکھلا کر دیا حویلی والوں کو......ورنہ انسپکٹر کے آگے ابّا اتنے کمزور نہ ہو جاتے کہ زندہ حویلی کو قبر سے تعبیر کرتے......

آنکھوں سے ایک قطرہ آنسو ٹپکا......

میری آنکھیں بند تھیں......کسی کی آہٹ ہوئی— کوئی میرے قریب کھڑا تھا—دو ننھے ہاتھ......یہ ننھے ہاتھ میرے جسم پر جھکے ہوئے تھے......

'تم رو رہے ہو—مت رو......'

صبر کا باندھ جیسے ٹوٹ گیا— آنسو رخسار پر پھیل گئے—

'سب رو رہے ہیں......ابو بھی رو رہے ہیں—اور یہاں تم بھی— مجھے بتاؤ گے نہیں، کہ کیا ہوا ہے......

'کچھ ایسا ہوا ہے جسے ابھی تم نہیں سمجھ پاؤ گی نادرہ— تمہاری عمر اسے سمجھنے کے لیے بہت کم ہے......'

'میں اتنی بھی چھوٹی نہیں......'

میں خاموش رہا—

'بتاؤ نا مجھے......سب کیوں رو رہے ہیں۔ کیا ہو گیا ہے—انسپکٹر کیوں آیا تھا؟'

اس کے ذہن میں ہزاروں ننھے ننھے سوالات تھے......اس کی گرم ہتھیلیاں اب بھی میری

آنکھوں کو خشک کرنے میں لگی تھیں۔

'بولو نا— کیا ہوا ہے...... مجھے ڈر لگ رہا ہے— امی کی یاد آرہی ہے...... وہاں اتنے آنسو دیکھے ہیں کہ سارے آنسو خشک ہو چکے— امی کا جنازہ رکھا تھا اور سب روئے جا رہے تھے......'

یہاں بھی ایک جنازہ رکھا ہے......

'جنازہ...... کہاں؟' نادرہ گھبرا کر پیچھے ہٹی...... اس کی آنکھیں خوف سے پھیل گئی تھیں۔ جھوٹ بولتے ہو تم— کہاں ہے جنازہ......

'یہ حویلی......'

ایک بار پھر میرے آنسو بہہ رہے تھے...... یہ بلند حویلی...... میں نے کہا نا، تم نہیں سمجھو گی نادرہ......'

'سب سمجھتی ہوں......' وہ آہستہ سے بولی— لیکن جہاں زندہ انسان بستے ہوں۔ اس کے بارے میں ایسا نہیں کہتے—'

وہ میری گود میں آ گئی تھی— اس کے ہاتھ جل رہے تھے...... میں نے اسے اپنی بانہوں میں لپٹا لیا تھا— میں جل رہا تھا...... یا سسک رہا تھا...... میں نے اس کے ارد گرد اپنی بانہیں سخت کر دی تھیں۔ میری ہتھیلیاں اس کی پیٹھ پر مچل رہی تھیں......

نادرہ...... نادرہ...... میرے جسم میں ہلچل مچی ہوئی تھی...... جیسے ہزاروں انگارے ایک ساتھ جسم میں داخل ہو گئے ہوں...... اور اچانک آگے بڑھ کر پہلی بار میں نے اس کے ہونٹوں پر اپنا ہونٹ رکھ دیا......

نیلے آسمان پر ستاروں کی آمد شروع ہو گئی تھی—

حصہ دوم

تہذیبوں کا تصادم

ایک دن نشانیاں مٹ جاتی ھیں
ایک دن پرندہ اڑ جاتا ھے......
ایک دن انڈا ٹوٹ جاتا ھے......

●●

اس ٹوٹے انڈے سے ایک نئی دنیا سانس لینے والی ھے......
جو تمھاری پرانی دنیا سے......
کھیں زیادہ بھیانک ھوگی

●●

(۱)

انسپکٹر کے جانے تک تو ابّا خود کو سنبھالنے میں کامیاب رہے مگر ادھر انسپکٹر گیا اور اُدھر ابّا گھنے ہوتے اندھیرے میں گم ہوتے ہوتے آنسوؤں کی یورش کی تاب نہ لا سکے......

ہم چھت پر تھے — یعنی میں اور نادرہ جب سفیان ماموں کی چیخ سنائی دی تھی —

رحمٰن — تمہارے ابّا بیہوش ہو گئے —

●●

کمرے میں سناٹا تھا، حویلی کے بام و در خاموش تھے — محرابوں سے گزر کر اونچے دروازے والا یہ بڑا سا کمرہ تھا — اور اس کمرے کے دروازے پر ایک جھینا سا ریشمی پردہ پڑا تھا...... پردہ کے ٹھیک سامنے ہی ابّا کا بستر تھا — ابّا لیٹے ہوئے تھے۔ سرہانے خاموش سی اماں بیٹھی تھیں۔ نادرہ سہمی ہوئی تھی — مریم بوا پانی لے کر کھڑی تھیں۔

سفیان ماموں ٹہل رہے تھے......

’اب انہونی دیکھ کر تو نہیں آتی — نہ وہ انسپکٹر آتا نہ وسیع بھائی کا یہ حال ہوتا......‘

اماں اپنے آنسوؤں کو مشکل سے روک پانے کی کوشش کر رہی تھیں......ساگوان کی لکڑی کی بنی یہ مسہری، جس پر ابھی ابّا آرام کر رہے تھے، یہ بھی ایک اینٹک پیس تھی — ابّا کے مطابق یہ مسہری ان کے بچپن سے تھی......تب یہ کمرہ دادا حضور کا کمرہ ہوا کرتا تھا......

ابّا ابھی بھی نیم بیہوش تھے......

اماں سرہانے دعا پڑھ پڑھ کر پھونک رہی تھیں......

سفنیان ماموں ٹہلتے ہوئے بولے جا رہے تھے......

’وسیع بھائی، بدلے ہوئے زمانے کا مزاج نہیں سمجھ پائے۔ کیا ضروری تھا کہ انسپکٹر کو سب کچھ بتایا جائے — ارے بات جنگل کی آگ کی طرح اڑی تھی، ویسے دب بھی جاتی — ہر جگہ، ہر

آدمی کے ساتھ حویلی کی بربادی کا رونا کیا رونا...... سب جانتے ہیں وہ دن گزر گئے جب کاردار خاندان فاختہ اڑایا کرتا تھا— ہیں...... اب فاختائیں ہیں کہاں جو اڑاؤ گے......؟'

پان کی گلوری منہ میں ڈالی— ٹہلتے ہوئے وسیع بھائی کی پیشانی پر ہاتھ رکھا— پھر بڑبڑائے—

'پیشانی تو ایکدم ٹھنڈی ہو رہی ہے— شام ہو گئی ہے۔ اس وقت کوئی ڈاکٹر بھی تو نہیں ملے گا......'

'کسی ڈاکٹر کی ضرورت نہیں— ' پہلی بار امی کے چہرے پر سختی محسوس کی— ابّا سے ہمیشہ لڑنے والی امی غائب تھیں— اور ان کی جگہ کوئی دوسری عورت آ گئی تھی—

'انہیں کچھ نہیں ہوگا— مجھے اللہ پر بھروسہ ہے— اور میں جانتی ہوں پاک پروردگار ان کا سایہ ہم پر ہمیشہ قائم رکھیں گے......

'مگر طبیعت بگڑتی جا رہی ہے...... آنکھیں ابھی بھی بند ہیں......'

سفیان ماموں پھر کمرے میں ٹہلنے لگے......

'یا اللہ— اس گھر کو کس کی بددعا کی گئی— وہ سرہانے بیٹھ گئے—

'وسیع بھائی— آنکھیں کھولیے......'

میں سہما ہوا دروازے سے لگ کر کھڑا تھا— آنکھیں ویران ہو رہی تھیں...... ابّا کے قریب جانے کی ہمت نہیں تھی۔ لیکن یہ سب کیا تھا؟ سوچ کے نئے دروازے اس وقت بھی کھل رہے تھے...... ابّا برسوں سے حویلی کے زخم کو پالتے پالتے ٹوٹ گئے اور زخم اچانک پھٹ گیا...... رسنے لگا......

'وسیع بھائی...... اٹھیے......

'وسیع بھائی...... پانی تو پیجئے......

وسیع بھائی آنکھیں کھولیے......

سفیان ماموں گھبرائے ہوئے تھے — اماں کا چہرہ سیاہ ہو رہا تھا — آنکھیں ٹھہر گئی تھیں — اماں نے سفیان ماموں کی طرف دیکھا — ہاتھ کا اشارہ کیا — ہتھیلیاں سخت تھیں...... ہوا میں چمکیں......اور اُنہیں رکنے کا اشارہ کیا......

میں کہتی ہوں، نا......انہیں کچھ نہیں ہوگا......'

'حالت غیر ہوتی جارہی ہے......'

کچھ نہیں ہوگا......

ڈاکٹر سے رجوع کرنے میں حرج ہی کیا ہے......میں دیکھتا ہوں......

سفیان ماموں آگے بڑھے تو اماں کی زوردار آواز نے اُنہیں روک لیا —

'قدم آگے بڑھانے کی ضرورت نہیں ہے بھیّا — اس وقت ویسے بھی کوئی ڈاکٹر نہیں ملے گا — میں نے اپنے دل کو مضبوط کرلیا ہے......اور میں جانتی ہوں، قیامت کی یہ رات بھی گزر جائے گی — مجھے اپنی دعاؤں پر پورا بھروسہ ہے......'

امی کی آنکھیں بند تھیں......

میں نادرہ کا ہاتھ تھامے باہر نکل آیا — دربے کی مرغیاں خاموش تھیں...... صحن میں پرچھائیوں کا رقص شروع ہوگیا تھا...... یہاں سے محراب نما منڈیروں کی قطار نظر آ رہی تھی...... میرے اندر کی دنیا بھی خاموش تھی — کافی دیر بعد نادرہ کی آواز گونجی......

'مجھے ڈر لگ رہا ہے......'

میں نے اس کی کانپتی ہتھیلیوں کو اپنے ہاتھ میں لیا......

'یہاں سب ڈر رہے ہیں نادرہ — سوائے امی کے جو اس سخت اور مشکل حالات میں سب سے زیادہ مطمئن ہیں......'

اندھیرے سائے سیڑھیوں پر پھیل گئے تھے......

'زندگی کیا اس قدر مشکل ہے نادرہ......' میرے لفظ ٹوٹ رہے تھے......

شاید......

تم نے بھی تو ماں کا صدمہ دیکھا ہے......

نادرہ کی خالی خالی آنکھیں منڈیروں کو تک رہی تھیں......

نادرہ کا ہاتھ تھامے میں اس جگہ پر آ گیا، جہاں کھدائی کی جا رہی تھی — یہ جگہ ابھی تک نہیں بھری گئی تھی...... میں نے ٹوکری ہٹا دی...... گڈھے کے کنارے کنارے مٹّی جمع تھی......

یہ تو کسی کی قبر لگ رہی ہے — چلو یہاں سے......

نادرہ کے لفظ کانپ رہے تھے......

میں نے گڈھے کے اندر دیکھا...... جیسے اس گڈھے میں ہزار روحیں اس وقت اکٹھا ہو گئی ہوں......

'چلو یہاں سے......'

'شاید یہاں سے کوئی راستہ خزانہ کی طرف نہیں جاتا......' آنکھیں اندھیرے میں بھیانک گڈھے کا جائزہ لے رہی تھیں......

'مجھے ڈر لگ رہا ہے......'

'ڈرو مت......'

میں نے نادرہ کا ہاتھ تھام لیا — ابّا کے کانپتے الفاظ مجھے یاد آ گئے جس کی ادائیگی انہوں نے انسپکٹر کے سامنے کی تھی......

'شاید حویلی کا کوئی زمین دوز راستہ ان خزانوں کی طرف نہیں جاتا......'

میں آہستہ سے بڑبڑایا......

اندھیرے میں محراب نما منڈیریں اس وقت کسی آسیب کی مانند لگ رہی تھی...... میں نے نادرہ کا ہاتھ تھاما اور صحن سے نکل کر واپس اس کمرے میں آ گیا، جہاں موت جیسے سناٹے کے درمیان ابّا خاموش سے، اینٹک مسہری پر لیے ہوئے خود بھی کوئی پرانی یادگار معلوم ہو رہے تھے......

اماں سجدے میں تھیں......

سفیان ماموں پان چبا رہے تھے۔ ٹہلنے کا عمل جاری تھا...... رک رک کر بڑ بڑانے کا سلسلہ بھی جاری تھا......

'یہ عمر زیادہ سوچنے کی نہیں ہوتی— زیادہ سوچنے سے دنیا بھر کی بیماریاں دبوچنا شروع کر دیتی ہیں۔ مشکل یہ ہے کہ وسیع بھائی جیسے لوگ کبھی بھی اپنے گزرے کل سے الگ نہیں ہو پائے۔ پاؤں دبایا، خوش ہو کر جاگیریں سونپ دیں...... کسی پر دل آ گیا اور زمین کا ایک بڑا حصہ تحفے میں دے دیا۔ کسی غریب پر ترس آیا، کئی بیگھا کھیت دے دیا— ختم ہو گئے وہ دن— ماضی کی سنہری کہانیوں میں اب صرف بیماریاں سانس لیتی ہیں۔ کیا ہوا— اپنے آپ کو زخمی کرنے کا نتیجہ کیا ہوا— وہ ماضی جو آپ کو بیمار کر جائے اسے پھینکنا ضروری ہوتا ہے۔ ساتھ لے کر چلنا نہیں— کیا ہم نہیں لٹے تھے— گھر بار، جاگیریں سب کچھ چھوڑ کر پاکستان جانے کا فیصلہ کیا کوئی عام فیصلہ تھا— لیکن حقیقت کو سمجھ رہے تھے۔ کہ اب وہ ملک نہیں ہے۔ دو ٹکڑے ہو گئے ہیں ملک کے— اور اس طرح حویلیوں اور جاگیروں کے بھی ہزار ہزار ٹکڑے ہو گئے— کیا یہ سمجھنا مناسب نہیں تھا کہ نئی آزادی دونوں نئے ملکوں کے لیے ہزار طرح کی پریشانیاں لے کر آئے گی۔ کیا وسیع بھائی کو علم نہیں تھا کہ دنیا تیزی سے بدل رہی ہے— اور ضروری یہ ہے کہ اس تیزی سے بدلتی دنیا کے ساتھ ہم خود کو بھی بدل ڈالیں— اگر وہ خود کو بدل ڈالتے تو آج یہ تماشہ نہ ہوتا— اور نہ وسیع بھائی جیسا آدمی بیماروں کی طرح اس طرح بستر پر دراز ہوتا......'

پن ڈبّہ دوبارہ کھلا...... سفیان ماموں نے دوبارہ پان کی گلوری منہ میں ڈالی— آج ان پر جیسے زور زور سے بولنے کا دورہ پڑ گیا تھا...... ٹہلتے ہوئے وہ مسلسل بولے جا رہے تھے...... 'سب کی ذمہ داری تقسیم پر آتی ہے۔ کون لے گا اس بدحالی کی ذمہ داری— نہ پاکستان پاکستان چلّانے والے پاکستان میں خوش— نہ یہاں کے لوگ— مولانا آزاد کی بات یاد آتی ہے...... ان کی اک ایک تقریر مجھے حفظ ہے...... مولانا نے کہا تھا...... مت کرو تقسیم— اگر آسمان سے کوئی فرشتہ اترے

اور قطب مینار پر کھڑے ہوکر اعلان کرے کہ ہندستان آزاد ہے تب بھی میں اسے اس وقت تک قبول نہیں کروں گا جب تک اس ملک کے ہندو اور مسلمان متحد نہ ہو جائیں۔ اگر ہندستان کو آزادی نہیں ملتی ہے تو یہ ہندستان کا نقصان ہے۔ لیکن اگر ہندو مسلمان نہیں ملتے تو یہ ساری انسانیت کا نقصان ہے۔

سفیان ماموں ٹہلتے ہوئے ٹھہرے— بہن کی طرف دیکھا...... بانٹ دیا دو بھائیوں کو— اور آج اس آزادی کا حشر دیکھ لو— باہر آگ لگی ہے۔ اور یہاں دیمک لگی حویلی پر ناز کرنے والا اس کا وارث بیمار لیٹا ہوا ہے......'

اچانک امی پلٹیں— ہوا میں ایک بار پھر ان کا ہاتھ چمکا— آنکھوں میں سارے آنسو خشک تھے......

'بس کرو بھیّا—'

ہاتھ ہوا میں تن گئے تھے— 'بس بہت ہوا بھیا— حویلی...... حویلی...... بیمار...... بیمار...... سنتے سنتے تھک گئی میں— یہاں کوئی میت یا جنازہ نہیں رکھا ہے— برسوں کے زخم یا ناسور کو آج رسنے کا موقع ملا ہے تو انہیں بیمار بن کر سوالوں کے کٹہرے میں کیوں کھڑا کرتے ہو— حویلی کل بھی شان سے کھڑی تھی اور میری زندگی تک اسی شان سے کھڑی رہے گی— میں اس کی آن بان شان میں کمی نہیں آنے دوں گی۔ لیکن اللہ واسطے— ان کے دل کو مزید نہ دکھایئے۔ میں ان کی تڑپ پہچانتی ہوں— اس لیے پوری زندگی کبھی ان سے سیدھے منہ بات نہیں کی......' امی رو رہی تھیں— دکھی اور رنجیدہ آدمی کب کا محبت کی زبان بھول چکا ہوتا ہے۔ میں خود ان سے لڑتی رہی۔ ساری زندگی حویلی کے نام پر لڑتی رہی— مگر کیوں؟ اس لیے کہ حویلی کے ماضی کو یہ بھول سکیں— اور یہ بھولنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ہزاروں برسوں کی تہذیب ایک دن میں نہیں بھولی جاتی بھیّا— وقت لگتا ہے— جیسے وقت کی دیمک محلات اور حویلیوں کو چاٹتے ہیں، ویسے ہی انسانی دماغ کو بھی— اور ایک دن یادداشت سے اس ماضی کا کچرہ ہٹا دیتے ہیں— اللہ کے واسطے انہیں بار بار

آزادی اور حویلی کی یاد نہ دلایئے......'

امی کے سخت چہرے پر بلا کی خود اعتمادی جھانک رہی تھی...... نادرہ نے پلٹ کر میری طرف دیکھا......سفیان ماموں گہرے سناٹے میں امی کا چہرہ پڑھ رہے تھے......

امی کی آنکھیں خشک تھیں—'ابھی مجھ میں بہت طاقت ہے۔ ان کے لیے اور حویلی سے لڑنے کے لیے— اس لڑائی میں مجھے کسی کا بھی ساتھ نہیں چاہئے۔ سگے بھائی کا بھی نہیں— میرے جانگر سلامت ہیں......'

ٹہلتے ہوئے سفیان ماموں ٹھہر گئے— کچھ دیر تک پتھر کے بت کی طرح بیٹھے رہے۔ پھر کمرے سے باہر نکل گئے۔

●●

صبح فجر کی اذان کے ساتھ ہی ابّا کی طبیعت کچھ ہلکی ہوئی تھی۔ اماں کو قریب دیکھ کر انہوں نے مسکرانے کی کوشش کی—

'ابھی نہیں مروں گا—'

مریں آپ کے دشمن......

'پانی......'

مریم بوا نماز پڑھ کر فارغ ہوئی تھیں—وہ جھٹ پانی لے کر حاضر ہوئیں—

ابّا کی آواز نحیف تھی......'کل نہ جانے کیا ہو گیا مجھے— مجھے خود نہیں پتہ......مگر— نیم غنودگی کی حالت میں بھی ایک بات مجھے پریشان کرتی رہی۔ اپنے بیٹے کو نماز کی تربیت نہ دے سکا۔ کبھی اس پر نماز کی پابندی نہیں لگائی— اللہ معاف کرے— مجھ سے زندگی میں کبھی زبردستی نہیں ہوئی— کبھی کسی پر جبر نہیں کیا— بیٹے کو کہا ضرور لیکن نصیحت آمیز لہجے میں— کبھی نماز کے لیے ڈانٹ نہیں سکا......

اماں نے ابی کا ہاتھ تھام لیا — ابھی کون سی عمر جا رہی ہے اس کی — بچے ایک دن خود جاگتے ہیں اور اپنا اچھا برا سوچ لیتے ہیں...... آپ اتنا زیادہ دماغ پر بوجھ کیوں دیتے ہیں۔

'رحمٰن جاگا ہے یا سو گیا......'

یہ وہی وقت تھا جب میں اٹھ کر دروازے پر آ چکا تھا...... ابّی کی باتیں سیدھے میرے دل ودماغ میں اتر رہی تھیں...... میں ابی کے پاس آ گیا — ابّی میرے سر کو سہلا رہے تھے......

'کبھی کسی بات کی نصیحت نہیں کی — مگر نماز پڑھنے سے سکون ملتا ہے بیٹے — حشر کے روز پوچھا جا سکتا ہے کہ بیٹے کو نماز کی تربیت کیوں نہیں دی......؟

سفیان ماموں بھی نماز سے فارغ ہو کر آ گئے تھے۔ لیکن وہ بدلے ہوئے تھے۔ شاید رات اماں کی بات سے ان کا موڈ خاصہ خراب ہو گیا تھا — مگر وہ خود کو نارمل دکھانے کی کوشش کر رہے تھے......

'آپ کی طبیعت کیسی ہے وسیع بھائی......؟

'اچھا ہوں...... درد ہے...... ابا نے مسکرانے کی کوشش کی......

'گھبرائیے مت — ایسا ہوتا ہے — بس زیادہ مت سوچیے......'

'سوچنا کون چاہتا ہے حکیم صاحب......'

سفیان ماموں نے چہرے پر مسکراہٹ لانے کی کوشش کی — میرے ساتھ میری حکمت بھی پاکستان رہ گئی — ورنہ آپ کو ایسا خمیرہ چٹاتا کہ آپ رات ہی بھلے چنگے ہو کر بیٹھ جاتے —'

ابا آہستہ سے مسکرائے —

سورج نکل آیا تھا — باورچی خانہ اماں اور مریم بوا نے سنبھال لیا — لیکن مجھے بار بار امی جان میں آج ایک انجانی عورت کا چہرہ نظر آ رہا تھا — امی جلدی جلدی اپنے کام انجام دے رہی تھیں۔ جیسے اُنہیں کسی خاص کام کی تیاری کرنی ہو — آج مریم بوا سے ان کا جھگڑا ابھی نہیں ہوا تھا — آج ان کے ہونٹ خاموش تھے —

باورچی خانے کی دیواریں دھویں سے کالی پڑ گئی تھیں— میری نظر امی کے چہرے پر مرکوز ہو کر رہ گئی تھی— اور مجھے یقین تھا، وہاں کوئی ایسی کشمکش چل رہی ہے، جہاں اماں اپنے سوالوں کا راستہ بھول گئی ہوں۔ ایک دوبار پلٹ کر اُنہوں نے میری طرف دیکھا— کچھ بولی نہیں—

دس بج گئے تھے— ابّا کو دیکھنے کے لیے بچو چا، سلام بھائی اور کئی لوگ آئے— مگر امی سائے کی طرح ابّا کے ساتھ تھیں......

'کوئی کچھ بولے گا نہیں— باہر کی کسی بات کا تذکرہ یہاں نہیں ہوگا—'

اس لیے ملنے والے آئے ضرور— لیکن ٹھہرا کوئی نہیں— ہاں، سفیان ماموں نے امی کو اشارہ کیا— کنارے بلایا—

'میری مانئے تو ڈاکٹر کو بلا ہی لیجئے۔ ہوش ضرور آ گیا ہے لیکن وسیع بھائی کی طبیعت ابھی بھی ناساز ہے—'

'ٹھیک ہے بھیّا— آپ ڈاکٹر کو بلائیے۔ میں آتی ہوں......'

اماں کے لہجے میں آگ بھر گئی تھی......

'آتی ہوں......مطلب......'

'مجھے کہیں جانا ہے......'

'کہاں؟'

'ابھی نہیں بتا سکتی بھیّا— مگر مجھے جانا ہے۔ میں ایک گھنٹے کے اندر آ جاؤں گی—'

سفیان ماموں کو سکتے میں چھوڑ کر اماں نے کنارے مجھے بلایا— پھر میرے دونوں ہاتھ تھام کر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا—

جو پوچھتی ہوں سچ بتانا......

جی امی......

جھوٹ بالکل نہیں—

جی امی جان......

کل رات میں کیا ہوا تھا......

کل......؟

ہاں جب کوتوالی سے کوئی آیا تھا......

’وہ......انسپکٹر......‘میں نے دماغ پر زور لگایا—انسپکٹر بانکے بہاری—

’بانکے بہاری ہو یا کوئی بھی بہاری ہو— کیا بات ہوئی...... مجھے سچ سچ اور ایک ایک لفظ بتا— اور ہاں کوئی بات بھی مجھ سے چھپانا نہیں۔ ورنہ آج تیری خیر نہیں—‘

اماں کے الفاظ سلگ رہے تھے۔ آج پہلی بار مجھے اماں سے خوف کا احساس ہو رہا تھا— میں کشمکش میں تھا۔ کیا بتاؤں اماں کو......میں صرف اس ہولناک منظر کا گواہ تھا— وہ منظر، جس نے ایک لمحے میں ابّا حضور کو برسوں کا بیمار بنا دیا تھا......

کیا بات ہوئی تھی......؟ اماں کی پتلیاں میری آنکھوں میں ناچ رہی تھیں......

پھر میں نے اماں کو سب کچھ بتا دیا— ساری باتیں سننے کے بعد اماں دو منٹ کے لیے خاموش ہوئیں— پھر میرا ہاتھ تھامتے ہوئے بولیں—

’چل میرے ساتھ......‘

کہاں......

’سوال مت کر......بس سیدھے چل میرے ساتھ......‘

آج اماں نے حجاب نہیں پہنا— برقعہ نہیں لگایا۔ بے پردہ مجھے لے کر وہ باہر آ گئیں— موڑ پر کئی محلے والے کھڑے تھے۔ آج اماں کو کسی کی پرواہ نہیں تھی۔ انہوں نے رکشے والے کو آواز دی۔

’چلو کوتوالی......‘

میں اماں کے ساتھ رکشہ پر بیٹھ گیا— مگر یہ سب میرے لیے کوئی عجوبہ تھا۔ اماں کے اس فیصلے پر مجھے تعجب تھا۔ مگر شاید ساری رات اماں ذہنی کشمکش کا شکار رہی تھیں— اور صبح اٹھتے ہی اماں نے کوتوالی جانے کا فیصلہ لے لیا تھا—

●●

رکشہ کوتوالی کے دروازے پر رکا—

دروازہ کھلا تھا— یہ ایک پرانی پیلے رنگ کی عمارت تھی۔ گیٹ سے ملحق ایک چھوٹا سا صحن تھا، جہاں دو ایک ٹوٹے رکشے پڑے تھے— باہر دو پولس والے تھے جنہوں نے چونک کر مجھے اور اماں کی طرف حیرت سے دیکھا تھا۔

اماں میرا ہاتھ تھام کر بجلی کی طرح کوتوالی کے اندر داخل ہوگئی تھیں۔ میں نے زندگی میں اماں کو اس طرح کبھی کسی رشتہ دار کے یہاں بھی جاتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ بازار یا مارکیٹ تو دور کی چیز ہے۔ کاردار خاندان ہی نہیں، بلکہ اس وقت محلے کی زیادہ تر عورتیں سخت پردہ میں رہتی تھیں۔ ایسا نہیں ہے کہ پردہ کی یہ بندش مردوں کی طرف سے تھی— شاید روایت اور تہذیبیں خود ہی انہیں چہار دیواری کی قیدی بنا کر رکھتی ہیں— مگر آج اماں نے پردہ اتار پھینکا تھا— اور یہ میری نظر میں بدلتے ہوئے وقت پر نگاڑے کی پہلی چوٹ تھی۔

اندر داخل ہونے پر ایک ویران سا کمرہ تھا— جہاں کچھ لکڑی کی بنچیں لگی ہوئی تھیں— دو میز اور کرسی پڑی تھی۔ جن پر دو پولس والے بیٹھے تھے۔ میز پر کاغذ اور فائلیں پڑی تھیں۔ اماں تیر کی طرح ایک میز کے پاس آکر رک گئیں—

'یہ بانکے بہاری کہاں بیٹھتے ہیں......'

'وہ سب انسپکٹر......' میز پر کاغذوں کے درمیان لکھتے سپاہی نے اشارہ کیا۔ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ اماں مجھے لے کر بانکے بہاری کے کمرے میں داخل ہوگئیں— دروازہ اتنی تیزی سے بجا

تھا کہ بانکے بہاری گھبرا گیا۔ اس نے مجھے پہچان لیا تھا۔ اب وہ حیرت سے اماں کی طرف دیکھ رہا تھا—

بیٹھیے......

میں بیٹھنے نہیں آئی ہوں— کچھ پوچھنے آئی ہوں......

جی...... پوچھئے...... بانکے بہاری سب انسپکٹر کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں— اماں کے تیور بتا رہے تھے کہ آج وہ پوری طرح ہتھیاروں سے لیس ہو کر آئی ہیں۔

کل آپ ہی آئے تھے نا...... بلند حویلی......

جی......

میں پوچھتی ہوں کیوں آئے تھے؟

خبر ملی تھی......

کیا خبر ملی تھی......

وہ تو میں نہیں بتا سکتا......

کس نے خبر دی تھی......

میں یہ بھی نہیں بتا سکتا......

'کسی کا خون ہوا تھا۔ ڈکیتی ہوئی تھی— ہمارے خاندان والوں میں سے کسی نے پھانسی پر لٹک کر جان دے دی تھی...... ارے خبر کا کوئی تو اور چھور ہوگا......'

میں نے کہا نا— ہم مجبور ہیں۔

'اچھا— کس نے خبر دی— میں اس کا نام جاننے آئی ہوں......؟' بانکے بہاری پریشان— میں نے کہا نا— مجھے اجازت نہیں کہ میں نام بتا سکوں......

'پھر کس بات کی اجازت ہے—؟ شہر میں ہزار طرح کی چوریاں، ڈکیتیاں وارداتیں ہوتی ہیں— وہاں تو کبھی آپ وقت پر نہیں پہنچتے— دنگے اور فساد ہو جاتے ہیں۔ محلّہ شیخاں میں

خون ہو جاتا ہے۔ ڈکیتی پڑ جاتی ہے۔ رات میں سرراہِ اسٹیشن سے نکلتے ہوئے کسی کو لوٹ لیا جاتا ہے۔ آپ کیا صرف وہیں پہنچتے ہیں۔ جہاں شریف، عزت دار اور خاندانی لوگ رہتے ہیں۔ جن کی شان میں ذرا سی گستاخی ہو جائے تو ان کا دم نکل جاتا ہے— گھر کی کوئی بات افواہ بن کر باہر اڑ جائے تو وہ جان دینے کو تیار ہو جاتے ہیں— آپ جانتے ہیں کہ ایک شریف گھر میں پولس کا آنا کسی خاندانی آدمی کے لیے کیا معنی رکھتا ہے— جس نے خبر کی— اس سے یہ پوچھنا آپ نے واجب نہیں سمجھا کہ اس خبر میں کتنی صداقت ہے۔ یا وہ آدمی جو خبر دینے آیا ہے، وہ کتنا سچا اور مخلص ہے— بس اس نے بتایا اور آپ ایک شریف انسان کو پریشان کرنے پہنچ گئے۔؟

اماں منہ سے آگ اگل رہی تھیں—

'دیکھئے مجھے— کوئی پردہ نہیں— حجاب اور برقعہ کو گھر چھوڑ کر آئی ہوں— بلند حویلی تو کجا، محلے کی کسی عورت نے آج تک ایسا نہیں کیا— میں سارا پردہ، سارا حجاب ختم کر کے آج آپ کے پاس یہ پوچھنے آئی ہوں کہ اگر میرے شوہر کو آپ کے آنے کی وجہ سے کچھ ہو جاتا ہے تو کیا آپ خود کو مجرم مانیں گے—؟ وہ آپ کے جاتے ہی بیمار ہو گئے— صبح ہوش آیا اور ابھی بھی ان کی طبیعت خراب ہے...... میں نہیں جانتی ان کا کیا ہوگا— اس صدمے کو وہ کس طرح لیں گے...... میں اُنہیں اس وقت اسی حال میں چھوڑ کر آپ کے پاس آئی ہوں۔ یہ پوچھنے کہ آپ کی ہمت کیسی ہوئی، ایک شریف اور مہذب آدمی سے سوال کرنے کی— ایک زمانہ تھا جب کاردار خاندان کی طرف دیکھتے ہوئے بھی نگاہیں خوف سے جل جایا کرتی تھیں— بلند حویلی کی طرف آپ نے آنکھ اٹھانے کی ہمت کیسے کی......؟

'دیکھئے...... آپ بہت زیادہ بولے جا رہی ہیں......' سب انسپکٹر بانکے بہاری کے ہوش فاختہ تھے— آواز سن کر دو تین کانسٹبل اور سپاہی بھی جمع ہو گئے تھے۔

'ابھی صرف بول رہی ہوں— شکر کیجئے کہ کوئی کارروائی نہیں کر رہی ہوں— آپ بتائیے، آپ کے مجسٹریٹ کہاں بیٹھتے ہیں، مجھے ان سے آپ کی شکایت کرنی ہے۔ بولیے......،

اماں کی دہاڑ گونجی— یا یہ بھی نہیں جانتے کہ آپ کے مجسٹریٹ کو اس وقت کہاں ہونا چاہیے……

’جی……‘

مجسٹریٹ کی بات سن کر بانکے بہاری کی ہوا نکل گئی تھی……

’آپ بیٹھیے تو سہی…… پانی پیجیے۔ دیکھیے ہمارا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ آپ سمجھ سکتی ہیں— ہم تو بس اپنا کام کرتے ہیں……آپ غصہ تھوک دیجیے— چائے منگواؤں آپ کے لیے……؟

’نہیں— رہنے دیجیے—‘ اماں کا چہرہ لال سرخ ہو رہا تھا۔

’نہیں— ایسا کیسے ہوگا— اے مدن— ذرا دو چائے جلدی لے کر آ……‘

’میں چائے نہیں پیتی……‘

اماں کے ہاتھ پھر ہوا میں لہرائے— میرے لیے چائے منگانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے— ویسے بھی شریف خاندان کی عورتیں باہر غیر مردوں کے ساتھ چائے نوش نہیں کرتیں— اور یہ تو پھر بھی کوتوالی ہے—‘

اماں ایک لمحہ کے لیے نرم پڑی تھیں۔ لیکن دوسرے ہی لمحہ ان کے الفاظ میں دوبارہ آگ کے بڑے بڑے انگارے جمع ہو گئے تھے۔

’تو آپ نے وہ جگہ دیکھ لی جس کے بارے میں پوچھ تاچھ کے لیے آپ بلند حویلی آئے تھے۔ جی ٹھنڈا ہو گیا، تسلی ہو گئی؟ آپ جانتے ہیں—ایک مزدور کو جینے کے لیے روز کنواں کھودنا پڑتا ہے تب جا کر وہ پانی پیتا ہے— روز کنواں کھودنا اور پانی پینا، یہی ایک مزدور کی زندگی بن جاتی ہے—‘

اماں کی آنکھوں میں آنسو سمٹ آئے— اور یہاں، زندگی کے لیے روز ہی اپنی قبر کھودنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے— حویلی والوں کو— میں پوچھتی ہوں اپنی قبر کھودنا کس قانون میں جرم ہے—اور اگر جرم نہیں تو آپ کو کیا پڑی تھی میرے گھر آنے کی—؟ کسی نے کچھ

بھی کہا اور آپ ذمہ دار افسر بن کر چلے آئے—؟ کسی نے کچھ بھی کہا تو آپ کنویں میں کود جائیں گے؟ آپ یہ بھی نہیں سوچتے کہ آپ کی موجودگی کا کسی پر کتنا برا اثر ہوسکتا ہے؟ اگر دیکھنا ہے تو میرے ساتھ چلیے— کل جس شریف انسان کی حویلی میں اور اس کی موجودگی میں آپ گلاب جامن اور سموسے صاف کررہے تھے، محض آپ کی موجودگی کی وجہ سے وہ بستر مرگ پر ہے......اور میں پردہ کی رسم توڑ کر آپ کی اس کوتوالی میں آئی ہوں۔آپ کو بتانے کہ اگر میرے میاں کو کچھ ہوگیا تو اپنی خیر بھول جائیے گا— اور دوبارہ کبھی سڑک سے گزرتے ہوئے بھی حویلی کی طرف آنکھ اٹھا کر مت دیکھئے گا— چلو رحمٰن......'

اماں نے میرا ہاتھ تھاما— جس بجلی کی طرح آئی تھیں، اسی بجلی کی طرح گیٹ سے باہر نکلیں اور رکشہ پر بیٹھ گئیں—

میرے اندر جیسے نگاڑے بج رہے تھے۔

دماغ میں دھماکے ہو رہے تھے......

اماں کا یہ چہرہ میں نے پہلی بار دیکھا تھا...... میں تو بس ایک کمزور سی اماں کو جانتا تھا۔ حویلی کی بدحالی پر آنسو بہانے والی اماں یا— ابّا کی ہر بات پر لڑ جانے والی اماں—

لیکن یہ اماں کوئی اور تھی......

ایک بدلی بدلی سی اماں، شاید جس نے وقت کے خاروخس چنتے ہوئے پہلی بار جینا سیکھ لیا تھا۔

آج پہلی بار مجھے اماں پر فخر کا احساس ہوا تھا—

●●

(۲)

ٹاٹ کے پیوند میں سرخاب کا سرمہ

معزز قارئین، یہاں آپ کو رکنا پڑے گا— بس تھوڑی دیر کے لیے— اور جیسا کہ اب تک آپ کو پتہ چل گیا ہوگا، یہ کہانی میری ہے، لیکن میری ہونے کے باوجود میری نہیں ہے— میں یعنی عبدالرحمٰن کا ردار— اور حقیقت یہ ہے کہ کوئی بھی کہانی کسی کی اکیلی کہانی نہیں ہوتی— اور ہر کہانی کے ساتھ ایک دو نہیں ہزاروں واقعات، کردار یا کہانیاں جڑ جاتی ہیں— لیکن میرا یقین کیجئے یہاں میں جان بوجھ کر آپ کو رکنے یا ٹھہرنے کی تکلیف نہیں دے رہا ہوں— بلکہ اب یہاں ٹھہرنا بہت حد تک ضروری ہو گیا ہے— وہ میری زندگی کا ایک بڑا Turning Point تھا جہاں میں نے اماں کو بے پردہ کوتوالی جاتے ہوئے دیکھا تھا— یعنی ایک بڑی تبدیلی۔ ایک ایسی تبدیلی، جس کے بارے میں اس وقت خیال کر پانا بھی ممکن نہیں تھا— اور شاید ابّا اور سفیان ماموں کو اگر بھولے بیٹھے اس وقت یہ باور بھی کرایا جاتا کہ ہاں ایسا ہوا ہے تو وہ ماننے کو تیار نہیں ہوتے— اور جیسا کہ آپ جانتے ہیں، امی نے خود ہی سفیان ماموں سے کہا تھا کہ وہ ذرا دیر کے لیے باہر جا رہی ہیں مگر امی کے قدم اچانک کوتوالی جا سکتے ہیں، یہ سفیان ماموں بھلا کہاں سوچ سکتے تھے— اور جیسا کہ قارئین، وہ محاورہ جو ہم بچپن سے سنتے آئے ہیں— ملّا کی دوڑ مسجد تک— تو اماں کی دوڑ صحن اور صحن سے باورچی خانہ— اس سے زیادہ تھی ہی نہیں— زندگی کا کل آسمان اسی صحن، باورچی خانے اور چھت تک محدود تھا یا سمٹا ہوا تھا—

جیسے لکشمن ریکھا ہوتی ہے۔ بس اماں— پہلی بار اس لکشمن ریکھا کو پار کر گئی تھیں اور اس ریکھا کے پار کرنے کے بعد ہی گھر میں ایک نئی اخلاقیات کا جنم ہوا تھا—

یا یہ، کہ ایک نئی دنیا، گمشدہ خزانے یا قبر کے راستے ویران ہوتی حویلی سے جنم لے رہی

تھی—

یا یہ......کہ ایک انڈا اٹوٹ گیا تھا—

ایک نئے پرندے کے جنم کے ساتھ، یہ دنیا تیزی سے نئی تبدیلیوں کی کہانی لکھنے والی تھی—

یا پھر یہ کہ آنے والے وقتوں میں شاید اس چیخ کی کوئی اہمیت نہ ہو جو اماں کے ہونٹوں سے کوتوالی میں نکلی تھی— کیونکہ اب سب کچھ بدلنے والا تھا— اور بہت تیزی سے— تہذیب، اخلاقیات سے سماج اور معاشرے تک— اماں نے ایک پہل کی تھی۔ لیکن جلد ہی کتنے ہی گھروں سے پردے اٹھ گئے— بازاروں کے منہ کھل گئے— عورتیں صرف گھر کی چہار دیواری میں، شو کیس میں سجنے والی نمائش کی گڑیا بن کر نہیں رہ گئیں...... یا پھر......سماج نے ایک ساتھ اچانک آنے والی کتنی ہی تبدیلیوں کا خیر مقدم کیا تھا۔

قارئین، اس کے بعد کے واقعات کی ایک لمبی تفصیل ہے— لیکن میں وہ ساری تفصیل سنا کر آپ کو بوجھل نہیں کرنا چاہتا، اس لیے صرف وہی تفصیل آپ کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں، جنہیں جاننا آپ کے لیے بے حد ضروری ہے— اور شاید ایک نئی دنیا کے نظام کو سمجھنے کے لیے میری طرح یہ تفصیلات آپ کی مدد کر سکیں۔

چلیے اب آگے کی کہانی کی طرف— مولوی محفوظ نے اچانک یہ شہر چھوڑ دیا— وہ اچانک اپنے چیلوں یا شاگردوں کے ساتھ زمین دوز ہو گئے— شاید اُنہیں گمشدہ خزانے کے نہ ملنے کا افسوس تھا۔ افسوس سے زیادہ اس بات کا خطرہ کہ ایک طرف وہ کوٹھی والوں کی دشمنی لے بیٹھے، دوسری طرف یہ معاملہ بلند حویلی سے نکل کر کوتوالی تک پہنچ گیا— ایک راز کی بات، جس سے اس پوری کہانی کا کوئی لینا دینا نہیں— مگر شاید آپ کے جاننے کے لیے ضروری ہو۔ دو سال بعد جب یہی مولوی محفوظ اکیلے اس شہر میں وارد ہوئے تو داڑھی کا چہرے پر دور دور تک کوئی اتہ پتہ نہ تھا۔ کلین شیوڈ— سفید بالوں کی جگہ سیاہ بال کہ اب بالوں میں خضاب لگانے لگے تھے— سفید شرٹ اور

فل پینٹ پہنے ہوئے — معلوم ہوا کہ انہوں نے فیروزہ آباد میں چوڑیوں کا کام شروع کیا ہے اور اب اس کام سے پرانے کام سے کہیں کہیں زیادہ آمدنی ہونے لگی ہے۔ انہوں نے یہ نہیں بتایا کہ ان کے شاگرد کہاں گئے۔ ممکن ہے جس طرح مولوی محفوظ نے اپنی شکل صورت اور دنیا بدلی تھی، یہی کام ان کے عزیز شاگردوں نے بھی کیا ہو— مگر ان شاگردوں کا آخر آخر تک...... یہ تحریر لکھے جانے تک کوئی پتہ نہیں چل سکا۔

گمشدہ خزانہ نہیں ملا—

گڈھے پر مٹی برابر کر دی گئی—اور اس دن کے بعد پھر کبھی گمشدہ خزانے نے رات کے سناٹے میں اپنی کھن کھن ......ٹھن ٹھن ......کا جادو نہیں دکھایا......ابّا ٹھیک ہو گئے— سفیان ماموں اپنے نئے ٹھکانے کی تلاش میں تھے—وہ امی سے خوش نہیں تھے—اور اب اُنہیں کوئی نہ کوئی کام تو تلاش کرنا ہی تھا—وہ گھر میں کم رہتے تھے۔ صبح ہی دوستوں کی تلاش میں نکل جاتے—مدعا یہ ہوتا کہ اس بہانے ایسے کام تک رسائی ممکن ہو سکے، جسے کرنے میں اُنہیں آسانی بھی ہو اور کوئی شرم بھی محسوس نہ ہو—

دنیا تیزی سے بدلی تھی—

اتنی تیزی سے کہ انسان حیرت زدہ رہ جاتا ہے۔ چار دن پہلے کی حقیقتیں برسوں پرانے افسانے معلوم ہوتے ہیں۔ تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔ لیکن شاید سب سے زیادہ تبدیلیاں کوٹھی میں آئی تھیں—اس کا ذکر آگے آئے گا— لیکن ابھی بات تبدیلیوں کی چل رہی تھی۔ تبدیلیوں کا پتہ اچانک نہیں چلتا لیکن کچھ تبدیلیوں کی رفتار بے حد تیز ہوتی ہے۔ جیسے پہلی بار ہمیں معلوم ہوا تھا کہ لوگ کالونیوں میں بھی رہتے ہیں۔ جیسے بلند حویلی میں دادا مرحوم کے زمانے میں کبوتروں کے شکبے بنے ہوئے تھے— چھوٹے چھوٹے گھر— جہاں کبوتر رہتے تھے— جو صبح کے وقت آسمان میں اڑا دیئے جاتے، اور شام کے وقت یہ دوبارہ اپنے گھروں میں لوٹ آتے۔ ہمارے لیے یہ تعجب کی بات تھی۔ یعنی ایک ہی گھر میں کئی لوگ رہتے ہیں—ایک فلور پر چار چار گھر؟ بھلا یہ لوگ آسمان،

اور چاندنی راتوں کا نظارہ کیسے کرتے ہوں گے— مگر اتفاق سے اب ان کالونیوں کے لیے یہاں بھی زمین ہموار کی جا رہی تھی۔ آبادی بڑھ رہی تھیں— نئی نئی دکانیں اور شوروم کھل رہے تھے— اور ساتھ ہی شہر میں ایک نیا کلچر سانس لے رہا تھا—

کالونی کلچر......

جہاں چاندنی راتیں نہیں ہوں گی......

نیلا آسمان نہیں ہوگا......

جگمگاتے ستاروں کی حسین کہکشاں نہیں ہوگی—

لوگ مرغیوں کی طرح دربے میں بند رہیں گے اور صرف اپنے کام سے کام رکھیں گے— یعنی تیز رفتار ترقی جہاں اپنے پنکھ کھول رہی تھی وہیں، زندگی کی دوسری آسائشیں بھی چھن رہی تھی۔

عام دنوں میں گھروں میں جن پھیری کرنے والی عورتوں یا مردوں کا راج تھا، اب ان کے بچے بھی بدل رہے تھے— اور بدلتے وقت کے ساتھ خاندانی غلامی کے پشتینی دھندوں کو چھوڑ کر دوسرے، پیسے والے اور آزادانہ دھندوں کی طرف بھاگ رہے تھے— جس میں کسی کی غلامی نہ لکھی ہو— ایک زمانے میں جہاں سڑکوں پر تانگے والے اور گھوڑ سواروں کی ریل پیل ہوا کرتی تھی اب وہاں نئے رکشے اور ٹیمپو آ گئے تھے— اس وقت تک ایسی کوٹھیوں یا حویلیوں میں پالی بھرنے یا اس طرح کے کاموں کے لیے مشک سے پانی بھرنے والے رکھے جاتے تھے— ایسا ہی ایک سقہ بلند حویلی میں تھا۔ عبدل— عبدل کی پشتوں نے کاردار خاندان کے ساتھ اپنی وفاداریاں نبھائی تھیں۔ لیکن عبدل کے بچے اب رکشہ چلاتے تھے— اور آہستہ آہستہ عبدل کا رشتہ بھی بلند حویلی سے ختم ہی ہو گیا— ہاں کبھی کبھی وہ حویلی والوں کی خیریت پوچھنے آ جاتا— وہ کبھی آنکھیں ملا کر نہیں بات کرتا تھا— آتے ہی زمین پر بیٹھ جاتا۔ گھر بھر کی خیریت پوچھتا— اماں چائے کے لیے پوچھتیں تو سیدھے منع کر دیتا—

ان کام والیوں میں حجامنوں کا خاص بول بالا تھا— شادی کی تقریب ہو یا دکھ یا کسی کے

انتقال کی خبر — ایک گھر سے دوسرے گھر انہیں پہنچانے کا کام انہی حجامنوں کا ہوا کرتا تھا — یہ دروازے سے ہی آواز لگاتیں — بھولا بہو کے لڑکا ہوا ہے — ندیم بابو کے ابّا انتقال کر گئے — دوپہر بعد مٹی منزل ہے — خوشی کے موقع پر یہ طشت میں مٹھائیاں، بتاشے، امرتی، برفی لے کر آیا کرتیں — اور پھر اس کے بدلے ہر گھر سے انہیں دس سے پچیس پیسے تک نذرانے مل جاتے — ان حجامنوں کا اصل کام ہوتا تھا، ایک گھر کی خبر کو دوسرے گھر پہنچانا — اور اس کام میں یہ ماہر ہوا کرتی تھیں — دراصل یہ حجامنیں اسی کام کے نذرانے وصول کیا کرتیں — چائے بھی پیتیں — پھر مزے لے لے کر پڑوس کے قصے سناجاتیں —

شہر میں تانگوں کا رواج ہی ختم نہیں ہوا بلکہ روایت اور تہذیب سے وابستہ اخلاقیات کو بھی زوال آ گیا — تانگے والوں کی مہذب زبان ان رکشے والوں کے یہاں مفقود تھی — زیادہ تر حجامنوں نے اب یہ پیشہ چھوڑ دیا تھا — بولن بوا، جمیلہ اور گھر گھر پھیری کرنے والی عورتوں کی تعداد میں بھی کمی آ گئی تھی — لیکن ابھی یہ سلسلہ پوری طرح منقطع نہیں ہوا تھا —

لیکن بہت جلد، کچھ زیادہ ہی تبدیلیوں کے امکانات پیدا ہو گئے تھے —

محلے میں آئی ہوئی ان بڑی تبدیلیوں میں سب سے زیادہ گفتگو میں نواب لٹھن کی حویلی تھی — باپ داداؤں کے انتقال کے بعد ان کے بچے ناکارہ اور آوارہ نکل گئے تھے۔ ایسا سننے میں آتا تھا۔ زمینیں اور جاگیریں کب کسی کی ہوئی ہیں — یا ہمیشہ کب کسی کا ساتھ دیتی ہیں — نواب لٹھن گزر گئے تو ان کے آوارہ بچوں کی دنیا ہی بدل گئی — اور پھر ایک دن اُن کے دو بچوں نے آپس میں مشورہ کیا — اور وہ فیصلہ کیا جو محلے کی لیے کسی تاریخی فیصلے سے کم نہیں تھا۔

سارے محلے میں اس فیصلے کی مذمت ہوئی تھی — طرح طرح کی باتیں بننے لگی تھیں —

'بے غیرت ہیں بچے — نواب لٹھن نے فکر ہی نہیں کی —'

'نواب لٹھن کون سے سمجھدار تھے —'

'اسی لیے بیٹے بھی ان کے ہی نقش قدم پر چلے —'

’بیٹے تو آوارہ نکل گئے......‘

’تبھی تو حویلی کا یہ حشر کرنے جا رہے ہیں—‘

’بھلا کوئی پرکھوں کی حویلی بیچتا ہے—‘

’نادان بچے ہیں—ایسے بچے اپنے خاندان کی پرواہ ہی کب کرتے ہیں—‘

یہ محلے میں خرید وفروخت کا پہلا معاملہ تھا—نواب لٹھن کے بیٹوں نے بڑی قیمت پر اپنی حویلی فروخت کردی— محلے سے کافی دور نئی عمارتیں اور رہائشیں بن رہی تھیں— حویلی فروخت کرنے کے بعد نواب لٹھن کے بچوں نے مینا بازار کے قریب اپنے لیے نئی رہائش تلاش کر لی— کچھ دنوں کے بعد یہ بھی سننے میں آیا کہ ان بچوں نے اپنا نیا کاروبار شروع کیا ہے—اور نئی گاڑی بھی لے لی ہے— کاروبار بھی خوب چل نکلا ہے— معلوم نہیں محلے والوں کی زبانیں بند ہوئی یا نہیں— لیکن نواب لٹھن کے بیٹوں کا چرچا کئی دنوں تک بلند حویلی میں بھی چلتا رہا— جیسے ابّا اس کارروائی سے خوش نہیں تھے—

’ارے کوئی ایسا بھی کرتا ہے کیا؟

اماں بھی طیش میں تھیں— جو بچے اپنے والدین سے محبت نہیں کرتے، وہی ایسا کرتے ہیں—‘

’سب تربیت کا نتیجہ— خود تو نواب لٹھن ساری زندگی عیش کرتے رہے مگر بچوں کی سدھ نہ لی—اور اب بچوں نے پرکھوں کی یادگار کو ہی فروخت کر دیا—واہ رے بچے—‘

اماں بھی اس موضوع پر ابّا کے ساتھ تھیں— کہتے ہیں پرانی حویلیوں میں پرانی روحوں کی آمد و رفت جاری رہتی ہے—ان بچوں نے اچھا نہیں کیا— جانے کیسے لوگ ہیں— بیچنا تھا تو مسلمان سے بیچا ہوتا— سنا ہے، جس نے کوٹھی خریدی ہے وہ ایک سنار ہے— پہلے وہ حویلی کا شدھی کرن کرائے گا— پھر تڑوا کر اس کی جگہ نئی عمارت کھڑی کرے گا—ارے واہ......کم سے کم ان بچوں نے مذہب کا تو خیال کیا ہوتا......‘

'دن ہی برے ہیں— کچھ لوگ تو دلّی بھاگ گئے—اور وہ مظفر میاں نواب—انہوں نے تو اپنی قبرستان والی زمین ہی بیچ دی—'

'یہ بچے جونہ کرائیں—' اماں بے حد غصہ میں تھیں—

حویلیاں، کوٹھیاں تو برے دنوں کی ساتھی ہوتی ہیں— ہم جوان ہو گئے تو ابّا حضور برے دنوں کا واسطہ دے کر ہمیں سمجھایا کرتے تھے......دیکھو بیٹا......کتنا بھی برا وقت کیوں نہ ہو، حویلی کو نہ گروی رکھنا نہ بیچنا—بس یہی کاردار خاندان کی آخری نشانی ہے—'

'اور کیا— حویلیاں بھی کہیں بیچنے کے لیے ہوتی ہیں......؟' اماں کی آنکھوں میں پرچھائیاں تیر رہی ہوتیں—

●●

لیکن میں ان تبدیلیوں سے خوش تھا۔ وقت نے عمارتوں پر لکھے مذہب کے نام کو بھی کھرچ دیا تھا—ایسا اس محلے میں پہلی بار ہوا تھا— پہلے اگر مسلمان کی کوٹھی یا گھر بک رہا ہوتا تو مسلمان خریدار ہی تلاش کیے جاتے—یا اگر کوٹھی کسی ہندو کی ہوتی تو وہ ہندو خریدار کی تلاش میں ہوتا— لیکن تبدیلیوں نے زندگی کے ہر پہلو، ہر گوشے کو متاثر کیا تھا—یا پھر یہ کہنا چاہئے کہ ان تبدیلیوں نے کچھ وقت کے لیے مذہب کی دیوار اٹھا دی تھی—

جیسے میرے لیے، آگے بڑھنے کے لیے یا زندگی کے چیلنج کا سامنا کرنے کے لیے، ان تبدیلیوں نے مجھے ایک نئے فلسفے سے روشناس کرایا تھا—

پہلے اندر کے ناسٹیلجیا کو توڑو—

یا ناسٹیلجیا کو خود سے الگ کرو—

وہ شے جس سے آپ محبت کرتے ہو، اس شئے سے محبت میں کمی کر دو—یا پھر اس شے سے اتنی محبت نہ کرو کہ اس کے نہ ہونے سے مایوسی یا محرومی کا احساس ہو— کیونکہ ذاتی ترقی کے

راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ ناسٹیلجیا ہے— دراصل ہم اس ناسٹیلجیا سے الگ نہیں ہو پاتے—اورایک دن بربادی کے منہ میں پہنچ جاتے ہیں— جیسے میری سوچ کا محور یہ بھی تھا کہ لٹھن نواب کے بیٹوں کی طرح کبھی ابّا نے حویلی کو فروخت کرنے کے بارے میں کیوں نہیں سوچا— وہ حویلی کی زندگی سے الگ اپنے لیے ایک نئی زندگی کی شروعات کرسکتے تھے— یہ شروعات مشکل ہوسکتی تھی۔ کیوں کہ نئے سرے سے ایک نئی زندگی میں قدم رکھنا آسان نہیں ہوتا— جہاں سب کچھ نیا ہوتا— حویلی کے طورطریقے نہیں ہوتے— صبح، دوپہر شام کا نظام بھی بدل چکا ہوتا—

تو کیا پرانے لوگ صرف پرانی چیزوں سے بندھ کرہی زندگی گزارنا پسند کرتے ہیں؟ اپنی سہولیات اورآسانی کے حساب سے—

بغیر نئے جھمیلوں میں پڑے ہوئے—

لیکن میں اپنے طور پر زندگی کا یہ رسک لینا چاہتا تھا— اور میں خود کو آہستہ آہستہ ان تبدیلیوں کے لیے مضبوط اور مستحکم کررہا تھا—

●●

وقت بدل رہا تھا—

یا تہذیبیں بدل رہی تھیں—

یا تہذیبوں کا تصادم جاری تھا—

لیکن اتنا ضرور تھا کہ میں نے خودکو، آنے والے وقت میں لڑی جانے والی ایک بڑی لڑائی کے لیے تیار کرلیا تھا—

ایک دن بولن بوا جولڑکے کے ساتھ کپڑوں کا تھان لے کر آیا کرتی تھیں، انتقال کر گئیں— وہ اندھیری گلی میں گر گئی تھیں۔ کچھ دن بیمار رہیں لیکن صحت مند نہیں ہوسکیں— محلے

والوں کی یہ بڑی تفریح بھی چھن گئی — اماں اور دوسری عورتوں کو اب شہر کے نئے بازاروں کا رخ کرنا تھا۔ محلے میں بھی پردہ کا رواج کچھ حد تک کم ہو گیا تھا — خاص کر نئی تہذیب یا نئی نسل کے بچے ان پردوں کے حق میں نہیں تھے —

آزادی کے بعد یہ ایک نئے انقلاب کی تیاری تھی۔

یہ بدلتی ہوئی دو دنیائیں تھیں —

ایک دنیا حویلی کی تھی —

اور ایک دنیا حویلی کے باہر کی تھی۔

اور مجھے یقین تھا ترقی کے راستے حویلی سے باہر ہو کر ہی جاتے ہیں۔ میں ابھی سے ان راستوں کے لیے خود کو تیار کر رہا تھا۔

لیکن ایک بڑی تبدیلی گھر کی سطح پر تھی — اور وہ تھی، نادرہ میں آنے والی نئی تبدیلیاں —

●●

ایک صبح کوٹھی میں کہرام مچ گیا۔ نور محمد کی والدہ گزر گئیں —

یہ خبر ابّا کی ذات پر بجلی کی طرح گری تھی — وہ کچھ دیر کے لیے گم سم ہو گئے — امی باورچی خانہ میں تھیں، جس وقت حجامن یہ دل دہلا دینے والی خبر لے کر آئی — وہ ٹھہری نہیں — کیونکہ سارے محلے والوں کو اس کی خبر دینی تھی —

'شاہ جنات اپنے ساتھ لے گئے —'

امی نے گہری اداسی سے کہا۔

'تم جلدی سے تیار ہو جاؤ — چلنا تو پڑے گا ہی — پڑوس کا معاملہ ہے —' ابّا اپنی دھن میں بولے جا رہے تھے —

'مجھے رہ رہ کر نظر محمد کا خیال آتا ہے — اس عمر میں سب سے زیادہ ضرورت بیوی کی ہوتی

ہے— بیمار تھی تو کیا ہوا، بیوی کی موجودگی ہی سارے گھر کو سنبھال کر رکھتی ہے— بیٹا بھی چھوٹا ہے......؟

'ہاں......' امی کی آنکھوں میں آنسو رواں تھے—

'کیسے سنبھالے گا وہ......خود کو سنبھالنا آسان ہوتا ہے کیا؟ میں کہوں گا کیا اس سے؟ مجھ سے تو ناراض ہوگا— مجھے بھی خیر خبر لینی چاہئے تھی— ٹھیک ہے، اس سے ایک غلطی ہوئی—'

'لیکن نظر محمد نے بھی تو غلطی کی— اُسے یہاں آکر پھٹکار لگانے کی کیا ضرورت تھی— وہ بات تو مذاق میں آپ نے کہی تھی، جو غلط طریقے سے وہاں پہچائی گئی— یہ سفیان ماموں تھے، جو پن ڈبہ سے پان نکال کر کھانے میں مصروف تھے—

نادرہ چوکی پر ہمہ تن گوش بیٹھی تھی—

'اب جانے دیجئے— جو ہوگیا— سو ہوگیا— مرنے والا چلا گیا— اب ان باتوں کو لے کر لکیر کیا پیٹنا—' اماں کے لہجے میں کوٹھی کے لیے یہ محبت کی واپسی تھی۔

'بھیا آپ بھی چل رہے ہیں نا......'

'چلنا تو پڑے گا— بات محلے کی ہے—'

سفیان ماموں تیار تھے۔

میں نادرہ کی طرف دیکھ رہا تھا— لیکن میرے خیالوں میں نور محمد تھا— وہ کتنا پریشان ہوگا— کتنا رو رہا ہوگا......کیا میں اس کا سامنا کر پاؤں گا؟

جن، جنات سے ہوتی ہوئی اس کہانی کا پردہ گر گیا تھا— اب شاید کوٹھی آسیب اور سایہ سے آزاد ہو جائے— شاہ جنات چلے جائیں— لیکن سفیان ماموں کا خیال تھا—

'جہاں جنات ایک بار بسیرا کرلیں۔ وہاں سے جاتے نہیں—'

(اور سچ یہ ہے کہ آنے والے وقتوں میں ان کا یہ سوچنا کس حد تک درست ثابت ہوا تھا—)

●●

گھر کو مریم بوا اور علی بخش کے حوالے کر کے ابّا، سفیان ماموں، امّاں اور نادرہ کے ساتھ میں بھی کوٹھی کی طرف چل پڑا— کافی لوگ کھڑے تھے۔ پردہ کہہ کر عورتوں کے لیے جگہ بنائی گئی— اماں روتی ہوئی نادرہ کا ہاتھ تھامے اندر چلی گئیں جہاں جنازہ رکھا ہوا تھا— محلے کی عورتیں بھی آخری رسوم کے لیے پہنچ چکی تھیں—

نظر محمد کی آنکھیں شاید ابّا کو ہی تلاش کر رہی تھیں— ابّا کو دیکھتے ہی وہ دہاڑیں مار کر روتے ہوئے ابّا سے لپٹ گئے—

'بھیّا— ہم لٹ گئے— برباد ہو گئے— آپ نے بھی غیر سمجھ لیا بھیّا۔ رابطے کی دیوار اٹھا دی......'

'نہیں نظر محمد— روتے نہیں—'

'حقیقت یہ تھی کہ ابّا بھی رو رہے تھے— آنسو رخسار پر بہتے جاتے تھے......نظر محمد کی آنکھیں روتے روتے پھول گئی تھیں— کچھ محلے والے اُنہیں سنبھالے ہوئے تھے—

'بھیّا— اب ہم کیا کریں گے— کہاں جائیں گے— ہم تو گھر کے بارے میں کچھ جانتے بھی نہیں— سب کچھ تو مرحومہ کرتی تھیں— بیمار رہنے کے باوجود سارے گھر کا خیال رکھتی تھیں— ہم لٹ گئے بھیّا— آگے دور تک اندھیرا ہے......'

'ہم ہیں نا......نظر محمد......آنسو نہیں بہاتے— روحوں کو تکلیف ہوتی ہے......تم اس طرح ٹوٹ جاؤ گے تو پھر بیٹے کو کون سنبھالے گا— خود کو سنبھالو نظر محمد—'

'اب سنبھالا نہیں جاتا بھیّا— دل پھٹ گیا ہے......'

نظر محمد پر بیہوشی چھا گئی تھی— کوئی پانی لانے کے لیے دوڑا— اُنہیں پانی پلایا گیا— ایک کرسی پر بٹھایا گیا—

محلے والے مشورہ کر رہے تھے— تجہیز و تکفین کس وقت ہوگی— لاش کو زیادہ دیر تک گھر

میں رکھنا مناسب نہیں— قبرستان کون جائے گا— گورکن کو خبر کی گئی یا نہیں— کفن کا لباس، لکڑیاں، پانی کے گھڑے—ایک بزرگ کاغذ پر لکھ کر محلے کے نوجوان کو کچھ سمجھا رہے تھے—اور ہاں......قبر پر چھڑکنے کے لیے خوشبو بھی—

کوٹھی والوں کا اپنا قبرستان تھا— گورکن تک خبر پہنچا دی گئی تھی—اندر سے رہ رہ کر چیخنے اور چلانے کی آواز باہر تک آ رہی تھی......سارا محلّہ پہنچا ہوا تھا— لیکن میری آنکھیں نور محمد کو تلاش کر رہی تھیں۔

نور محمد کہاں ہے؟

دکھائی نہیں دیتا—

ابّا، نظر محمد کو کچھ بتا رہے تھے۔ٹھیک اسی وقت محلے کے ایک نوجوان کے ساتھ مجھے نور محمد رکشے سے اترتا نظر آیا۔اس کے ہاتھ میں چٹائی تھی۔ رکشے کی سیٹ پر پانی کے دو گھڑے بھی رکھے ہوئے تھے......

میں لپک کر اس کے پاس پہنچا...... مجھے دیکھتے ہی اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے—اپنے ابو کی طرح وہ بھی مجھے بھیّا کہنے لگا تھا—

’بھیا—اماں چلی گئیں—‘

وہ کافی دیر تک میری بانہوں میں روتا رہا......میں کیا کہتا......میرا دل خود پھٹا جا رہا تھا— میں نے آہستہ سے پوچھا—

’ابھی تم کہاں سے آ رہے ہو......؟‘

’چٹائی اور گھڑا قبرستان پہنچانا ہے—‘

’میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا......‘

اچانک میں نے دیکھا......دو آنکھیں بغور نور محمد کا جائزہ لے رہی تھیں— ان آنکھوں میں ہمدردی کی جھلک تھی۔ یہ آنکھیں نادرہ کی تھیں۔ جو ذرا سے فاصلے سے، ہم دونوں کو دیر سے دیکھ

رہی تھی……

نور محمد سے ہی معلوم ہوا کہ اس کی امّی کی طبیعت پچھلے کئی دنوں سے بہت خراب ہوگئی تھی۔ شاہ جنات نے پوری طرح اپنے شکنجے میں لے لیا تھا۔ امی نے کئی دنوں سے کھانا بھی بند کر دیا تھا۔ وہ کھاتیں بھی کیسے — اب تک تو شاہ جنات کھلا رہے تھے……

میرے لیے خوشی کی بات یہ تھی کہ بلند حویلی اور کوٹھی میں ایک بار پھر دوستی ہوگئی تھی — ابّا اور نظر محمد مل گئے تھے — اور ادھر مجھے میرا نور محمد مل گیا تھا — نور محمد کچھ دیر کے لیے اندر دالان میں گیا — میں باہر اس کا انتظار کر رہا تھا — ابھی بھی آنے والوں کا سلسلہ بدستور جاری تھا — اور اچانک میری آنکھوں نے جو کچھ دیکھا، وہ میرے لیے کسی دھماکے سے کم نہیں تھا۔

کوٹھی کے محراب نما دروازے سے ملحق ایک چھوٹی سی راہداری تھی — یہاں اچانک میں نے نادرہ اور نور محمد کو ایک ساتھ دیکھا — میں دبے پاؤں ان کی باتیں سننے آگے بڑھا — میں دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا —

نادرہ پوچھ رہی تھی — تمہاری امی کیسی تھیں؟

نور محمد بتا رہا تھا —

نادرہ نے پھر کہا — تمہیں پتہ ہے — میری امی بھی ختم ہوگئیں، تبھی تو میں ابو کے ساتھ بلند حویلی آگئی —

’اچھا……‘ مجھے اچھی طرح احساس تھا، ان لمحات میں نور محمد اپنا مکمل دکھ بھول چکا تھا —

’تم گھبرانا مت — میں بھی نہیں گھبرائی تھی — ابو کہتے تھے۔ رونے سے روحیں ناراض ہو جاتی ہیں……

’اچھا……‘

’چالیس دن تک روحیں برابر گھر کے چکر کاٹتی ہیں — کیا پتہ ابھی بھی اس وقت تمہاری امی تمہیں دیکھ رہی ہوں……‘

'ارے تمہیں تو سب معلوم ہے......'

'ہاں— میرے ابو مجھے سب بتاتے ہیں— جب امی کا انتقال ہوا، ہم پاکستان میں تھے......'

چہ...... چہ......نور محمد افسوس کر رہا تھا—

لیکن دیکھو— تم پریشان بالکل مت ہونا—اور ہاں پریشان ہو جاؤ تو بلند حویلی آجانا— سمجھے—میں تمہیں وہاں مل جاؤں گی—

اس ماحول میں بھی نور محمد کے چہرے پر چمک تھی جیسے اچانک اس کی زندگی میں نئی دوستی کا سورج طلوع ہوا ہو—

●●

میں گھر آیا تو خود کو ٹھگا ہوا محسوس کر رہا تھا...... جیسے اچانک بہت کچھ ہو گیا ہو— اچانک فاختہ اڑ گئی—اچانک خوشیوں کا باغ مرجھا گیا—اچانک آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا......

میرے پاؤں میں طاقت نہیں تھی......

میں کرسی پر بیٹھا میز پر کچھ لکھنے کی کوشش کر رہا تھا......

'یہاں ہارے ہوئے لوگوں کے لیے کوئی جگہ نہیں

جو ہار جاتے ہیں

یہ دنیا ان کے لیے نہیں بنی......'

میں خود کو مسلسل سمجھا رہا تھا...... میں ہارنے کے لیے نہیں بنا ہوں......

لیکن نادرہ بدل گئی تھی......اچانک تنہائی میں سانپ کی طرح اس کی سرسراہٹ گم تھی— میں نے دیکھا، وہ مجھ سے بچنے کی کوشش کر رہی ہے......سفیان ماموں بھی بہت حد تک بدل چکے تھے— لیکن نادرہ میں آنے والی تبدیلیاں مجھے پریشان کر رہی تھیں—

اس درمیان گھر میں کچھ اور نئی باتیں بھی ہوئیں۔

جیسے اس دن نادرہ کو میں نے زور زور سے روتے ہوئے دیکھا تھا۔ اماں اسے سینے سے لگائے سمجھا رہی تھیں......

'دیکھنا— وہ تمہیں بہت مانیں گی...... آخر بھیا جو بھی کرنے جا رہے ہیں وہ تمہارے لیے ہی تو کر رہے ہیں۔ آخر اس عمر میں انہیں ایسا کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی—'

'میں سب سنبھال لوں گی— کیا مجھے ابو کو سنبھالنا نہیں آتا—'

'ابھی تم چھوٹی ہو بیٹی— بہت سی باتیں تم بڑی ہونے کے بعد ہی جان سکو گی— مگر رونا بند کرو— جو ہو رہا ہے، وہ تمہاری بہتری کے لیے ہو رہا ہے......

سفیان ماموں مسلسل پن ڈبے سے پان نکال کر کھا رہے تھے اور کمرے میں ٹہل رہے تھے۔

اماں نے اُنہیں اشارہ کیا— جیسے کہہ رہی ہوں— گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ بچی ہے— دل کو ٹھیس پہنچی ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ سب ٹھیک ہو جائے گا—'

کرماں محلے میں ایک بیوہ رہتی تھی۔ حمیرہ— کوئی اولاد نہیں تھی— عمر چالیس کے آس پاس— غریب عورت تھی— ایک ٹوٹا سا چھوٹا سا مکان تھا— دو کمروں والا— لیکن انتہائی شریف اور اللہ والی عورت— گھر میں ایک سلائی کی مشین تھی— محلے والوں کے کپڑے سی سی کر اپنا گزارہ کر رہی تھی۔ اڑتی اڑتی خبر میرے کانوں تک بھی پہنچی تھی— اس دن حجامن نے سفیان ماموں کو دیکھا تھا۔ پھر سفیان ماموں کے سامنے ہی اس بیوہ عورت کا تذکرہ چھیڑ دیا۔ تب سے سفیان ماموں کی بیقراری دیکھنے کے لائق تھی...... وہ کبھی بالوں میں خضاب لگا رہے ہیں— کبھی گانا گنگنا رہے ہیں۔ اماں کے پاس گھنٹوں بیٹھ کر، اماں کو منانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ مونچھیں رنگی جا رہی ہیں۔ مجھے احساس تھا، نادرہ کو یہ سب برا لگ رہا ہوگا— اب وہ اتنی چھوٹی بھی نہیں تھی—

ابا کو اس شادی پر اعتراض تھا— لیکن امی پر سفیان ماموں کی بیچاری زندگی کا جادو چل گیا تھا—

'یہ کوئی عمر ہے، لوگ کیا کہیں گے؟' ابا کی آواز میں جھلاہٹ تھی......

'لوگ کہتے رہیں— لیکن نادرہ کو بھی تو ضرورت ہے— اور پھر اس طرح بھیا، بیٹی کو لے کر حویلی میں تو ساری زندگی نہیں کاٹ سکتے۔ انہیں آج نہ کل اپنے بارے میں تو سوچنا ہی ہے—

'نادرہ کیا سوچے گی؟'

'بچی ہے۔ چار دن روئے گی— پھر سنبھل جائے گی— مگر دیکھئے، بیوہ کی بھی زندگی سنور جائے گی— اور خود بھیا بھی راستے پر آجائیں گے—'

'ہاں یہ تو ہے......'

'لیکن کیا بیوہ کی رضامندی لے لی گئی؟'

اماں نے بتایا— 'ہاں، ان کے ایک دور کے رشتہ دار ہیں۔ ان کی رضا مندی آگئی ہے—'

'اوہ......لیکن نادرہ بے چاری......' ابا کو نادرہ پر افسوس آرہا تھا۔

'تقدیر تو اوپر سے لکھ کر آتی ہے— ہم آپ فیصلہ تھوڑے ہی کرتے ہیں— اب تقدیر میں یہی لکھا ہے تو ہم رخنہ ڈالنے والے کون ہوتے ہیں—'

اماں کا لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ اس شادی سے خوش ہیں۔ ممکن ہے، اُنہیں اس بات کا احساس ہو کہ اس شادی سے بھیا کی زندگی میں اچھے دنوں کی شروعات ہو جائے گی۔

مگر نادرہ پر یہ خبر بجلی بن کر گری تھی—

●●

میرے لیے نادرہ کے جذبات کو سمجھنا مشکل نہیں تھا— میں اس سے ملنا چاہتا تھا۔ مگر اب وہ زیادہ تر روتی ہوئی پائی جاتی— میں جانتا تھا کہ اس موقع پر اسے اپنی امی کی یاد ستا رہی ہوگی— میں اس سے گفتگو کرنے کے موقع تلاش کرتا تھا، مگر اب وہ مجھے نظرانداز کرنے لگی تھی—

اور یہ بات مجھے حد سے زیادہ چوٹ پہنچانے کے لیے کافی تھی۔

نور محمد کے لیے میرے گھر کے دروازے کھل گئے تھے— اپنی امی کے قتل کے بعد وہ سہما ہوا حویلی آیا تھا— مجھ سے باتیں کرنے کے باوجود اس کی آنکھیں کسی اور کو تلاش کر رہی تھیں—

اور کچھ ہی دیر بعد نادرہ آ گئی تھی—

میں نے نادرہ کی آنکھوں میں اچانک نور محمد کے لیے اس چمک کو دیکھ لیا تھا، جس کے بارے میں اس سے پہلے تک میں شک وشبہ کی حالت میں تھا— مگر اب میرا شک یقین میں بدل چکا تھا کہ وہ مجھ سے زیادہ نور محمد میں دلچسپی لے رہی ہے—

●●

میرے لیے اچانک ساری دنیا بدل گئی تھی—

نور محمد اب پہلے سے زیادہ آنے لگا تھا۔ لیکن میرے لیے نہیں، نادرہ کے لیے— اور اس بات کو امی بھی شدت سے محسوس کرنے لگی تھیں۔ اس لیے ایک دن جب ابّا سے وہ اپنی ناراضگی کا اظہار کر رہی تھیں، تو اس گفتگو کو میں نے بھی سن لیا تھا—

امی نادرہ سے ناراض تھیں— اب بچی نہیں ہے— اور وہ دیکھے...... جب مرضی چلا آ رہا ہے— بھیا تو کچھ سمجھتے ہی نہیں— ارے اسی عمر میں تو لڑکیوں کو باندھ کے رکھا جاتا ہے۔ اس عمر میں پر لگ گئے تو ماں باپ کو پچھتانا پڑتا ہے......'

'بس بھی کرو— حکیم صاحب برا مانیں گے۔ اب ان کی شادی ہو جانے دو— پھر وہ جانیں— ایک بار اپنے گھر چلے گئے تو پھر ان کی زندگی ہے—'

'لیکن پھر بھی — لڑکی جوان ہو چلی ہے — اچھا برا تو اسے سمجھانا چاہئے —'

'اچھا برا وہ خود سمجھتے ہیں......اور خوب سمجھتے ہیں۔'

'مجھے تو اس لڑکے کی ہیکڑی اچھی نہیں لگتی — زمانہ بدل رہا ہے'...... امی خاموش ہوگئی تھیں —

●●

گھر میں سفیان ماموں کی شادی کی تیاریاں زوروں پر تھیں — کچھ دنوں کے لیے تو ان کے طور طریقے، برتاؤ میں بھی عجیب سا مسخرہ پن سمٹ آیا تھا...... جیسے انہوں نے کسی منچلے نوجوان کی طرح امی سے دریافت کیا —

'کیا شادی میں رسمیں نہیں ہوں گی؟'

بالکل نہیں —

'شادی کا گھر تو لگنا چاہئے......'

'نہیں — نادرہ کو برا لگے گا۔ بس دن تاریخ مقرر ہو جائے۔ چار لوگ جا کر نکاح کرا کے دلہن رخصت کر کے لے آئیں۔ پھر آپ کی مرضی......'

'گیت رنگ سہرے گائے جاتے ہیں تو گھر، شادی کا گھر لگتا ہے —'

اس بار اماں ناراض ہوئی تھیں — 'بھیا — کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ — یہ مجبوری کی شادی ہے بھیا — اللہ رکھے بھابھی حیات سے ہوتیں تو اس کی نوبت نہیں آتی — آپ نادرہ کے بارے میں کیوں نہیں سوچتے کہ اس بیچاری پر کیا بیت رہی ہوگی — اور آپ پورے ارمان سے شادی کے بارے میں سوچ رہے ہیں تو یہ ممکن نہیں ہے...... ذرا اس بیچاری کو دیکھئے — جب سے اس نے اس شادی کے بارے میں سنا ہے، صرف روئے جا رہی ہے —'

سفیان ماموں تیز تیز کمرے میں ٹہلنے لگے تھے۔

'لیکن یہ سب تو میں اسی کے لیے کر رہا ہوں—— نادرہ کو ایک اچھی سی ماں مل جائے گی......'

'اچھی سی ماں' پر اماں چونک گئی تھیں—— مگر انھوں نے کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھا—— بھیا کے ناراض ہو جانے کا احساس تھا۔

سفیان ماموں ٹہلتے ہوئے سنا رہے تھے۔'اس سے میری زندگی بھی تو سنور جائے گی۔ آخر یہاں کب تک رہوں گا—— حمیرہ کے بھائی سے بات ہو گئی ہے۔ہم وہیں رہیں گے—— نادرہ بھی وہیں رہے گی—— باہر کے کمرے کو ذرا سا ٹھیک کرا کے ہم اپنی حکمت شروع کر دیں گے—— دو پیسے تو آئیں گے—— اور ادھر حمیرہ جو کرتی ہیں، وہ جاری رکھیں گی——'

اماں غور سے دیکھ رہی تھیں—— سفیان ماموں اپنی نئی زندگی کی پوری پلاننگ کر چکے تھے——

اور ادھر وقت کا پہیہ تیز رفتاری سے گھوم رہا تھا——

اور شاید اس سے بھی زیادہ برق رفتاری سے وقت ایک ایسی کہانی تحریر کرنے میں گم تھا جس کے تار میرے اور نور محمد کے گھر سے جڑے ہوئے تھے۔

ایک بیحد خوفناک اور سنسنی خیز کہانی——

اور کتنی عجیب بات، ہم اس کہانی سے بالکل انجان تھے—— جبکہ مسلسل حادثات و واقعات نے اس خوفناک کہانی کی کڑیوں کو ایک دوسرے سے جوڑنا شروع کر دیا تھا——

میں—— نور محمد اور نادرہ......

شطرنج کی نئی بساط پر یہی تین مہرے سجے تھے......

اور یہ میری آنے والی نئی دنیا کے لیے کچھ ایسے ہی تھے، جیسا کہ 'ڈیمیان' میں 'سنکلیر' کو کہنا پڑا تھا——

ایک نئی دنیا جنم لینے والی ہے/

اور یہ دنیا ان کے لیے جو خطرناک ہوگی
جو اب تک پرانی دنیا سے چپکے ہوئے ہیں/

●●

(۳)

پرانی شاخوں کی جگہ نئی شاخیں وجود میں آ گئیں— جیسے پرانے درختوں کی جگہ نئے درخت یا پرانی نسل کی جگہ نئی نسل—

بلند حویلی کے بوجھ کو ڈھوتے ڈھوتے ایک دن ابّا حضور بھی ماضی کی کہانی بن گئے۔

●●

عمر کا گھوڑا سرپٹ بھاگ رہا تھا—

سفیان ماموں نے شادی کر لی اور وہ نادرہ کے ساتھ اسی بیوہ کے گھر میں رہنے لگے— کچھ دنوں بعد گھر کے باہری حصے میں سفیان ماموں نے اپنا مطب کھول دیا— اور گھر کے باہر حکیم سفیان احمد کا بورڈ لگ گیا— اور یہ بھی سننے میں آیا کہ ان کی حکمت چل نکلی—

ابّا کے انتقال سے کچھ مہینے پہلے مستقبل کو لے کر میری ان سے تیکھی بحث بھی ہوئی تھی— اور میں اپنی اس بات پر پہلے سے کہیں زیادہ پختہ عقیدہ رکھنے لگا تھا کہ ناسٹیلجیا سے نکلنا بے حد ضروری ہے—

ابھی فی الحال اس حویلی کے علاوہ ہمارے پاس کچھ نہیں ہے— اس لیے آگے کی زندگی کے بارے میں سوچنا ہے تو وہی کرنا ہوگا جو نواب لٹھن کے بیٹوں نے کیا تھا۔

ابا پر مردنی چھا گئی تھی—

'صدیوں کی تہذیب کا مرکز ہے یہ حویلی— باپ داداؤں کی اس حویلی کو بدلتے وقت کا

کفن پہنا دو گے تو میرے جیتے جی یہ ممکن نہیں ہے۔ ہاں میرے بعد تمہاری مرضی۔ تمہاری حویلی ہے— اسے رکھو یا اسے فروخت کر دو— لیکن یہ سب میری زندگی میں نہیں ہوگا—

میں ابّا سے پوچھنا چاہتا تھا— لیکن راستہ کیا ہے؟ مستقبل کے سارے راستے اسی حویلی سے ہو کر جاتے ہیں—

'جوان ہو— محنت کرو— کیا ضروری ہے، وہی کیا جائے جو نواب لٹھن کے بیٹوں نے کیا؟ ایک غلط روایت کی بنیاد ڈال دی— اور بھی لوگوں کی کوٹھیاں اور حویلیاں ہیں— باپ داداؤں کی یادگار بیچنے کے لیے نہیں ہوتی— ان میں صدیوں کی تہذیبیں چھپی ہوتی ہیں—'

لیکن میری ضد برقرار تھی۔ ترقی کا ہر راستہ اس حویلی سے باہر ہو کر جاتا ہے۔

ابّا اس منطق کو ماننے کے لیے تیار نہیں تھے— وہ یہی کہتے رہے، ان کی زندگی تک یہ ممکن نہیں—

ابّا گزر گئے— گھر میں سناٹا چھا گیا۔ امی حضور کے ہر وقت بولنے بکنے والے ہونٹوں نے خاموشی سے تعلق قائم کر لیا۔ میں جوانی کی سرحدوں پر کھڑا تھا اور زمانے کی سرد و گرم ہواؤں کا جائزہ لے رہا تھا۔ شاید میں خود کو اس مطلق جاگیردارانہ نظام سے باہر نکال لایا تھا، جو کام ابّا انجام نہیں دے سکے تھے— اور شاید اسی لیے ابّا ساری عمر حویلی۔ حویلی، اور بربادی۔ بربادی کا نوحہ گاتے رہے— جبکہ دو چار جانوں کے لیے اتنی بڑی حویلی کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ دو چار افراد کے لیے تین چار کمروں کا مکان ہی بہت ہوتا ہے— اماں کو اب میری شادی کی جلدی تھی، جبکہ ابھی میری عمر صرف بیس سال کی تھی— مگر وقت کے، سرد و گرم ہوا کے تھپیڑوں نے مجھے ایک ذمہ دار انسان میں تبدیل کر دیا تھا— جیسے میں اپنے بال بچوں اور ان کی زندگی اور مستقبل کے بارے میں ابھی سے سوچ سکتا تھا جو ابّا حضور ساری زندگی نہیں سوچ سکے۔ میرا منصوبہ مکمل تھا اور اس منصوبے کو صرف عملی جامع پہنانا رہ گیا تھا۔ اس منصوبے کا تذکرہ امی سے کرنا ضروری نہیں تھا۔ کیوں کہ ہر حال میں مجھے امی کا جواب معلوم تھا۔ وہ کسی بھی قیمت پر اس کے لیے تیار نہیں ہوتیں۔ مگر انہیں منانا یا

راضی کرنا میں جانتا تھا— لیکن ابھی فی الوقت سب سے ضروری کام کا تعلق میری شادی سے تھا— مریم بوا کا بھی انتقال ہو گیا— اور علی بخش پر اچانک بیماری کا حملہ ہوا تو وہ اپنے گاؤں چلے گئے اور وہیں اپنے رشتہ داروں میں بس گئے— گھر کا کام امی سے مشکل ہوتا تھا— اس لیے میری شادی کے لیے زور شور سے لڑکیاں تلاش کرنے کا کام جاری تھا— اور پھر ایک لڑکی بھی مل گئی۔ امی کی دور کی رشتہ دار— قبول صورت۔ امور خانہ داری میں ماہر۔ نماز کی پابند— مجھے صرف لڑکی کی تصویر دکھائی گئی— اور میری رضا مندی ملتے ہی میری شادی کر دی گئی— اس طرح رقیہ میری زندگی میں آ گئیں۔ اب میں اے آر کا ردار تھا— عبدالرحمٰن کاردار— ایک ایسا ذمہ دار نوجوان جو اپنے پاؤں پر کھڑا تھا۔ اور محلے والے اس نوجوان سے گاہے بگاہے مشورہ بھی کر سکتے تھے۔ رقیہ سیدھی سادی اور سنجیدہ لڑکی تھی۔ اس میں بس ایک برائی تھی۔ میری کسی بات کو منع نہیں کرتی تھی بلکہ سیدھے سیدھے ہاں کر دیتی تھی۔ حویلی سے باہر تک کی وسیع دنیا میں میں اس سے ہر چھوٹے بڑے مشورے کی امید رکھتا تھا۔ مگر وہ بس اتنا کہتی تھی۔ آپ جو کریں گے، غلط نہیں کریں گے۔ مجھے پورا بھروسہ ہے آپ پر— وہ سلیقہ مند تھی۔ سارے گھر کو اس نے بحسن و خوبی سنبھال لیا تھا— خالی وقت میں اماں کی خدمت کرنا اسے پسند تھا۔ شادی کے ٹھیک ایک سال بعد شان پیدا ہوا— اب ذمہ داریاں بڑھ گئی تھیں۔ آمدنی نہ کے برابر تھی— اور جیسا کہ میں نے اپنا منصوبہ سوچ رکھا تھا، میں نے اس پر عمل شروع کرنے کا فیصلہ کیا— میرے لیے سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ حویلی کا کیا کیا جائے— کیا اسے لیز یا کرائے پر چڑھا دیا جائے اور کہیں اور سستے میں مکان خرید کر رہا جائے یا پھر حویلی کو فروخت کر دیا جائے۔ کیونکہ لٹھن نواب کے بیٹوں نے جو سلسلہ شروع کیا تھا، اس کے بعد خریدنے کی نیت سے کئی لوگ میرے پاس آ چکے تھے— لیکن تب تک میں نے اس فیصلے پر کوئی حتمی مہر نہیں لگائی تھی۔

لیکن شان الرحمٰن کی پیدائش کے بعد ذمہ داریوں کے احساس نے مجھے اتنا بالغ ضرور کر دیا تھا کہ اپنی بیوی اور اپنے بیٹے کی بہتری اور مستقبل کے بارے میں سوچ سکوں— اور انہیں اُن

اندھیرے بھیانک دنوں سے دور رکھ سکوں جو میرے حصے میں آئے تھے۔ یعنی آنکھیں کھولنے سے لے کر اب تک حویلی اور اس کی بربادی کے قصوں کے درمیان ہی میری پرورش ہوتی رہی تھی— اس لیے، میرے لیے ضروری تھا کہ اپنے بچوں کو اس دنیا کی روشنی دکھاؤں جہاں تاریکی کی سلطنت قائم نہ ہو— اور شاید اسی لیے میں نے حویلی فروخت کرنے کا ارادہ کرلیا تھا— منصوبہ تیار تھا— حویلی کی فروخت سے جو پیسے آئیں گے، ان میں سے کچھ پیسے فکس ڈپوزٹ کردیئے جائیں گے تاکہ ضرورت بلاضرورت کام آئیں— کہکشاں منزل میں چار فلور کا ایک فلیٹ سستے میں کرائے پر مل رہا تھا— وہاں رہتے ہوئے میں اپنا کوئی پسندیدہ کاروبار بھی شروع کرسکتا تھا۔ یعنی ایک ایسی دنیا، جسے بیس سال کی اندھیری سلطنت میں میرے لیے سوچنا بھی ناممکن تھا۔ میں نہیں جانتا تھا، حویلی کے باہر کی دنیا یا زندگی کیسی ہوگی مگر مجھے اب اس نئی زندگی کی بنیاد ڈالنی تھی— ظاہر ہے، اماں کو میرا منصوبہ پسند نہیں آیا تھا، انہوں نے دھاڑیں مار کر رونا شروع کردیا تھا— لیکن میں نے سخت لفظوں میں اپنا فیصلہ سنا دیا تھا—

’یہ آپ سب کی بہتری کے لیے ہے۔ رقیہ اور شان کے مستقبل کے لیے بھی یہی بہتر ہے— اور اس کے سوا کوئی راستہ نہیں ہے—

●●

ترقی کے راستے میں /
سب سے پہلے ان کمزوریوں کو دور کرو
جو تمہارے راستے میں آتی ہیں /

اور میں نے یہی کیا تھا۔ اب کہکشاں منزل ہی گھر تھا۔ حویلی کی بلند دنیا کو ہم ماضی میں چھوڑ آئے تھے— میں وہاں کی کسی بھی یاد کو سینے سے لگا کر نہیں رکھنا چاہتا تھا— امّی نے بھی اس نئی زندگی سے سمجھوتہ کرلیا تھا— میرے پاس اب میری اپنی آزادی کے بھی دن تھے، جسے میں کتابوں

کے درمیان بسر کرنا چاہتا تھا۔ جیسے میں بہت کچھ لکھنا اور پڑھنا چاہتا تھا۔ ہزاروں طرح کے خیالات مجھے بار بار لکھنے کے لیے مجبور کرتے تھے...... شان کو گود میں ڈال کر میں اکثر قلم تھام لیتا تھا— اور میں کسی ایسے کاروبار سے وابستہ ہونا چاہتا تھا، جہاں میری اپنی آزادی کا گلہ نہ گھوٹا جا سکے۔ جہاں میں مکمل آزاد ہو کر اپنے لکھنے پڑھنے کا سامان کر سکوں— میں نے کہکشاں منزل کے قریب ہی ایک سستا سا مکان خرید کر کے ایک ٹرسٹ بنا دیا— اور ٹرسٹ کے ذریعے چھوٹے چھوٹے بچوں کے لیے ایک اسکول قائم کر دیا— میں وہاں کچھ گھنٹے ہی بیٹھتا اور باقی وقت یا تو میری فیملی کے لیے تھا یا پھر میرے لکھنے کے کام آتا تھا۔

لیکن بہر صورت، میں اس زندگی سے خوش تھا۔ میں بلند حویلی کے در و بام کو کافی پیچھے چھوڑ آیا تھا۔

کہکشاں منزل میں قدم رکھنے کے دو ایک سال بعد ہی اماں بھی گزر گئیں—

اب اسکول سے آمدنی کے ذرائع کھل گئے تھے— اور ادھر میں اپنا خاصہ وقت لکھنے اور پڑھنے میں لگا رہا تھا۔

لیکن شاید اس سے کہیں زیادہ بڑا تماشہ نور محمد کی زندگی میں آیا تھا—

●●

ایک ایسا تماشہ کم از کم میں جسے سمجھنے سے قاصر تھا۔ بچپن کے کسی کمزور لمحے میں کب نادرہ خیالوں سے نکل کر میری زندگی کا حصہ بن گئی، یہ مجھے بھی نہیں پتہ تھا اور مجھے یہ کہنے میں کوئی جھجک نہیں کہ میں شادی کے بعد بھی نادرہ کو اپنے خیالوں سے الگ نہیں کر سکا۔

بچپن کی وہ میٹھی شرارتیں— اس کا میری گود میں بیٹھ جانا— گھنٹوں اپنے کمرے میں میرا اسے بانہوں میں لیے رہنا— صحن میں ساتھ ساتھ کھیلنا...... پھر اچانک نور محمد کی آمد نے میرے اس پیار کو نظر لگا دی تھی۔

میں شاید اسے بھول کر بھی نہیں بھول سکا تھا۔

لیکن زندگی میں یکا یک ابّا حضور کے بعد آنے والی تبدیلیوں میں، میں نے رقیہ کو اپنی شریک حیات کے طور پر چن لیا تھا......

نادرہ بدل گئی تھی۔

اسے سوتیلی ماں راس نہیں آئی تھی — وہ چپ چپ رہنے لگی تھی — اُداس، جیسے جسم میں کوئی جان نہ ہو۔ دبلی پتلی تو وہ پہلے سے ہی تھی — سفیان ماموں کی شادی کے بعد جیسے اس نے مستقبل کا کوئی بھی خواب دیکھنا چھوڑ دیا تھا۔ یہ بھی سننے میں آنے لگا کہ سوتیلی ماں سے اس کی بنتی نہیں ہے۔ سفیان ماموں اپنی نئی بیوی میں مگن تھے۔ وہ اس لیے بھی خوش تھے کہ اب نئی زندگی ان کے پاس تھی اور ان کے مطب میں اچھی خاصی بھیڑ رہنے لگی تھی — چاروں طرف وہ حکیم صاحب کے نام سے مشہور ہو گئے تھے۔

پھر یہ بھی سننے میں آیا کہ نادرہ اور نور محمد خاموشی سے ایک دوسرے سے ملتے رہتے ہیں۔

اس درمیان نور محمد کی زندگی میں بھی کچھ ایسے ہی موڑ آئے تھے جو کم وبیش میری زندگی میں آئے تھے۔ نظر محمد بھی انتقال کر گئے — لیکن اپنی حدود سے آگے جا کر جو فیصلہ میں نے لیا تھا، اسے لینے کی ہمت نور محمد میں نہیں تھی — شاید وہ پشتوں کی کوٹھی کو اب بھی اپنے سینے سے لگائے رکھنا چاہتا تھا۔ لیکن اب اس نے اپنے لیے کچھ نئے کام تلاش کر لیے تھے۔ شہر میں نئے دفاتر، عمارتوں کے بننے کا کام تیزی سے ہو رہا تھا۔ پلاٹ خریدے اور بیچے جا رہے تھے۔ بے روزگاری سے گھبرا کر کئی لوگ اس پیشے میں آ کر کنٹریکٹر اور بلڈر بن گئے — نور محمد نے بھی یہی پیشہ اختیار کر لیا تھا — اور یہ بھی سننے میں آ رہا تھا کہ اب تو اس پر دولت برس رہی ہے — وہ بدل گیا تھا — موٹا ہو گیا تھا — قد میں وہ مجھ سے کافی کم تھا لیکن اس درمیان اس نے مجھ سے ملنا اور مشورے کرنا جاری رکھا تھا — اور سچی بات یہ ہے کہ وہ مجھ سے کوئی بھی بات چھپانے پر یقین نہیں رکھتا تھا — اسے وہ بات بھی یاد تھی جب میری پہلی نظم کو دیکھ کر وہ حیرت زدہ رہ گیا تھا اور اس نے پوچھا تھا۔ 'میرے دوست رہو گے

نا......ہمیشہ......'

اور میں نے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔

نور محمد یہ بات کبھی بھول نہیں پایا۔ اس لیے اکثر وہ کہکشاں منزل میں مجھ سے ملنے چلا آتا۔ میرے اسکول کے بارے میں دریافت کرتا۔ میرے بیٹے شان کے لیے ہر ملاقات میں وہ ٹافیاں لانا نہیں بھولتا— اور ہر بار وہ اس دکھ کا اظہار ضرور کرتا......

'کہ بھیا تمہارے جانے کے بعد محلّہ ویران ہو گیا— اب وہ شان نہیں رہی— میں بھی بہت اکیلا پڑ گیا ہوں۔ بھیّا مجھ پر اپنا دستِ شفقت ہمیشہ رکھنا— ورنہ یہ نور محمد مر جائے گا......'

اور اسی طرح ایک دن دبے لفظوں میں اس نے اپنی خاموش محبت کا بھی اظہار کر دیا تھا—

'حکیم صاحب کے یہاں گیا تھا— نادرہ بہت مشکل میں ہے......'

'تم حکیم صاحب کے یہاں جاتے ہو؟'

'ہاں—'

وہاں کوئی روکتا ٹوکتا نہیں ہے......'

'نہیں......'

'لیکن سنتے ہیں ممانی بہت سخت ہیں......'

'لو بھیّا کی سنو— اُنہیں تو پٹا لیا ہے—'

'کیسے—؟'

'ہر بار ان کے لیے میوے، مٹھائیاں لے جاتا ہوں۔ بس وہ خوش ہو جاتی ہیں۔ چلتے چلتے حکیم صاحب اور ان کی خیریت بھی دریافت کر لیتا ہوں— ابھی پچھلے دو دن پہلے کی بات ہے۔ اُنہیں شاپنگ کرنی تھی۔ حکیم صاحب نے کہا— گھر کا لڑکا ہے۔ نور محمد کو لے جاؤ۔'

'ارے واہ......تم تو چھپے رستم نکلے—'

'چھپا رستم کیسا— یہ سب تو میں کسی اور کے لیے کر رہا ہوں......'

'کس کے لیے......؟'

میں جانتا تھا، وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔ پھر بھی میں یہ سچ نور محمد کے منہ سے سننا چاہتا تھا۔

اس نے سر جھکا لیا— 'نادرہ کے لیے— وہ مجھے اچھی لگتی ہے......'

دو ایک لمحے کے لیے میرے وجود پر جیسے بجلی گری ہو...... نادرہ...... ہونٹوں تک آکر یہ لفظ جیسے گہری پیاس بن گئے ہوں— نور محمد پر غصہ بھی آیا، کہ یہ ظالم نور محمد، نادرہ کو جانتا ہی کتنا ہے— نادرہ کے جسم کی خوشبو جیسے میرے وجود سے اب بھی لپٹی ہوئی تھی—

میں کہیں، گم ہو گیا تھا—

'کیا بات ہے بھیّا......'

'ارے کچھ نہیں— 'میں نے مسکرا کر نور محمد کو دیکھا—

'لیکن نادرہ اس گھر میں خوش نہیں ہے۔ وہ گھر اس کے لیے کسی قید خانے جیسا ہے— میں نے ہر بار محسوس کیا ہے جیسے اس قید خانے میں اس کا دم گھٹ رہا ہو— میں...... اس کے لیے تڑپتا ہوں بھیّا— آپ جانتے ہیں نا، اب اماں ہیں نہ ابّا— مشورہ کرنے کے لیے ہر بار آپ کے پاس بھاگا آتا ہوں— میں کیا کروں۔ اس جہنم سے اسے کیسے آزاد کروں...... میرا دل ہر لمحہ اس کے لیے روتا رہتا ہے......'

ایک لمحے کو خیال آیا، نور محمد کو گمراہ کر دوں۔ کچھ جھوٹی کہانیاں بتا دوں— مگر یہ سوچ کر خاموش رہا کہ وہ آج کی اس دنیا میں سب سے زیادہ یقین مجھ پر کرتا ہے۔ اماں کو نادرہ کے طور طریقے پسند نہیں تھے۔ ورنہ کب کا نادرہ کو امی سے مانگ چکا ہوتا— لیکن اب دیر ہو چکی تھی— نادرہ مجھ سے بہت دور جا چکی تھی، جہاں اس کے بارے میں کچھ سوچنا بھی میرے لیے جائز نہیں تھا۔

نور محمد نے سر جھکا لیا—

'ایک بات بولوں بھیّا......'

’ہاں—‘

آپ برا تونہیں مانیں گے......؟‘

’نہیں بالکل نہیں......‘

اگر میں حکیم صاحب کے یہاں رشتہ بھیجوں تو......؟‘

اس بار مجھے ایسا لگا جیسے وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مجھے ٹٹولنے کی کوشش کر رہا ہو—

’میری بھی کوٹھی ہے۔ خاندانی آدمی ہوں— اچھا کما لیتا ہوں۔ حکیم صاحب رشتے کی بات پر برا تونہیں مانیں گے......؟‘

’یہ میں کیسے بتاؤں؟ ممکن ہے انہوں نے نادرہ کا رشتہ پہلے سے کہیں طے کر رکھا ہو—‘

نور محمد سے محبت کے باوجود میں نے اسے گمراہ کرنے کی کوشش کی— ’ہاں یہ تو میں نے سوچا بھی نہیں—‘

اس کے ارمانوں پر جیسے اوس پڑ گئی ہو— وہ بت بنا میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اچھا مان لیجئے بھیا، اگر ایسی بات ہے تو، مجھے کیا کرنا چاہئے—‘

یہ تو سوچنا پڑے گا نور محمد—

’آپ سوچئے بھیّا— میں تو پریشان ہو گیا۔ آپ سوچ بھی نہیں سکتے، نادرہ میرے لیے کیا ہے۔ میرا اللہ گواہ ہے کہ وہ دن جب امّو کا انتقال ہوا تھا اور پہلی بار نادرہ کے دیدار ہوئے تھے، میں نے آج تک پلٹ کر کسی دوسری لڑکی کے بارے میں سوچا تک نہیں—‘

میں اس کا چہرہ پڑھ رہا تھا— اس کے چہرے پر نور روشن تھا۔ اور یہ نور اس کی ایمانداری کی گواہی دینے کے لیے کافی تھا—

’مجھے یقین ہے اگر ایسا کچھ ہے تو آپ میرے حق میں بہتر سوچیں گے اور کوئی نہ کوئی راستہ نکال لیں گے......‘

میں نے تعجب سے اس کی طرف دیکھا، جیسے وہ اپنے رقیب میں اپنا دوست تلاش کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ مگر یہ بھی سچ تھا کہ اب ہر کام وہ میرے مشورہ سے کرتا تھا — بلند حویلی کو فروخت کرنا، اپنے قدموں پر کھڑا ہونا، وہ ان سب باتوں کا قائل تھا — وہ جانتا تھا، میں ایک پریکٹیکل آدمی ہوں — اور شاید اسی لیے وہ میرے منصوبوں اور فیصلے کی قدر کرتا تھا — مگر نور محمد انجانے میں یہ بھول گیا تھا کہ اس بار اس کا واسطہ ایک دوست سے کم اور ایک رقیب سے زیادہ تھا۔

یہاں میرے کردار میں ایک حاسد کی واپسی ہوئی تھی جو نور محمد اور نادرہ کی قربت دیکھ کر اندر ہی اندر سلگ گیا تھا — تصویر کے دو رخ تھے۔ ایک رُخ میں، میں نور محمد کے لیے مہربان تھا جبکہ دوسرے رخ میں، میں ہر جگہ اسے خود سے کم تر گردانا چاہتا تھا۔

لیکن یہاں دشواری یہ تھی کہ وہ میری بچپن کی محبوبہ کو لے جانے کے فراق میں تھا — اور میرے لیے یہ سوچ پانا ہی مشکل تھا۔

میرے نئے منصوبوں میں سے ایک تھا، سفیان ماموں سے ملنا اور نادرہ کے بڑے ہونے کا ذکر چھیڑنا — مجھے وان گاگ کی ایک تصویر یاد آ رہی تھی، جہاں ایک ہی تصویر میں ایک چہرہ دو حصوں میں تقسیم تھا۔ ایک مہربان چہرہ تھا لیکن آدھے چہرے سے اس شخص کی مکاری اور عیاری نظر آ رہی تھی۔ میں دیر تک اس شش و پنج میں گرفتار رہا کہ اس سلسلے میں مجھے کیسے قدم اٹھانے چاہئیں کہ میں نور محمد کو اس شادی کے لیے روک سکوں۔

اور شاید اسی لیے رات کے وقت میں نے دبے لفظوں میں رقیہ سے بھی اس بات کا تذکرہ کیا کہ نور محمد کیا چاہتا ہے — پھر میں نے اسے یہ بھی بتایا کہ نور محمد کی والدہ کا انتقال کن حالتوں میں ہوا — میں نے یہ بھی بتایا کہ سفیان ماموں کا تو یہاں تک کہنا ہے کہ جنات جہاں ایک بار بسیرا کر لیں، وہاں سے جلدی نہیں جاتے۔

رقیہ میری ان باتوں کو سن کر ڈر گئی تھی — رقیہ کی طرف سے ہری جھنڈی ملتے ہی، میں نے دوسرے ہی دن اسکول کے کام سے فارغ ہو کر سفیان ماموں کے گھر جانے کا پروگرام بنا لیا —

سفیان ماموں سے مل کر میں انہیں ہر قیمت پر یہ باور کرانا چاہتا تھا کہ وہ نادرہ کے لیے کوئی اچھا سا رشتہ تلاش کریں اور ممکن ہو تو خاندان میں ہی کہیں وہ کسی اچھے لڑکے کو دیکھ کر اس کی شادی کر دیں۔

مجھے یقین تھا، سفیان ماموں میری باتوں پر ضرور توجہ دیں گے۔ اور اس طرح میں نور محمد کو نادرہ کے راستے سے ہٹا سکنے میں کامیاب ہوسکتا تھا—

●●

اس رات میں دیر تک کاغذ پر آڑی ترچھی لکیریں کھینچتا رہا۔ میں شاید کوئی چہرہ بنانا چاہتا تھا۔ بچپن سے ہی سفید کاغذ کو لے کر آڑی ترچھی تصویریں بنانے کا مجھے شوق رہا ہے۔ چھوٹے بڑے درخت، ندی نالے، ہوائی جہاز مگر سب سے زیادہ دلچسپی مجھے انسانی چہروں سے رہی ہے۔ نادرہ سے سرد جنگ کے بعد بھی میں نے کتنے ہی کاغذ سیاہ کیے تھے—اور یقیناً، آج یہ سوچ کر میری روح کانپ جاتی ہے کہ نادرہ کو لے کر میری بنائی گئی یہ تصویر پہلی تصویر سے کہیں زیادہ خوفناک تھی۔ مثال کے لیے میں اس کی آنکھوں کا تصور کرتا اور جو آنکھیں میں باریک پنسل کے کنارے سے رک رک کر اپنی پینٹنگس میں اتارنا چاہتا تھا، وہ بالکل مختلف ہوتیں، جیسے میرے اندر کے احساس ان آنکھوں کے دائرے میں پھیل گئے ہوں۔ مثال کے لیے میری خفگی، میری ناراضگی، جسے میں صرف اور صرف اپنے اندر ہی جمع کرتا رہتا تھا۔ میں ایک بار پھر پنسل سے لکیریں کھینچ رہا تھا...... بالوں کو سیاہ کرنے کی کوشش...... بھنوؤں کے پاس دو ایک گہرے شیڈ...... کان...... ہونٹ...... اور...... یقیناً یہ نور محمد سے ملتی ہوئی تصویر تھی— نور محمد، جو تصویر سے نکل کر اچانک میرے سامنے تھا......

'مجھے یقین ہے بھیّا— آپ جو کریں گے میری بہتری کے لیے کریں گے......'

رقیہ، شان کو لے کر بستر پر دراز تھی۔ میں خود کو تسلی دے رہا تھا۔ محبت اور جنگ میں سب جائز ہے— نادرہ سے شادی نہیں ہوئی تو کیا، میں آج بھی اس کی محبت میں گرفتار ہوں...... وہ کسی

ساحرہ کی طرح جب میری پلکوں پر انگڑائیاں لیتی ہے تو میرے لیے اسی لمحہ ساری دنیا اتنی دلکش اور حسین ہو جاتی ہے کہ شاید میں اظہار بھی نہ کرسکوں۔ اس کی بڑی سی جاگتی آنکھیں اور دلکش موٹے ہونٹ...... میرے وجود میں آگ لگی ہوئی تھی۔ میں یہ جسم نور محمد کے حوالے نہیں کرسکتا...... کسی بھی قیمت پر نہیں۔ میں ایسا ہونے نہیں دوں گا...... نادرہ میری آنکھوں کے آگے جگہ گھیرتی ہے۔ میں صحن میں ہوں۔ وہ چپکے سے میرے جسم پر جھک کر میری آنکھیں بند کرلیتی ہے......

'کون ہوں...... میں......؟'

اس لمس کو بھلا مجھ سے زیادہ کون جان سکتا ہے— جب قدرت ایک ننھے جسم کو پہلی پہلی بار اپنا حسن، اپنی جولانیاں اور اپنی تپش سونپ رہا ہوتا ہے...... تب چپکے سے یہ تپش، یہ آندھی میں نے اپنے جسم اور سرور کے حوالے کی تھی...... اور آج بھی یہ جسم اسی تپش اور اُنہی آندھیوں کے احساس میں سلگ رہا ہے......

●●

جب میں سفیان ماموں سے ملنے پہنچا، وہ مطب میں تھے— کچھ عورتیں اور مرد بیٹھے ہوئے تھے۔ قالین پر سفید چادر بچھی ہوئی تھی— گاؤ تکیے لگے تھے۔ درمیان میں لکڑی کا ایک تخت تھا۔ اب انہوں نے ایک ملازم بھی رکھ لیا تھا۔ رشید— جو دوائیاں تیار کرکے، کاغذ میں لپیٹ کر مریضوں کے حوالے کرتا۔

السلام علیکم ماموں......

'وعلیکم السلام......'

سفیان ماموں نے مجھے اندر جانے کا اشارہ کیا۔ ساتھ ہی یہ بھی کہا۔ بس آدھے گھنٹے میں فارغ ہوکر وہ باتیں کریں گے— اندر کے کمرے میں ایک چوکی پر صاف چادر بچھی تھی— نادرہ کوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر ہڑبڑا کر وہ اٹھ بیٹھی۔ رسمی سلام جواب کے بعد میں نے اس

کی خیریت دریافت کی۔ میں اس کی آنکھوں میں ان حسین مناظر کی گواہی دیکھنا چاہتا تھا، جو ہم نے ساتھ گزارے تھے۔

لیکن شاید اب یہ منظر اس کی آنکھوں میں خشک ہو گئے تھے۔ یا کمھلا گئے تھے یا اس نے ان یادوں کو خود ہی کھرچ دیا تھا—

'تمہاری طبیعت کیسی ہے؟'

میری طبیعت کو کیا ہوا؟ اس کا موڈ اکھڑا ہوا تھا۔

میں نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی—

'اللہ تمہیں ہمیشہ خوش رکھے......'

'وہ تو میں اس کی مرضی کے بغیر بھی خوش ہوں......'

مجھے معلوم چلا تھا، نادرہ نے نماز پڑھنا بھی چھوڑ دیا ہے— مجھے یہ بھی احساس تھا، موجودہ حالات نے اسے چڑچڑا بنا دیا ہے......

میں دوبارہ مسکرایا— کبھی میرے یہاں بھی آجاؤ۔ رقیہ تمہیں یاد کر رہی تھی—

'دیکھیں گے—' اس نے سر کو جھٹکا دیا—

ممانی آ گئی تھیں— چہرہ گلاب کی طرح کھلا ہوا— مجھے دیکھ کر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑیں— ارے صبح صبح کیوں پتھر سے سر پھوڑ رہے ہو رحمٰن میاں— یہاں سے کسی اچھے جواب کی امید مت رکھنا— پھول بھیجو گے تب بھی پتھر ہی برسیں گے......'

'میں ایسی ہوں اور میں ایسی ہی رہوں گی— اور خبردار— کسی کو بھی میرے معاملات میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں ہے۔'

تلملاتی ہوئی، پیر پٹختی ہوئی وہ سیڑھیوں سے ہو کر اوپر کی چھت پر چلی گئی تھی۔

'سن لیا......اس کی زہریلی باتیں—' ممانی کے چہرے پر کہیں کوئی رنج کی لکیر نہ تھی— میں تو ٹھہری سوتیلی ماں۔ مگر ایمان سے بتانا رحمٰن میاں، کیا کوئی بھی عورت ایسی جلی کٹی باتیں

برداشت کرسکتی ہے۔ ارے پیار سے بولو تو دو باتیں کوئی بھی برداشت کرسکتا ہے— مگر پتھر مار کر— کم ازکم میں تو پتھر برداشت نہیں کرسکتی—'

ممانی نے پھر ٹھہاکا لگایا— جانے دو رحمٰن میاں— ہوگی کوئی مجبوری۔ دلہن کو ساتھ کیوں نہیں لائے—؟'

'رقیہ کی طبیعت ناساز تھی۔ اس لیے خود ہی ملنے آ گیا—'

'موسم بدل رہا ہے— کوئی گھبرانے کی بات تو نہیں ہے......؟'

'نہیں ممانی— ذرا سر میں درد تھا اس لیے رقیہ اور شان کو گھر پر چھوڑ کر میں خود ہی آ گیا—'

'چلو اچھا کیا— حکیم صاحب بھی دو دنوں سے بہت یاد کر رہے تھے...... کہہ رہے تھے۔ نئے زمانے کی نئی ہوا ہے۔ بچے رشتے ناطے ہی بھول گئے۔'

'نہیں ممانی— ایسی بات نہیں ہے۔ اب دیکھئے۔ ایک چھوٹا سا اسکول چلا رہا ہوں— اسکول کی مصروفیت بھی کم نہیں رہتی— پھر گھر کی مصروفیت الگ— وقت کہاں بچتا ہے—'

'ہاں یہ بھی صحیح کہا— وقت کہاں ہے— یہاں تو پہلے میں سلائی کے کاموں میں مصروف رہتی تھی مگر اب اللہ کی دعا سے مریض اتنے آنے لگے کہ حکیم صاحب نے میرا کام ہی بند کرا دیا— کہ اب گھر میں رہو— اور گھر کے کام دیکھو— بس سارا دن کھانا بناتے رہو اور حکیم صاحب کے خاص دوستوں کے لیے چائے ناشتہ کا انتظام کرتے رہو—' ممانی ہنس رہی تھیں— مگر یہ اچھا لگتا ہے رحمٰن میاں— بس یہ نادرہ سمجھ میں نہیں آتی— جانے کس مٹی کی بنی ہے۔

'میں بھی نادرہ کی ہی باتیں کرنے آیا تھا— آخر بھائی ہوں اس کا۔ اماں بھی نادرہ پر جان چھڑکتی تھیں...... میں نادرہ کی طرف سے صفائی دے رہا تھا— مگر ممانی— آپ تو جانتی ہیں حقیقت— کچھ بچے اپنے وقت سے سمجھوتہ نہیں کر پاتے— نادرہ بھی سمجھوتہ نہیں کر پائی— بس یہی غلطی ہے......'

ممانی نے پھر ٹھہا کا لگایا— 'کیا میں اتنی بری ہوں رحمٰن میاں—ارے تقدیر کے لکھے کو کوئی کیسے روک سکتا تھا— پھر دو چار دن کی بات نہیں۔ اب ایمان سے ایک بات بتاؤ رحمٰن میاں— میں کیوں چاہوں گی کہ میرے گھر میں خوش حالی کی جگہ ہر وقت ناراضگی کا ماحول رہے۔ میں تو ٹھہری جی کھول کر ہنسنے والی— لیکن بھیّا، کتنی بار منت حضوری کروں— سو پیار سے سمجھا کر دیکھ لیا— وہی محاورہ— پتھر پر گھاس نہیں اگتی۔ دو ہاتھوں سے ہی تالیاں بجتی ہیں رحمٰن میاں— ایک ہاتھ سے نہیں بجتی—'

ممانی کے بارے میں اڑتی ہوئی افواہیں میں نے بھی سنی تھی۔ مگر ممانی کا کہنا واجب تھا—اور ممانی کی باتوں سے سچائی بھی جھلک رہی تھی۔

ایک بات کہوں، برا تو نہیں مانو گے رحمٰن میاں—'

بالکل بھی نہیں—

مجھے شک ہے، لیکن اب میرا یقین پختہ ہوتا جا رہا ہے......'

'کیسا یقین— کیسا شک......؟'

'ارے نادرہ کو لے کر......'

'میں کچھ سمجھا نہیں ممانی......'

'میں نے ان سے بھی ابھی تک ذکر نہیں کیا ہے— مگر نادرہ کی حرکتیں دیکھ کر......اب میں تمہیں کیسے سمجھاؤں......'

'آپ پہیلیاں مت بجھایئے ممانی— جو بات دل میں ہے وہ زبان پر لے آیئے— مجھے معلوم ہے اگر آپ کو کسی طرح کا کوئی شک ہے تو اس کے پیچھے منطق بھی ہوگی—'

'ممانی کچھ دیر تک سوچ میں گم رہیں۔

'تم بھی مجھے برا سمجھو گے رحمٰن میاں—'

'بالکل نہیں ممانی— آپ بغیر کسی جھجک کے کہیے—'

اس بار ممانی نے پھسپھسانے والے لہجے میں کہا— مجھے شک ہے کہ نادرہ پر سحر کیا گیا ہے۔ میں نے کئی بار اکیلے میں اسے خود سے باتیں کرتے ہوئے سنا ہے۔'

'کیا؟'

میرے ذہن میں اچانک پٹاخے پھٹنے لگے تھے......

'اب سحر تو ہوتا ہے میاں— سحر سے تو انکار نہیں کروگے......'

مجھے ممانی کی بات بالکل جھوٹی تک رہی تھی۔ کوری افواہ— لیکن یہی موقع تھا، جو میں دیر سے تلاش کرنے کی کوشش کر رہا تھا— اور ممانی نے خود مجھے یہ موقع دے دیا تھا۔

'لیکن جب تک نادرہ حویلی میں تھی، بالکل ٹھیک تھی ممانی......'

'اوپری ہوائیں تو اچانک اپنے اثر میں لیتی ہیں— کیا پتہ کبھی چھت پر گئی ہو— یا کبھی......'

'مجھے سوچنے دیجئے......'

میں نے کچھ دیر تک سوچنے کا ناٹک کیا— 'ہاں ممانی— چھت پر تو جاتی تھی نادرہ لیکن......وہ ایک دن......'

'ایک دن کیا......؟'

آپ نے تو سنا ہی ہوگا کوٹھی میں نور محمد کی والدہ کا انتقال ہوا تھا— ان پر جنات سوار تھا—'

'ہاں......' ممانی نے سر ہلایا۔

'جب نور محمد کی والدہ کا انتقال ہوا تھا، اماں کے ساتھ نادرہ بھی ان کے گھر گئی تھی......'

'لے......پکڑ لیا— ارے— نادرہ کو وہاں لے جانے کی کیا ضرورت تھی؟ جن آسیب تو مرنے کے بعد بھی جگہ نہیں چھوڑتے۔'

'ہاں یہی بات سفیان ماموں نے بھی کہی تھی۔'

'بالکل درست بات — اب سمجھ میں آیا۔ اچھا یہ بتاؤ رحمٰن میاں، کیا وہاں سے لوٹنے کے بعد نادرہ خوش تھی......؟'

مجھے یاد آیا، یہی موقع تھا جب سفیان ماموں کی شادی کی بات چلی تھی اور نادرہ سارا دن روتی رہتی تھی —

'نہیں ممانی — اس دن کے بعد سے میں نے نادرہ کو کبھی خوش نہیں دیکھا —'

'بس — میری بات سولہ آنے سچ — یہی ہوا — وہ کوٹھی گئی اور مرحومہ کا سایہ اس کے سر آ گیا۔ کبھی اسے اکیلے میں دیکھو — خود سے باتیں کرتی ہے۔ اپنے آپ ہی ہنستی ہے — لیکن اب کیا کیا جائے رحمٰن میاں۔ جوان لڑکی کو ایسے تو نہیں چھوڑا جا سکتا۔'

'کچھ تو سوچنا ہی ہوگا ممانی — آخر گھر کی لڑکی ہے۔ آپ سفیان ماموں سے کیوں نہیں بات کرتیں —'

'نہیں رحمٰن میاں۔ میں موقع دیکھوں گی — پھر ان سے بات کروں گی۔ کیا تم جھاڑ پھونک پر یقین رکھتے ہو۔ یہاں سنتے ہیں، تالاب والی مسجد کے پاس ایک صوفی رہتے ہیں وہ جن بھوت بھگاتے ہیں —'

'لیکن اس سے بڑا سوال ہے۔ کیا نادرہ آپ کے ساتھ وہاں جانا پسند کرے گی ممانی — وہ تو آپ کی کسی بات کا سیدھا جواب بھی نہیں دیتی —'

'ہاں یہ بات بھی سولہ آنے سچ — اور حکیم صاحب تو لے جانے سے رہے — پھر کیا کیا جا سکتا ہے رحمٰن میاں —

'شادی......'

'شادی —؟'

ممانی چونک کر بولیں۔ یہ کیا کہہ رہے ہو رحمٰن میاں —

'ایسی لڑکیوں کا حل شادی ہی ہے ممانی — کبھی کبھی ایسی لڑکیاں شادی سے ٹھیک ہو جاتی

ہیں—‘

’اور میں نے سنا ہے کہ شادی کے بعد جنات ایسی لڑکیوں کو زیادہ پریشان کرتے ہیں—‘

’یہ تو تقدیر کی بات ہے ممانی— کچھ جن اچھے بھی ہوتے ہیں— جو شادی کے بعد ناحق عورت کو پریشان نہیں کرنا چاہتے—‘

’یہ بات بھی سولہ آنے سچ......لیکن کوئی ڈھنگ کا لڑکا بھی تو ہو......ممانی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا—ایک وہ لڑکا آتا ہے۔ بڑے پیسے بنا رہا ہے— مجھے پسند بھی ہے......‘

’نور محمد؟‘ میرے دماغ میں پھر دھماکے ہونے لگے تھے......

’ہاں—وہی—‘

’ارے ممانی— جس کوٹھی میں جانے سے نادرہ پر سحر ہوا، کیا آپ اسے دوبارہ وہاں بھیجنا پسند کریں گی۔

’ارے نہیں— توبہ توبہ۔ میں بھی کیا سوچنے لگی—‘ ممانی نے پیار سے اپنے گال تھپتھپائے—یہ تو بھول ہی گئی تھی کہ اس کوٹھی میں جنات کا بسیرا ہے۔ اللہ اللہ حکیم صاحب بھی نادرہ سے بہت پیار کرتے ہیں۔ پیار تو میں بھی کرتی ہوں— نہیں رحمٰن میاں— اللہ توبہ— اس خاندان میں تو بالکل نہیں—

’لڑکوں کی کمی ہے ممانی— آج سارے لڑکے اچھا کما رہے ہیں— خاندان میں بھی کتنے ہی اچھے لڑکے مل جائیں گے—‘

’سولہ آنے سچ—‘ ممانی نے پھر ٹھہاکا لگایا— حکیم صاحب کو آنے دو— میں ان سے نادرہ کے بارے میں باتیں کرتی ہوں۔ ارے— گفتگو کے درمیان تمہیں چائے ناشتہ کے بارے میں پوچھنا ہی بھول گئی— ٹھہرو— میں چائے بناتی ہوں—‘

ممانی چائے بنانے چلی گئیں۔

میں جس مقصد سے آیا تھا وہ پورا ہو چکا تھا— میں نے ٹھنڈی سانس لی—

وان گاگ کی وہ تصویر اب بھی میری نگاہوں میں گھوم رہی تھی...... جہاں ایک ہی چہرے میں دو مختلف جذباتوں کی ترجمانی کی گئی تھی—

میں آہستہ سے مسکرایا— میں نے انتہائی کامیابی کے ساتھ اپنا مہرہ چلا تھا— اب دیکھنا یہ تھا کہ نور محمد اپنی جانب سے کیا کارروائی کرتا ہے— تاریخ کی کتابیں پڑھتے ہوئے میں یہ ضرور سیکھ گیا تھا کہ دشمن کو کبھی خود سے کمزور نہیں سمجھنا چاہئے۔

اور یہاں میرا سب سے بڑا دشمن نور محمد تھا—

(۴)

اس کے ٹھیک دوسرے دن شام کے وقت نور محمد مجھ سے ملنے آیا تھا۔ ایک بڑی عمارت کا ٹھیکہ اسے ملا تھا— وہ بہت خوش نظر آ رہا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں نادرہ سے ملنے گیا تھا— اور میری حکیم صاحب اور ان کی اہلیہ سے بھی گفتگو ہوئی—

میری بات پر اس کا چہرہ کھل گیا تھا—

'مجھے یقین ہے، آپ نے ضرور میرے لیے بات کی ہوگی—'

میرے دل کو اس کی بات سے دھکا پہنچا تھا— لیکن میں مسکرایا—

'تمہاری ہی تو بات کرنے گیا تھا—'

'پھر کیا باتیں ہوئیں؟'

'میں نے ممانی سے تمہاری دل کھول کر تعریف کی— انہیں بتایا کہ نادرہ کو تم سے بہتر لڑکا نہیں ملے گا—'

فرطِ جذبات سے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ اس نے میرے ہاتھوں کو چوم لیا—

'میں جانتا ہوں، آپ مجھ سے کس حد تک محبت رکھتے ہیں۔ آپ جو بھی کریں گے میری

بہتری کے لیے کریں گے......'

وہ اپنے خوابوں میں ڈوب گیا تھا۔

'ایک بات بتاؤں بھیّا— میں نے تو پوری پلاننگ کر رکھی ہے— جب نادرہ گھر میں آئے گی، سارے کمرے کو اس کی تصویروں سے سجادوں گا۔ خوب بڑی بڑی تصویریں—'

اس کی نظر میز کی طرف گئی۔ یہ وہی کاغذ تھا جس پر کل رات میں آڑی ترچھی لکیریں کھینچ رہا تھا۔ وہ تعجب سے اور کچھ مسکرا کر اس تصویر کو دیکھ رہا تھا—

'یہ تصویر آپ نے بنائی ہے......'

'ہاں......'

'میں رکھ لوں اسے......آپ کا تحفہ سمجھ کر......'

ایک بار پھر میرے دل کو دھکّا لگا تھا۔ یہ وہی تصویر تھی جسے بناتے ہوئے میرے ذہن میں نادرہ کا چہرہ تھا۔ مگر جب لکیریں مکمل ہوئیں تو ان آڑی ترچھی لکیروں میں مجھے نور محمد کا چہرہ نظر آرہا تھا— مجھے اس بادشاہ کی کہانی یاد آرہی تھی جس نے اپنے ملک کے سب سے بڑے مصور کو بلا کر اپنی تصویر بنانے کے لیے کہا تھا— مصور کی ایک محبوبہ تھی اور مصور ہمہ وقت اس کے خیالوں میں گم رہتا تھا۔ جب تصویر مکمل ہوئی اور بادشاہ اس تصویر کو دیکھنے آیا تو وہ خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا اور مصور کو موت کی سزا سنادی— مصور نے بادشاہ کی جگہ محبوبہ کی تصویر بنادی تھی—

'رکھ لوں اسے......؟' نور محمد پوچھ رہا تھا......

'ارے......کیا کروگے اس کا......؟ بس یونہی آڑی ترچھی لکیریں ہیں یہ— تمہارے کس کام آئیں گی—'

'میں بھیّا کے اس ہنر سے واقف نہیں تھا— میں اسے فریم کرا کے اپنے کمرے میں لگالوں گا۔

عقیدت کے ساتھ اس نے آڑی ترچھی لکیروں والے اس چہرے کو چوم لیا۔ میں مسکرا رہا

تھا۔ بھلا نور محمد کو کیا معلوم کہ یہ تصویر کس کی تھی۔ لیکن اس تصویر کو بناتے ہوئے میں۔ رقابت اور حسد کی آگ میں جل رہا تھا— اور تصویر کو بغور دیکھنے پر یہ عکس نمایاں تھا—

وہ دوبارہ نادرہ کی باتیں لے کر بیٹھ گیا تھا—

'وہ بے حد پیاری لڑکی ہے۔ ایک بے حد معصوم سی گڑیا— اس نے زندگی میں بہت دکھ دیکھے ہیں— شادی کے بعد میں اس کی زندگی خوشیوں سے بھر دوں گا۔ کچھ اس طرح کہ وہ کبھی بھی پیچھے پلٹ کر اپنے گزرے کل کو نہ دیکھ پائے— آپ جانتے ہیں بھیّا— آج کل میں ضرورت سے زیادہ محنت کر رہا ہوں۔ صرف نادرہ کے لیے— کہ نادرہ کے پاس دولت کی کوئی کمی نہ ہو۔ وہ جو بھی خیال کرے اس کے پاس حاضر ہو جائے—'

اس کی آنکھیں مستقبل کے خوابوں میں الجھ گئی تھیں۔

'بس جلدی سے ان لوگوں کی طرف سے ہاں کرا دو بھیّا— اور میں جانتا ہوں یہ کام صرف آپ ہی کر سکتے ہیں۔ مجھے بہت جلدی ہے بھیّا۔ میں نادرہ کو اور زیادہ مصیبت میں نہیں دیکھ سکتا......'

ایک لمحے کو مجھے لگا، نادرہ نے میرا ہاتھ جھٹک کر، نور محمد کا ہاتھ تھامنے میں کوئی غلطی نہیں کی— شاید نادرہ نے نور محمد کے اندر کے معصوم اور بھولے بھالے انسان کو دیکھ لیا تھا— مجھے یاد آیا، شروعاتی ملاقاتوں میں وہ مجھ سے باتیں کرنا بھی پسند نہیں کرتی تھی— اور جب اس نے بات کا آغاز کیا تو پہلی بار جو جملہ اس کے منہ سے ادا ہوا تھا— وہ تھا— تم بہت بدمعاش ہو......

میں نے ان آوارہ خیالوں کو جھٹک دیا— مجھے کسی قیمت پر بھی نادرہ کے لیے نور محمد کا ساتھ پسند نہیں تھا اور نور محمد تھا کہ سب سے زیادہ بھروسہ اسے میری ذات سے ہی تھا۔ پتہ نہیں یہ قدرت کا کھیل تھا، یا کیا تھا— شاید جسے اس وقت ہم دونوں سمجھنے سے قاصر تھے۔

●●

نور محمد مسکرا کر میری طرف دیکھ رہا تھا—

ایک بات بتاؤں بھیّا—

ہاں......

'تم مجھے پاگل سمجھو گے بھیّا— لیکن ہر پیار کرنے والا شاید پاگل ہی ہوتا ہے......'

اس نے نظر جھکالی تھی۔

'شرمانے کی ضرورت نہیں ہے بتا......' میرے اندر اب بھی پٹاخے چھوٹنے کی دھمک جاری تھی......

'مجھے یقین تھا— شادی کے بعد مجھے بیٹی ہوگی— بالکل نادرہ کی طرح...... تیکھے تین نقش— ایک پیاری سی بیٹی جس میں میرا نہیں صرف اور صرف نادرہ کا عکس ہو— اور میں نے تو ابھی سے اپنی بیٹی کا نام بھی سوچ لیا ہے......'

'اچھا......'

'نگار—'

نور محمد نے پلٹ کر میری طرف دیکھا— نگار محمد— نگار...... میری بیٹی...... پیارا سا نام ہے نا......ن سے نادرہ اور ن سے نگار—' وہ ہنس رہا تھا— اور ن سے نور محمد......'

میرے اندر ایک بار پھر دھماکے تیز ہوگئے تھے۔ میں اس کے معصوم چہرے کو دیکھ رہا تھا— وہ بغیر کسی جھجک کے اپنے تمام راز مجھ پر کھول رہا تھا۔ یہ جانے بغیر کہ اس وقت میرے دل میں کیا چل رہا ہے— اور تقدیر کو کیا منظور ہے—

●●

لیکن تقدیر کے آگے میری شکست ہوئی تھی۔

اور معصوم نور محمد کی محبت جیت گئی تھی—

سفیان ماموں نے اس رشتے پر اپنی منظوری کی مہر لگا دی تھی — اس کا ایک پہلو جو میری سمجھ میں آ رہا تھا، وہ یہ تھا کہ شاید وہ جلد از جلد اس بوجھ کو اپنی زندگی سے اتار پھینکنا چاہتے تھے — اس لیے نہ آسیب کام آئے اور نہ جنّات — نہ منحوس کوٹھی سے وابستہ واقعات کام آئے — اور انہوں نے اپنی طرف سے اس شادی کو ہری جھنڈی دے دی......

پھر دھوم دھام سے یہ شادی ہو گئی — نور محمد میری محبت کا قرضدار تھا — اسے بار بار یہی خیال آتا تھا کہ اگر میں اپنی جانب سے اس کی شادی کی بات نہیں چھیڑتا تو شاید یہ ممکن نہیں تھا —

●●

تو شادی ہو گئی — اور قارئین — اب آپ کو ایک بار پھر یہاں ٹھہرنا ہوگا — کیونکہ بدلتے وقت کو شاید اسی شادی کا انتظار تھا — نور محمد کو اندازہ نہیں تھا کہ شادی کے اس پردہ میں وقت کتنی بھیانک اور خوفزدہ کرنے والی کہانی تحریر کرنے جا رہا ہے......

اس درمیان پچھلے تین چار برسوں میں ملک کا نقشہ بدل گیا تھا —

اور یہ وہی زمانہ تھا جب ہندستان اور پاکستان اچانک آمنے سامنے آ گئے تھے۔ ہندستان میں چاروں طرف اندرا گاندھی کی گونج تھی۔ ہندستانی اخبار نے شیخ مجیب الرحمٰن کو ایک ہیرو کی طرح پیش کیا تھا — اور ادھر پاکستانی اخبار مسلسل ہندستان کے خلاف آگ اگل رہے تھے — مشرقی پاکستان سلگ رہا تھا — اور یہ بھی کہا جا رہا تھا کہ پاکستان کی تقسیم کا منصوبہ دراصل اندرا گاندھی کا منصوبہ تھا جسے تیار کر کے شیخ مجیب الرحمٰن کو دیا گیا تھا۔ پاکستان بننے کے بعد سے ہی مغربی پاکستان کی قیادت کو مشرقی پاکستان سے خطرے کی بو آنے لگی تھی۔ اس کی وجوہات صاف تھیں۔ ایک تو یہ کہ بنگالی بولنے، مچھلی کھانے والا یہ علاقہ بہت بڑا علاقہ تھا اور ممکن تھا کہ آنے والے وقتوں میں حکومت کی کمان بنگالیوں کے ذمّے سونپ دی جاتی — مغربی پاکستان کی اسی نفرت سے بنگلہ قوم پرستی کا جنم ہوا تھا — یہ نفرت آہستہ آہستہ بڑھتی جا رہی تھی — مغربی پاکستان کی سرکاری زبان اردو تھی جبکہ مشرقی پاکستان کے لوگ بنگلہ زبان کو وہی درجہ دیئے جانے کے حق میں تھے، جو درجہ اردو کو

حاصل تھا—

پاکستان بارود کے ڈھیر پر کھڑا تھا—

نفرتیں اپنی انتہا پر تھیں— بھٹو اور شیخ مجیب الرحمٰن کے نام بچوں بچوں کی زبان پر تھے۔ آخر کار 16 دسمبر 1971 کو مشرقی پاکستان الگ ہو گیا لیکن اس کے نتائج کے طور پر ہندستانیوں کے دل بھی دھڑک گئے تھے— جیسے میں یاد کرتا ہوں تو ممانی دونوں ملکوں کی اس سیاست سے خاصہ بے چین نظر آتی تھیں۔ ان کے بھائی مشرقی پاکستان میں تھے اور ان دنوں وہاں سے صرف لوگوں کے مرنے اور بھاگنے کی خبریں ہی موصول ہو رہی تھیں— یہ اتفاق ہی تھا کہ شادی کے بعد کی زندگی نے ممانی کو اچانک اس حادثہ سے دور کر دیا تھا— جیسے اچانک وہ سفیان ماموں سے سوال کرتیں۔

وہاں سب ٹھیک ہو گا نا......

'ہاں—'

سنتے ہیں کہ 15 لاکھ لوگ مارے گئے—؟

'ارے سب خبر ہے۔'

'میرے بھائی......زندہ تو ہوں گے نا......؟ وہ اپنے ایک دور کے رشتہ دار بھائی کو یاد کرتی تھیں، جو مشرقی پاکستان میں تھے۔

'لو زندہ کیوں نہیں ہوں گے— ارے آج کل راستے بند ہیں۔ جنگ کا ماحول ہے— خط کا آنا بھی بند ہے۔ آجائیں گے—'

ممانی کو تسلی ہو جاتی—

ملنے والے آجاتے تو مشرقی پاکستان کی خبریں دوبارہ سلگ جاتیں— سفیان ماموں اس کے لیے ہندستان کو ذمہ دار ٹھہراتے تھے۔ وہ غصے میں کہتے—

'یہ پوری سیاست اندرا کی ہے—

میں مسکرا کر کہتا— آپ کو پاکستان میں ہونا چاہئے تھا۔ ماموں یہاں کیسے آ گئے— ماموں اس بات پر برہم ہو جاتے— ’کتابیں بھی پڑھا کرو رحمٰن— کم سے کم اردو اخبار تو پورا پڑھا کرو— پاکستان کی تقسیم تو ایک دن ہونی ہی تھی— اور اس کے لیے کوششیں تو اسی وقت شروع ہو گئیں جب 16 اکتوبر 1951 وزیراعظم لیاقت علی خاں کا قتل کیا گیا—‘

’اب لیاقت علی خاں کے قتل سے سقوط ڈھاکہ کا کیا تعلق......؟

’تعلق ہے کیسے نہیں—‘ ماموں زور سے بولتے ہوئے ٹھہر جاتے— لیاقت علی خاں کے قتل کے بعد وہاں فوج کی بے جا مداخلت شروع ہو گئی— کوئی قانون نہیں تھا— صورتحال تب سے ہی زیادہ خراب ہوئی۔ شیخ مجیب نے مشرقی پاکستان کی طرفداری میں 6 نکاتی پروگرام جاری کیے اور 1966 میں انہیں گرفتار کر لیا گیا۔ 1969 میں یحییٰ خان آ گئے— انتخاب ہوا— عوامی لیگ نے سب سے زیادہ سیٹیں حاصل کیں— پیپلز پارٹی کی مشرقی پاکستان میں کارکردگی زیرو رہی— مینڈیٹ کے مطابق عوامی لیگ کو حکومت بنانی تھی اور شیخ مجیب الرحمٰن کو ملک کا وزیراعظم بننا طے تھا۔ لیکن پارلیامنٹ کا اجلاس نہیں بلایا گیا۔ یحییٰ ان بنگالیوں کو اقتدار سے دور رکھنا چاہتے تھے۔ ادھر شیخ مجیب صوبائی خودمختاری کا مطالبہ کر رہے تھے۔ اور اس آگ کو اندرا جی ہوا دے رہی تھیں— اکتوبر 1971 سے ہی ہندستانی فوج بھی بنگلہ دیش پہنچ چکی تھی۔ چٹگانگ سے ہوتے ہوئے ہندستان فوج نے سلہٹ سیکٹر پر قبضہ کر لیا تھا— مجیب تو اندرا کے اشاروں پر مکتی باہنی کا سہارا لے کر پاکستان کے سینے میں کیل ٹھوکنے کا کام کر رہے تھے—‘

مجھے ہنسی آ جاتی— یعنی غلطی آپ کی۔ لڑیں بھی آپ— اور قصور ہندستان کا؟ عوامی لیگ زیادہ سیٹیں لیکر آئی تو مجیب کو وزیراعظم کیوں نہیں بنایا؟ بنا دیتے تو کوئی مسئلہ ہی سامنے نہ آتا—‘

’ایسے کیسے بنا دیتے......‘ ماموں کا چہرہ غصے میں سلگ رہا ہوتا— بری خبر ہے۔ بہت سے لوگوں کے مرنے کی خبریں آ رہی ہیں— مکتی باہنی اور ہندستانی فوج نے بہت نقصان پہنچایا ہے وہاں— لوگ نیپال اور دوسرے راستوں سے بھاگ کر ہندستان میں پناہ لے رہے ہیں—‘

سفیان ماموں کی آواز درد میں ڈوب جاتی— پتہ نہیں۔ پاکستان کی کتنی تقسیم ابھی اور باقی ہے— بلوچستان، سندھو دیش، جناح پور، وزیرستان، پشتونستان...... خدا خیر کرے— برق گرتی ہے تو بیچارے مسلمانوں پر......'

خبروں کا سب سے زیادہ اثر سفیان ماموں پر تھا— وہ چپ رہنے لگے تھے— شاید پاکستان اب ان کے لیے صرف ایک خواب تھا۔ ایک ڈراؤنا خواب— وہ اس ڈراؤنے خواب کو بھول جانا ہی بہتر سمجھتے تھے۔ بھولے بھٹکے پاکستان کا تذکرہ بھی ہو جاتا تو وہ پن ڈبہ سے پان نکال کر چباتے ہوئے ٹہلنا شروع کر دیتے—

'ایک مشرقی پاکستان کیا' ابھی اس پاکستان کے کئی حصے ہونے باقی ہیں—'

'خدا نہ کرے—'

'خانہ جنگی ہے— میں سب کچھ لٹتا ہوا، برباد ہوتا ہوا دیکھ رہا ہوں......'

اور یہ وہی دور تھا جب شیخ مجیب کے ہاتھوں میں بنگلہ دیش کی قیادت آ گئی تھی— ہندستان اور پاکستان کے درمیان فاصلے بڑھ گئے تھے—

اور یہاں ان بے رحم جنگوں اور خون خرابہ سے کہیں زیادہ بے رحم اور خوفناک کہانی کی شروعات ہو گئی تھی—

●●

یادوں کی ریل چلتے چلتے ٹھہر گئی تھی......

میں نے دیکھا— میں پوری طرح پسینے میں بھیگ چکا ہوں— مجھے پروفیسر نیلے کی یاد آ رہی تھی— اب ان سے ملنا ضروری ہو گیا تھا۔

(۵)

پرفریب پہاڑیاں

پروفیسر نیلیے باہر صحن میں ہی مل گئے — ان کی اہلیہ دوایک دنوں سے بیمار چل رہی تھیں۔

’کیا ہوا ہے بھابھی کو؟‘

’نہیں کوئی خاص بات نہیں ہے — لیکن اس عمر میں صحت کا خیال رکھنا پڑتا ہے — سارہ کیسی ہے؟‘

میں نے بتایا — سارہ واپس ڈیڈی اور ممی کے پاس چلی گئی۔

’تب تو سنّاٹا ہو گیا ہوگا —‘

’ہاں لیکن ابو بابا اور حلیمہ کی وجہ سے گھر گلزار لگتا ہے۔ دونوں ہر وقت لڑتے رہتے ہیں۔

میں نے مختصراً یہ ساری کہانی اُنہیں سنا دی تھی — نور محمد اور نادرہ کی شادی کی بات پر وہ کچھ دیر کے لیے اُداس ہوئے۔ میری طرف دیکھا — پھر پلٹ کر آس پاس کے درختوں اور پہاڑی سلسلے کو دیکھنے لگے......

وہ آہستہ سے بولے...... کچھ باتیں میری سمجھ میں آ رہی ہیں۔ چلیے — باہر سیر کرتے ہوئے گفتگو کرتے ہیں۔

ہم باہر آ گئے — ماحول میں خنکی تھی۔ میں نے اپنا پورا خیال رکھا تھا۔ اس وقت بھی منکی کیپ میرے چہرے سے چپکی ہوئی تھی۔

’بیحد خوفناک......لیکن آپ کے یہاں ایک ایمانداری ہے۔ آپ خود کو چھپانے کی کوشش نہیں کرتے......بالکل پہاڑوں کی طرح...... اب یہ دیکھئے......‘ ہم پہاڑی راستوں پر آ گئے تھے......

پروفیسر نیلے میرا دھیان ہٹانے کی کوشش کر رہے تھے...... بالکل پہاڑوں کی طرح — جو جیسے ہیں، ویسے ہی نظر آتے ہیں۔ ہاں بے رحم انسان انہیں کاٹتا ہی چلا جا رہا ہے......اور وہ یہ بھی نہیں سوچتا کہ پہاڑ اور درخت ختم ہو جائیں گے تو وہ بھی نہیں بچے گا۔ اور ایسا کرتے ہوئے وہ بھیانک تباہی کی طرف بڑھ رہا ہے......

'آپ سچ کہتے ہیں۔'

پروفیسر نیلے نے اشارہ کیا — سڑک کے دونوں جانب شیشم کے درخت دیکھ رہے ہیں۔ یہ شیر شاہ سوری نے لگائے تھے۔ وہ ان درختوں اور پہاڑوں کی عظمت کا قائل تھا — کہ اگر کبھی کسی مسافر کو چھاؤں کی ضرورت محسوس ہو تو وہ یہاں سانس لینے کے لیے ستا سکے۔ لیکن اب پہاڑ ہی ختم ہوتے جا رہے ہیں — شیشم، چیڑ اور دیار کے درخت اس انداز سے کاٹے گئے کہ پرانی رونقیں ہی ختم ہو گئیں — آپ کو ایک دلچسپ بات بتاؤں کاردار صاحب — یہاں کچھ ایسے درخت بھی ہیں جن کی جڑیں اپنی خوراک پانی سے خود ہی جنم لیتے ہوئے حاصل کر لیتی ہیں۔ ہے نا دلچسپ اور عجیب و غریب — ان سے صحرا بھی سرسبز ہو جاتے ہیں۔ اور ایسے درخت اونچائی پر بھی، خود ہی اپنی جڑوں سے پانی کا بندوبست کر لیتے ہیں — نیچر، قدرت...... وہ دھیرے دھیرے بڑبڑائے — ہم سب قدرت کی کٹھ پتلیاں ہیں۔ تم کچھ اور سوچ رہے تھے، قدرت کوئی اور فیصلہ لے رہی تھی —'

میں نے آہستہ سے کہا — آپ سچ کہتے ہیں اور یہ بات ہم انسان نہیں سمجھ پاتے کہ اصل فیصلہ تو قدرت کے اختیار میں ہے۔

'ترقی کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے انسان بھول گیا کہ قدرت کے انتقام لینے کے اپنے طریقے ہیں — وہ نظریات پہ نظریات اور نئی نئی اخلاقیات کا سہارا لیتا رہا — لیکن اس پردے میں آخر آخر تک صرف ایک ہی بات ہوتی رہی — اس پورے نظام نے فرد کو تنہا کر دیا۔ مشین کا ایک بے جان کل پرزہ — جہاں خواہشات نفس کی تسکین کے سوا کوئی دوسری خوشی اس کے لیے باقی نہیں بچی تھی —'

ٹھنڈی ہوا بہہ رہی تھی— ہم دونوں ایک اونچے سے ٹیلے پر بیٹھ گئے۔ یہاں سے آس پاس کی دلکش وادیاں قدرت کی صنّاعی کو داد دینے پر مجبور کر رہی تھیں۔

پروفیسر نیلے ہنسے— تم نے وہ خبر پڑھی۔ نیوزی لینڈ کی عورت نے اپنے گھر سے دو بھوت پکڑے۔ ایک بوتل میں بند کیا اور آن لائن خریدار بھی مل گئے— ہم ایک ایسے عہد میں ہیں جہاں کچھ بھی بک سکتا ہے۔ دراصل اجتماعی و انفرادی طور پر ہمیں حیوان بنانے کی تیاری چل رہی ہے...... نئی قدریں تشکیل پا رہی ہیں— عیش و عشرت کی ثقافت کو فروغ دیا جا رہا ہے— اور دوسری طرف گلوبلائزیشن بازاروں کے لیے آسان راستہ کھول رہا ہے— اور نتیجے دیکھو کا ردار— کمنٹ مت کرو۔ کیونکہ تمام تر اخلاقیات کو لکھنے کا کام صرف قدرت کے حوالے ہے...... ہم صرف دیکھ سکتے ہیں۔ تبصرہ نہیں کر سکتے...... اور ایک دن......

پروفیسر نیلے ہنسے— پچھلے سال کی وہ سب سے گرما گرم خبر— برطانیہ میں ماں باپ بننے والے سب سے کم عمر جوڑے کی کہانی— تیرہ سالہ لڑکا ایلفی پیٹن اور اس کی پندرہ سالہ گرل فرینڈ— چنٹیلے سٹیڈمین۔ میں نے ٹی وی پر دیکھا تھا۔ تصویر میں ایلفی اپنی عمر سے اور کم نظر آتا تھا۔ اور یہ دونوں ایک ننھی سی بچی کو گود میں اٹھائے تھے— اور اس بچی کو گود میں اٹھائے ہوئے دونوں بھائی بہن لگ رہے تھے...... آہ نیچر— کیا یہ معاشرے کی جنسی بے راہ روی کی کہانی تھی کا ردار؟ جیسا کہ وہاں کی ٹوری پارٹی کے رہنماؤں نے کہا، کتنے افسوس کی بات ہے کہ برطانیہ میں بچوں کے بچے ہو رہے ہیں...... وہاں کے سماجی اداروں کی پریشانی یہ تھی کہ یہ بچے اپنے بچے کو کیسے پالیں گے۔ بچے کا خرچ کیسے اٹھائیں گے؟ وہاں کے سیکس پولس کی، چائلڈ پروٹیکشن ٹیم کو پہلے سے اس واقعہ کی جانکاری تھی— لیکن وہ سوائے تشویش کرنے کے کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی— دنیا کی کوئی بھی جنسی تعلیم ان بچوں کی آزادی کو بدل نہیں سکتی— تم لاکھ اخلاقیات، اخلاقیات چیختے رہو لیکن قدرت اپنی الگ اخلاقیات لکھنے میں مصروف ہے—'

میں نے خوف سے پروفیسر نیلے کا چہرہ دیکھا— ایک لمحے کو مجھے جھرجھری سی محسوس

ہوئی— نور محمد کا چہرہ لمحہ بھر کے لیے پتلیوں پر روشن ہوا...... میں نے سر کو جھٹک دیا، جیسے ابھی اس لمحے ان مرغزاروں کی جنت میں سب کچھ بھول جانے کی خواہش ہو......

آہ۔معاشرے میں یہ فرد کس قدر تنہا ہو گیا ہے۔ دیکھو تو کاردار۔ میرے بیٹے بہو امریکہ میں ہیں اور میں یہاں— تم یہاں ہو اور تمہارے بیٹے بہو کہیں اور— ایک عمر میں سب اکیلے ہو جاتے ہیں۔ اور سب کو انفرادی طور پر اپنے وجود کی جنگ لڑنی ہوتی ہے— کیونکہ قدرت ہمیں موت سے زیادہ زندگی سکھاتی ہے— مجھے دیکھو...... مجھے کبھی موت کا خیال نہیں آتا۔ ہم دونوں میں سے کوئی بھی، کبھی بھی یہ نہیں سوچتا کہ ایک چلا گیا تو دوسرے کا کیا ہوگا۔ قدرت یہ سارے انتظام خود کر دیتی ہے—'

وہ مسکرائے۔ اسی لیے ان پہاڑیوں سے حوصلہ اور مضبوطی لینے کے لیے سیر کو نکل پڑتا ہوں—' وہ اچانک چونکے— تم کہیں کھوئے سے لگتے ہو کاردار—'

'نہیں—'

'شاید ابھی بھی اپنی کہانی کی دنیا میں ہی جی رہے ہو—' وہ مسکرائے۔ 'نہیں ایسی بات نہیں ہے—'

وہ کھلکھلا کر ہنسے— اور میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ کچھ ایسی ہی بات ہے۔ تمہارے چہرے کا رنگ اڑا ہوا ہے— اور تمہاری آنکھیں فکر میں ڈوبی لگتی ہیں— آخر اس خط میں ایسا کیا تھا پروفیسر......'

میں جھلملاتی پہاڑیوں کو دیکھ رہا تھا۔ ہزاروں فٹ نیچے کی کھائیاں...... چکردار پہاڑیاں...... اور ان پہاڑیوں پر بنے ہوئے مکانات—

'چلو— واپس چلتے ہیں—'

پروفیسر نیلے، ٹیلے سے اٹھ کر کھڑے ہوئے—

'لیکن آج جانے نہیں دوں گا— تم نے میرے تجسس کو بڑھا دیا ہے—' وہ ہنس رہے

تھے۔ بڑھاپے میں اتنی بیقراری اچھی نہیں ہوتی— تمہیں بہترین چائے پلاتا ہوں— تب تک تمہارے پاس وقت ہے...... وہ دوبارہ مسکرائے— بکھری ہوئی کہانیوں کو سمیٹنے کا— اور میرے خیال میں گھر واپسی تک تم بہتر طور پر اس ذہنی ورزش کو انجام دے سکتے ہو—'

●●

میں گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا......

'......نادرہ کی شادی ہوگئی......اور میرے لیے جیسے اس سچ کو قبول کر پانا مشکل— شادی کے ایک ہفتہ بعد اس نے مجھے گھر آنے کی دعوت دی تھی— میرے لیے اس دعوت کو ٹالنا مشکل تھا— رقیہ بھی نادرہ کو دیکھنے کے لیے بے تاب تھی......

میرے دل و دماغ میں ایک بار پھر دھماکوں کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا—

(۶)

کوٹھی میں، میں اس سے قبل بھی کئی بار جا چکا تھا— مگر اب یہاں نور محمد کی حکومت تھی۔ میرے ساتھ رقیہ اور شان بھی تھے— شان اب چلنے لگا تھا— اس کی توتلی باتیں لطف دیتی تھیں۔ شان کو دیکھتے ہی نادرہ نے اسے پیار سے گود میں اٹھالیا— وہ مکمل طور پر پیار کے رنگ میں رنگ گئی تھی۔ اس نے ہلکے گلابی رنگ کا سوٹ پہن رکھا تھا اور اسی رنگ سے میچ کرتا ہوا دوپٹہ اس کے سینے سے جھول رہا تھا— کوٹھی کے کمرے کشادہ تھے۔ بلند حویلی کی طرح یہاں بھی چھتیں کافی اونچی تھیں— نادرہ اور نور محمد ہمیں لے کر اپنے ڈرائنگ روم میں آ گئے— چھت سے ایک بے حد حسین منقش فانوس جھول رہا تھا۔ یہاں پرانے زمانے کے آرام دہ صوفے لگے تھے— نور محمد ہمارے آنے سے کھل اٹھا تھا— اور یہ خوشی اس کے پورے وجود سے روشن ہو رہی تھی......

ارے بھیّا— یہاں بیٹھیے......

بھابھی آپ یہاں......شان کتنا پیارا ہو گیا ہے۔ ماشاء اللہ — اس نے نادرہ کو چائے اور ناشتہ کے لیے بھیجا — اور فرط جذبات سے سے میرا ہاتھ تھام لیا —

'بھیا — یہ خوشی آپ کی دی ہوئی ہے —'

تم پاگل ہو نور محمد — سب تقدیر کے کھیل......

'نہیں بھیا — تقدیر تو دور سے دیکھتی ہے۔ تدبیر تو ہم کرتے ہیں۔ آپ نے تدبیر نہ کی ہوتی تو شاید آج یہ خوشی میرے نصیب میں نہیں ہوتی...... میں زندگی بھر آپ کا احسان مند رہوں گا......

رقیہ نے پلٹ کر مجھے دیکھا......شان اس سے اٹھنے کی ضد کر رہا تھا — شان کو لے کر وہ نادرہ کا ہاتھ بٹانے چلی گئی —

اب اس ڈرائنگ روم میں ہم دونوں اکیلے تھے۔ میں اس کے چہرے کی خوشی پڑھ رہا تھا — میرے نہ چاہنے کے باوجود یہ شادی ہو گئی تھی — اور نور محمد ابھی بھی اس شادی کو میرا ہی کرشمہ سمجھ رہا تھا۔ وہ ابھی بھی میرے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیے تھا۔

'بھیا — میں اتنا خوش ہوں کہ بتا نہیں سکتا — میں سارے غم بھول گیا — آنکھیں کھولیں تو تب سے اماں پر جنوں کا سایہ دیکھتا آیا۔ یہاں کا ہر دن آنسوؤں میں ڈوبا تھا — خوشی کیا ہوتی ہے، یہ تو ہم جان ہی نہیں سکے — اور شاید نادرہ نہ ملی ہوتی تو ہم جان بھی نہیں پاتے کہ اصل خوشی کیا ہوتی ہے —'

'تم خوش نصیب ہو —' میں لفظ چبا رہا تھا — نادرہ سچ مچ بے حد اچھی لڑکی ہے — سارے گھر کو سمیٹنے والی —

'ہاں بھیّا — بے حد خوش مزاج اور محبت کرنے والی......' اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ بس دعا کیجئے گا، یہ محبت بنی رہے۔ میں نے اور نادرہ نے بہت دکھ دیکھے ہیں۔ دعا کیجئے گا کہ اب دکھ کی ہلکی سی پرچھائیں سے بھی ہمارا واسطہ نہ ہو......'

’ان شاء اللہ — ایسا ہی ہوگا نور محمد —‘

آمین — اس نے آہستہ سے کہا......

’آپ جانتے ہیں بھیّا — اسے پڑھنے کا کتنا شوق ہے — اچھا وہ دیکھیے — آپ تو بھول گئے ہوں گے — آیئے میرے ساتھ......‘

میں اس کے ساتھ چلتا ہوا صوفے کے دوسری طرف گیا اور اچانک میں چونک گیا تھا — ایک دن جب نور محمد میرے گھر آیا تھا تو میں پنسل سے ایک پینٹنگ بنا رہا تھا۔ نور محمد نے یہ پینٹنگ فریم کرا کے دیوار پر لٹکا دی تھی......

’یہ آپ کا تحفہ ہے بھیّا — دیکھئے — میں نے اس تحفہ کو عزت دی ہے —‘

لیکن شاید میں نے نور محمد کی بات سنی ہی نہیں — میں ایک ٹک اس تصویر کو دیکھ رہا تھا۔ آڑی ترچھی لکیروں میں جہاں ایک چہرہ بن گیا تھا اور یقیناً میں نے اس چہرے میں نور محمد کی جھلک دیکھی تھی — مگر ابھی......اس وقت — میرے سارے بدن میں سنسنی تھی۔

یہ کیسے ممکن ہے......؟

یہ تو ممکن ہی نہیں......؟

میری آنکھیں پھٹی پھٹی تھیں — آڑی ترچھی لکیروں نے اب چہرے کے نقوش صاف کر دیئے تھے۔ اور یہاں نور محمد کی جگہ اب نادرہ تھی — مگر مجھے ایسا لگا، جیسے نادرہ کی تصویر کے چاروں طرف پنسل کی باریک لکیروں سے میں نے مکڑی کے جالے بن دیئے ہوں — یعنی مکڑی کے مہین بنے گئے جالوں کے درمیان نادرہ......لیکن نادرہ کی آنکھیں مجھے خوفزدہ لگ رہی تھیں۔

’کیا ہوا بھیّا، کہاں کھو گئے —؟‘

میں اچانک اپنی دنیا میں واپس آیا۔ مسکرانے کی کوشش کی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں اپنی ہی بنائی گئی تصویر سے ڈر گیا تھا۔

نور محمد کی آنکھیں بھر آئی تھیں — آج سوچتا ہوں بھیّا — اماں اور ابّا زندہ ہوتے تو اُنہیں

کتنی خوشی ہوتی۔ نادرہ سب کا دل جیت لیتی— نادرہ ہے ہی ایسی کہ کوئی بھی اس سے ناخوش نہیں ہوسکتا۔ وہ سب کا دل جیت لیتی ہے۔ آپ نہیں جانتے بھیّا، وہ کتنی سمجھدار ہے۔ میرے ایک ایک اشارے کو سمجھ جاتی ہے۔ مجھے کچھ بولنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ میری تو دنیا ہی بدل گئی بھیّا— نادرہ سے ملنے سے پہلے نہیں جانتا تھا کہ یہ دنیا اتنی خوبصورت بھی ہوسکتی ہے— اور اب تو جیسے مسکراتی ہوئی کائنات میرے قدموں کے نیچے ہے— آپ نے ٹھیک کہا۔ میں شاید اس دنیا کا سب سے خوش قسمت آدمی ہوں......'

اس کی ہر میٹھی بات مجھے سوئیوں کی طرح چبھ رہی تھی۔ رقیہ بھی ایک پیاری اور سمجھدار بیوی تھی— مگر نادرہ کی اچھائیاں بیان کرتے ہوئے وہ میری رقابت کی آگ کو مزید بڑھا رہا تھا۔ میں مسکرانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن سچ یہ ہے کہ میں اندر ہی اندر سلگ رہا تھا۔ شاید نادرہ میری زندگی میں آتی تو یہ سارا سچ آج میرے حصے میں آتا— آج بھی تنہائی میں نادرہ کا احساس میرے جسم کو آگ کی بھٹی بنا دیتا ہے۔ اس کی گرم ہتھیلیاں......

اس کے ہونٹوں کا جادوئی لمس......

اس کے جسم کی ناقابلِ فراموش حرارت......

اس کا گود میں سمٹ آنا......شاید مجھے سب کچھ یاد آ رہا تھا......اور میرے جسم میں ہزاروں کی تعداد میں چونٹیاں سرسرا رہی تھیں......

نور محمد اٹھ کر قریب کے صوفے پر بیٹھ گیا تھا—

'اب تو شام کو دیر تک باہر رہنے کی خواہش ہی نہیں ہوتی بھیّا— نادرہ کا چہرہ یاد آتے ہی گھر پہنچنے کی جلدی ہو جاتی ہے......'

'بہت پیار کرتے ہو اس سے؟' میں نے مسکرانے کی کوشش کی۔

'جتنا بھی پیار کروں کم ہے بھیّا— اب محبت کوئی ترازو تو نہیں بھیّا— لیکن شاید جتنا بھی نادرہ کو چاہوں، وہ کم لگتا ہے— اور اس کی محبت......' اس کے لہجے میں جذبات سمٹ آئے تھے۔

'اس کی محبت میں سمندر کی لہروں سی تیزی ہے۔ کبھی کبھی سمجھ میں نہیں آتی اس کی محبت — میں کہتا بھی ہوں — بس کرو نادرہ — نظر لگ جائے گی — مگر نادرہ — وہ تو جیسے میرے سارے پچھلے غموں کے داغ دھونے آئی ہے...... مجھے کب اٹھنا ہے، مجھے کب کیا چاہئے۔ یا آگے مجھے کس چیز کی ضرورت ہوسکتی ہے۔ کیا آپ یقین مانیں گے بھیّا، وہ بزنس میں بھی میرا ہاتھ بٹانے لگی ہے — آپ تو جانتے ہیں یہ کنٹریکٹر اور بلڈر کا کام کتنا مشکل ہوتا ہے۔ بس بھاگتے رہیے۔ ایک عمارت سے دوسری عمارت...... پچاس لوگوں سے ملیے تو ایک بات بنتی ہوئی نظر آتی ہے — مگر نادرہ سے ملنے کے بعد......' اس کی آنکھوں میں چمک آ گئی تھی۔ اب تو حالات ہی بدل گئے۔ اب تو جیسے ہر کوئی مجھے ہی کنٹریکٹ دینے کو تیار نظر آتا ہے۔ نادرہ کہتی ہے — ہمیں غرور نہیں کرنا چاہئے۔ ہمیں پیسوں کی بچت کرنی چاہئے کیونکہ جس نے پیسوں کی قدر نہیں کی پیسہ بھی اس کی قدر نہیں کرتا — ٹھیک کہتی ہے نا بھیا — وہ یہ بھی کہتی ہے کہ پیسہ ہمیشہ برے دنوں کے لیے سنبھال کر رکھنا چاہئے — اب ہمیشہ ایک جیسے دن تو نہیں رہتے نا بھیّا — اس لیے ہمیں ہمیشہ آنے والے کل کی بھی خبر رکھنی چاہئے......'

'اسے پتہ نہیں تھا کہ میری حالت یہ تعریفیں سن سن کر کس قدر غیر ہوتی جا رہی ہے — میرے کان پھٹ رہے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے زیادہ دیر تک یہ مصنوعی مسکراہٹ میرے چہرے پر قائم نہیں رہے گی۔ میں چیخ پڑوں گا — مگر میں خود کو سنبھالے ہوئے تھا۔ اس لیے میں نے موضوع بدل دیا۔

'اچھا، حکیم صاحب کیسے ہیں —؟'

'پرسوں نادرہ کو لے کر وہاں گیا تھا — اب ان کی صحت بھی خراب رہنے لگی ہے۔ بنگلہ دیش کا زخم رسنے لگا ہے —'

'مریض آتے ہیں یا نہیں —'

'حکیم صاحب کے ہاتھوں میں اللہ نے شفا لکھی ہے — اس لیے آنے والوں کی کمی

نہیں۔مگراب حکیم صاحب صرف صبح کے وقت ہی ملتے ہیں—'

'اورممانی......؟' مجھے ڈرلگ رہا تھا کہ کہیں ایک بار پھر وہ نادرہ کا تذکرہ نہ چھیڑ دے—

'ممانی بھی اچھی ہیں— لیکن حکیم صاحب کی صحت کو لے کر فکر مند رہنے لگی ہیں— مجھ سے کہہ رہی تھیں کہ اب یہ مکان تو تمہارا اور نادرہ کا ہے— ہم تو نہیں بنا سکتے لیکن تم لوگ یہاں بھی رہ سکتے ہو۔ چاہو تو چھت کے اوپر بھی کمرہ بنا سکتے ہو— میں نے حکیم صاحب سے بات کی ہے— گھر کو ذرا سی مرمت کی ضرورت ہے بس— بالو اور سیمنٹ کی کمی تو رہتی نہیں۔ سوچتا ہوں گھر میں ہاتھ لگا دوں— خاص کر وہ کمرہ جہاں حکیم صاحب رہتے ہیں، اسی سے شروعات کروں— آپ نے تو دیکھا ہے— بے رونق سا کمرہ ہے— سفیدی ہوگئی تو کمرے میں چمک آ جائے گی۔'

'ہاں— یہ بھی صحیح ہے۔ حکیم صاحب بھی خوش ہو جائیں گے۔ مریضوں کی تعداد بھی بڑھ جائے گی—'

اندر سے ناشتہ کا بلاوہ آ گیا تھا— ہم اندر چلے آئے— ایک بڑی سی چوکی تھی— جسے تخت کہنا زیادہ مناسب ہوگا— تخت پر خوبصورت سی چادر بچھی تھی۔ گاؤ تکیے پڑے تھے— شان ننھے منّے قدموں سے سارے گھر میں دوڑ رہا تھا— میں نے نادرہ کو دیکھا جو اس کے پیچھے بھاگ رہی تھی......

'شان— ٹھہرو......'

دوڑتے ہوئے ایک لمحے کو اس کا آنچل سینے سے ہٹ گیا تھا— اس نے ترچھی نظر سے میرا جائزہ لیا— مجھے دیکھتے ہوئے بھی ایک خوبصورت سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر تھی۔

وہ ہنس رہی تھی......شان نے تھکا دیا مجھے— اس کے جسم میں تو بجلی بھری ہے......'

میری آنکھیں اس کے جسمانی خطوط پر مچل رہی تھیں— شاید یہ دنیا کا سب سے حسین جسم تھا— اور اب یہ حسین جسم نور محمد نے مجھ سے چھین لیا تھا— میں برابر ترچھی نظروں سے اس کی طرف دیکھ لیتا تھا—

ناشتہ میں دنیا بھر کی چیزیں تھیں — مٹھائی اور سموسے سے لے کر کباب کی ٹکیا تک......

بھیّا لیجئے نا......

اور بھابھی آپ......

شان کو گود میں لے کر نادرہ واپس آ گئی تھی — اب وہ مجھ سے مخاطب تھی — شرمایئے نہیں — ابھی کھانا بھی کھانا ہے......'

'ارے......اس کے بعد کوئی کھانا کیسے کھا سکتا ہے......'

'کھانا تو کھانا ہی پڑے گا بھیّا — نادرہ نے بہت محبت سے بنایا ہے۔ کھیر، فرنی، شیرمال سب اپنے ہاتھوں سے تیار کیے ہیں......' نور محمد مسکرا رہا تھا — یہ تو صرف چائے کے لیے — ذائقہ...... بدلنے کے لیے......'

میں نے ایک بار پھر ترچھی نظروں سے نادرہ کا جائزہ لیا — وہ بھی میری طرف ہی دیکھ رہی تھی — ممکن ہے اسے بلند حویلی میں میری شرارتیں یاد آ گئی ہوں — یا وہ حسین لمحہ جب صرف ہم دونوں ہوا کرتے تھے۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ ان یادوں سے دور نکل آئی ہو — اس کے ہونٹوں پر سمٹی ہوئی یہ مسکراہٹ دنیا کی سب سے حسین اور پراسرار مسکراہٹ تھی، جسے شاید اس وقت صرف میں سمجھ رہا تھا۔

رقیہ کہہ رہی تھی — اپنے میاں کو لے کر تم بھی ہمارے گھر آؤ نا......اب تو شان بھی تم سے گھل مل گیا ہے۔

'ضرور آؤں گی بھابھی......'

'اس نے پیار سے شان کو دیکھا — ہوا میں ہاتھ ہلائے اور شان دوڑتا ہوا اس کی گود میں سوار ہو گیا تھا۔

نور محمد مسکرا دیا — 'دیکھا بھیّا — شان کی تو اب نادرہ سے دوستی ہو گئی — '

میں کہنا چاہتا تھا...... کہ بس نادرہ کی مجھ سے ہی دوستی نہ ہو سکی۔ یا پھر ان لمحوں میں دونوں

جاگتے جسم کی زد میں آ گئے تھے، جو شاید اس وقت کی ضرورت بھی تھی۔ عمر کی کسی نازک فصیل پر یہ جسم اچانک جاگ جاتا ہے— مگر بیحد مختصر لمحے کے لیے—اور شاید جسم کے جاگنے کی یہ آواز نادرہ نے بھی سنی تھی—اس لیے وہ بیحد کمزور لمحے میں خود کو میری آغوش میں گرا دیتی تھی......

'ارے لیجئے نا بھیّا......'

میں ایک دم سے چونک گیا تھا— نادرہ میری آنکھوں کے سامنے تھی۔ تنا ہوا صحت مند جسم، جس میں آرزو اور تمناؤں کے ساتھ گرم خون کی یورش بھی شامل تھی۔ وہ میری طرف محبت بھری نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ پھر وہ رقیہ کی طرف مڑی—

'آپ تو بہت کم بولتی ہیں بھابھی۔ کیا بھیّا نے بولنے پر پابندی لگا رکھی ہے......'

'یہ پابندی کیوں لگائیں گے؟ رقیہ ہنسی— یہ کسی چیز پر پابندی نہیں لگاتے اور ہاں میں چپ کہاں ہوں— تب سے بولے ہی جا رہی ہوں......'

نور محمد خوش تھا— 'بھیّا آپ نہیں جانتے، آپ نے آج یہاں آ کر مجھ پر کتنا بڑا احسان کیا ہے— آپ آج بھی میرے آئیڈیل ہیں بھیّا— ہم ایک ہی اسکول میں تھے۔ بچپن سے آپ کو دیکھ رہا ہوں—اور ایک بات کہوں— آپ برا تو نہیں مانیں گے؟ میں نے ہمیشہ یہی سوچا کہ میں آپ جیسا کیسے بنوں گا؟ مجھے آپ جیسا بننے کے لیے کیا کرنا ہوگا......؟ بس میں اسی سوچ کے ساتھ سفر کرتا ہوا آج اس مقام پر ہوں......'

میں ایک بار پھر اندر تک لرز گیا تھا— نور محمد میرے جیسا بننا چاہتا تھا؟ میں آئیڈیل ہوں اس کا— وہ میرے جیسا بننا چاہتا تھا اور شاید اسی لیے میری سب سے قیمتی شے اس نے چرائی— اور شاید میرے جیسا بننے کی دھن میں مجھ سے بھی آگے نکل گیا......

ناشتہ ختم ہو چکا تھا— نادرہ ہم سب کے لیے چائے لے کر آ گئی تھی۔ چائے میری طرف بڑھاتی ہوئی اس نے مسکرا کر پوچھا تھا۔

'میری یاد آتی ہے کبھی؟ یا بھول گئے......'

میں نے نور محمد کو دیکھا—وہ ہنس رہا تھا...... میں اپنی جھینپ مٹا رہا تھا۔ رقیہ مسکرا کر بولی۔ بھائی اور بہن کا رشتہ ہی ایسا ہوتا ہے۔ کوئی بھی ایک دوسرے کو نہیں بھولتا—ان کی کوئی بہن تو تھی نہیں—جو تھی وہ نادرہ تھی—یہ آج بھی نادرہ کو بہت یاد کرتے ہیں......

وہ مسکراتی ہوئی میری طرف دیکھ رہی تھی......

میں نے نادرہ کی طرف پلٹ کر دیکھا—یقیناً وہ ایک پراسرار مسکراہٹ تھی، جو اس وقت اس کے ہونٹوں پر پھیلی ہوئی تھی...... جیسے وہ میرا مذاق اڑا رہی ہو...... تم مجھے جیت نہیں سکے۔ تمہارا دوست جیت گیا اور تم ہار گئے......

شان ابھی بھی نادرہ کی گود میں سوار تھا—

’بالکل تمہاری طرح ہے بھیّا—جیسے تم چھوٹے ہو کر شان میں سما گئے ہو......‘

مجھے لگا، یہ جملہ مجھے سنانے کے لیے کہا گیا ہو—

رقیہ نے بات بدل دی—’مگر میرے گھر والے کہتے ہیں کہ شان مجھ پر گیا ہے—بچہ جب تک بڑا نہ ہو جائے، اس کے چہرے کا صحیح اندازہ لگانا مشکل ہوتا ہے—‘

’بھابھی نے بالکل صحیح کہا—بڑے ہونے کے ساتھ بچہ اتنے رنگ بدلتا ہے کہ اندازہ لگانا مشکل ہے۔ مجھے دیکھو—لوگ کہتے تھے کہ مجھ میں ابو امی دونوں کی جھلک ہے۔ لیکن میں جیسے جیسے بڑا ہو رہا ہوں، بالکل ابو کی طرح ہوتا جا رہا ہوں......

رقیہ نے مسکراتے ہوئے کہا—شان ان کی کاپی ہے—اس کے ہونٹ دیکھو......

نادرہ نے جھٹ سے شان کے ہونٹوں کو چوم لیا تھا—اور جیسے میرے سارے جسم میں برقی لہریں دوڑتی چلی گئی ہوں...... اس کے یاقوتی ہونٹوں کی تپش میں اس وقت بھی اپنے ہونٹوں پر محسوس کر رہا تھا......

دنیا بھر کی باتیں—یہ باتیں ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھیں...... نور محمد خاطر تواضع میں مصروف تھا—ناشتہ کھانا...... پھر چائے...... ماضی کے جھروکے سے حال کی پتھریلی اور

خوبصورت سڑک تک...... جیسے سب مل کر ایک چھوٹے سے خاندان کا حصہ بن گئے ہوں—

مگر اب دیر ہو رہی تھی— گھر بھی چلنا تھا۔ ہم ایک بار پھر ڈرائنگ روم میں آئے— کوئی انجانی قوت آہستہ آہستہ مجھے لے کر اس جگہ پر آ گئی جہاں میری بنائی گئی پینٹنگ فریم کی ہوئی دیوار پر جھول رہی تھی—

اور اس بار میں اندر تک لرز گیا تھا—

تصویر کی آنکھوں سے ٹپکتے ہوئے خون کے قطرے میرے قدموں کو منجمد کر گئے تھے—

کیا یہ میرا واہمہ تھا—؟

یا آنے والے دنوں میں اس کوٹھی کے ساتھ کوئی بے رحم کہانی لکھی جانے والی تھی......

لیکن واقعات کے رتھ اتنی تیزی سے دوڑیں گے مجھے اس کا اندازہ نہیں تھا—

(۷)

پچھلی نسل اوہام پرستی کا شکار تھی— اندھ وشواس اور اندھے عقیدے کو مانتی تھی— لیکن میرا خیال تھا کہ دھند بہت حد تک چھٹ رہی ہے— نئی نسل سائنسی نظریات کو تسلیم کرتے ہوئے نئی روش اختیار کرنے پر مجبور ہے— لیکن کیا سچ مچ ایسا ہے؟ مثال کے لیے سینتھیٹک دودھ کی خبریں آنے کے باوجود مٹھائی کی دکانوں پر لوگوں کی بھیڑ دیکھی جا سکتی ہے۔ ہزاروں پاکھنڈی جیوتشی اور باباؤں کے پکڑے جانے کے باوجود لوگوں کی آستھا اور عقیدوں میں کوئی کمی نہیں آئی— صرف ہندستان نہیں باہر کے ملکوں میں بھی یہ اوہام پرستی عام ہے— تبھی تو آسیبی فلمیں اور ڈراموں کے شائقین آج بھی بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ لیکن کیا سچ مچ اس زندہ دنیا میں بھی دو دنیائیں ہیں— ایک جیتے جاگتے لوگوں کی اور ایک آسیب، بھوت پریت اور جناتوں کی؟

او ہنری کا بھوت ٹرین کے کمپارٹمنٹ سے نکل کر میرے سامنے آ کھڑا ہوا تھا—

'میں ہوں— اور یہ صداقت ہے— میں ساری دنیا میں ہوں— اور اپنے وجود سے

لوگوں کو ڈراتا رہتا ہوں—

لیکن میں علمی سطح پر خود کو میکسم گورکی کا نیا انسان سمجھتا تھا۔ موسلا دھار بارش میں، مزدوروں کی گاتی بجاتی ٹولیوں میں، قدرت کے ستم کے باوجود ایک نیا انسان اپنا سر نکال رہا ہے—

میں ان واقعات کو بھولا نہیں تھا جو چچا نظر محمد کی کوٹھی میں پیش آئے تھے اور جن کا ایک خاموش گواہ میرے دوست نور محمد کی شکل میں میرے سامنے تھا۔ نظر محمد ساری زندگی مولوی، سادھو اور تانترک کی خدمت کرتے رہے۔ اپنی اہلیہ سے بیحد پیار کرنے کے باوجود وہ انہیں بیمار تسلیم کرنے کو قطعی تیار نہ تھے— اور ایک دن اسی اوہام پرستی نے نور محمد سے اس کی والدہ چھین لی— میری آنکھوں میں گزرے لمحات کی ایک ایک تصویر روشن ہے— آزادی کے بعد کے نئے زمانے میں سائنس ایک چیلنج کے طور پر لوگوں کے سامنے آیا تھا— جس نے اوہام پرستی سے لے کر مذہب تک کی جڑیں کھوکھلی کر دی تھیں— لیکن کیا سچ مچ ایسا تھا—

کیا سچ مچ دنیا بدل گئی تھی—

یا جیسا کہ ابّا مرحوم ہنس کر کہتے— یہ دنیا ہمیشہ ایک جیسی رہتی ہے— ہم صرف اس خوش فہمی میں جیتے ہیں کہ دنیا بدل گئی ہے— دنیا کہاں بدلتی ہے میاں— ہمارے بعد بھی یہ دنیا ایسی ہی رہے گی اور اسی طرح چلتی رہے گی—

ابّا حضور کا سچ بہت جلد سامنے آ گیا تھا۔

اس ملاقات سے ٹھیک ایک ہفتہ بعد صبح کے وقت زور زور سے ہونے والی دستک نے سارے گھر کو جگا دیا تھا—

صبح کے ساڑھے پانچ بجے تھے— سب سے پہلے دستک کی یہ آواز رقیہ کے کانوں میں پڑی—

’یا اللہ خیر— اس وقت کون آیا ہے—؟‘

ابھی ہلکی ہلکی صبح نمودار ہوئی تھی— شان بے خبری کی نیند سو رہا تھا اور دستکوں کا سلسلہ مسلسل جاری تھا—

میں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا اور کانپ گیا—

سامنے حواس باختہ نور محمد کھڑا تھا۔ بال الجھے ہوئے— آنکھیں سوجی ہوئی، جیسے ساری رات جاگتے میں گزاری ہو۔ کپڑے بھی رات کے ہی پہنے ہوئے— میں اسے اس حلیے میں دیکھنے کا عادی نہیں تھا— اس کی آنکھیں بھیانک حد تک پھیلی ہوئی تھیں۔

’بھیّا، آپ میرے ساتھ چلیے—‘

’پریشان مت ہو نور محمد— پہلے سانسیں درست کرو— پھر بتاؤ ہوا کیا ہے—‘

’نہیں— آپ ساتھ چلیے—‘ اس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ میں رات بھی آ سکتا تھا۔ مگر رات کے وقت آپ لوگوں کو تکلیف نہیں دینا چاہتا تھا— ساری رات میں نے جاگ جاگ کر گزاری ہے— پو پھٹتے ہی سب سے پہلے میں بھاگ کر آپ کے پاس آ گیا—

دروازے سے نکل کر رقیہ سامنے آ گئی تھی۔ نور محمد کی باتیں سن کر وہ بھی خاصہ پریشان ہو گئی تھی—

بات کیا ہے بھائی صاحب— سب خیریت ہے نا......؟

’ہاں ہاں— بولو نور محمد۔ کیا بات ہے......‘

’آپ چلیے تو سہی— سب بتا دوں گا راستے میں—‘

وہ میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچ رہا تھا— ’بھابھی— پلیز مجھے معاف کر دیجئے گا— لیکن اس وقت صرف بھیّا ہی ہماری مدد کر سکتے ہیں۔ آپ کی اجازت ہو تو بھیّا کو اپنے ساتھ لے جاؤں۔‘

’کیوں نہیں— آخر آپ کو اتنا بھروسہ ہے ان پر......‘

’چلو نور محمد......‘

میں نے کپڑے بھی نہیں بدلے...... کپڑے بدلنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ میرے دل

میں اس وقت بھیانک طوفان مچا ہوا تھا۔ کچھ بھی ہو، میں نادرہ کی بربادی نہیں دیکھ سکتا تھا—اور نور محمد کا چہرہ بتا رہا تھا کہ نادرہ کے ساتھ کچھ نہ کچھ انہونی ضرور ہوئی ہے۔ مگر آخر ایسی کیا بات ہوگئی کہ نور محمد کو ساری رات جاگ کر میرا انتظار کرنا پڑا اور صبح ہوتے ہی وہ مجھے بلانے چلا آیا—

●●

کوٹھی کا دروازہ کھلا تھا— سڑک پر سنّاٹا تھا۔ اکا دّکا رکشہ والے آواز لگاتے ہوئے جا رہے تھے— ٹھہر ٹھہر کر دکانیں بھی کھلنی شروع ہوگئی تھیں— خاص کر چائے کی دکانیں اور ہوٹل کے ڈھابے......

ہم اندر آگئے—ابھی تک نور محمد نے مجھے کچھ نہیں بتایا تھا—یہ اس کا کمرہ تھا۔ دروازہ پر پردہ جھول رہا تھا—اس نے پردہ ہٹایا اور میری طرف دیکھا—

'دیکھیے بھیّا، نادرہ کو کیا ہوگیا ہے......'

میں نے نظر اٹھا کر نادرہ کو دیکھا—وہ نیم بیہوشی کی حالت میں برسوں کی بیمار لگ رہی تھی—میں نے آگے بڑھ کر اس کی نبض دیکھی— نبض آہستہ آہستہ چل رہی تھی—

'میں زور سے چلّایا— کیا ہوگیا ہے نادرہ کو؟ تم نے سفیان ماموں اور ممانی کو خبر کی؟'

'وقت ہی کہاں ملا بھیّا—مجھ سے یہ سب دیکھا نہیں جا رہا۔ میرے ہاتھ پاؤں کانپ رہے ہیں۔ ساری رات نادرہ زور زور سے چلاتی رہی— کم وبیش اس کی وہی حالت تھی جو حالت میں اماں کی دیکھ چکا تھا......

میں نے نادرہ کی طرف دوبارہ دیکھا— آنچل سینے سے ہٹ گیا تھا۔ وہ سو رہی تھی—چہرہ بھیانک حد تک سرخ لگ رہا تھا—اچانک ہماری گفتگو اور آہٹ سن کر وہ اٹھ بیٹھی۔ خود کا جائزہ لیا— آنچل کو ٹھیک کیا—اور چونک کر بولی—

'آپ کب آئے بھیّا؟' وہ پریشان نظروں سے نور محمد کی طرف دیکھ رہی تھی—یہ آپ نے

کیا حال بنا رکھا ہے۔ کتنا بجا ہے؟ یہ صبح صبح بھیّا کیسے آ گئے ہیں؟ کہیں مجھے کچھ......'

نور محمد نے بیقرار ہو کر اس کے ہاتھوں کو تھام لیا—— وہ زار و قطار رو رہا تھا—— اور نادرہ حیرت سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

'نہیں کیا ہو گیا ہے بھیّا—— آپ سمجھاتے کیوں نہیں۔ میں تو بالکل ٹھیک ہوں۔

'اللہ تمہیں ہمیشہ اچھا رکھے——' میں نے اپنا کانپتا ہوا ہاتھ اس کے سر پر رکھا۔ پھر میں نے نور محمد کے کندھے ہلائے——

'رونا بند کرو—— نادرہ کو کچھ نہیں ہوا ہے۔ تم ذرا سی بات پر پریشان ہو جاتے ہو......'

'لیکن مجھے ہوا کیا ہے۔ اللہ کے واسطے کوئی بتائے گا......'

'کچھ نہیں نادرہ—— بس تمہارے میاں ڈر گئے تھے......'

'ڈر گئے تھے اور آپ کو اس طرح بلا لائے......آپ نے شاید ابھی تک برش بھی نہیں کیا ہوگا۔ آپ برش کر لیجئے۔ میں آپ لوگوں کے لیے چائے بناتی ہوں۔

نادرہ نے اٹھتے ہوئے نور محمد کی طرف دیکھا۔ مسکرائی——

'آپ بے وجہ پریشان ہو جاتے ہیں۔ خود بھی پریشان ہوتے ہیں—— دوسروں کو بھی پریشان کر دیتے ہیں——' وہ مسکرا رہی تھی—— کیا کہیں گی بھابھی—— صبح صبح آپ بھیّا کو اٹھا لائے——'

نادرہ چائے بنانے چلی گئی تو میں نور محمد کی طرف مڑا۔

'اس کے سامنے رونا دھونا بند کرو۔ ڈرائنگ روم میں بیٹھتے ہیں۔ اور مجھے بتاؤ کہ کل رات کیا ہوا تھا۔

ہم ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ صوفے پر بیٹھ گئے۔ نور محمد گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ پھر اس نے بتانا شروع کیا۔

'رات اس کی وہی کیفیت تھی جو اماں جان کی تھی——'

'یہ تم بتا چکے ہو...... مجھے پوری تفصیل بتاؤ — اور خدا کے لیے کوئی بھی بات چھپانے کی کوشش مت کرنا۔ سب سے پہلے مجھے یہ بتاؤ، تم دونوں میں کسی بات کو لے کر کوئی جھگڑا تو نہیں ہوا — ؟'

'جھگڑے کا تو سوال ہی نہیں اٹھتا بھیّا —'

'میں عام دنوں کی بات نہیں کر رہا ہوں — میری مراد کل سے ہے۔ کل کوئی ایسی بات جو تمہاری نظروں میں نادرہ کو پسند نہیں آئی ہو —'

'میری ناپسندیدہ باتوں کو بھی وہ پسند کرتی ہے۔ یہی تو مجبوری ہے بھیّا —'

تو کوئی ایسی بات نہیں ہوئی — میں نے گہری سانس کھینچی — کیا نادرہ کہیں گئی تھی؟ کسی سے ملنے؟ یا کوئی ملنے والا آیا ہو؟

'نہیں —'

نادرہ کی کوئی دوست؟ کوئی سہیلی — ممکن ہے اس درمیان کوٹھی کے آس پاس کی عورتوں سے وہ کافی قریب ہوئی ہو —'

'نہیں بھیّا — اس کے پاس اتنا وقت ہی نہیں ہوتا اور محلے سے بھی کوئی نہیں آتا......

'ہونہہ......' میں پھر گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ لیکن میں نادرہ کی بیماری کو جڑ سے جاننا چاہتا تھا۔

'کیا نادرہ کو ڈر لگتا ہے؟ میرا مطلب ہے جیسے رات کے وقت جب باتھ روم یا ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں جاتے ہوئے —'

'نہیں بھیّا —'

'اس سے پہلے کبھی نادرہ نے اس گھر میں کوئی خوف محسوس کیا؟'

'بالکل نہیں بھیّا —'

'اچھا یہ بتاؤ — وہ کس قسم کی کتابیں زیادہ پڑھتی ہے۔ میرا مطلب ہے آسیبی یا اس نوعیت

کی کتابوں میں تو اس کی دلچسپی نہیں؟ تم نے بتایا تھا کہ اسے کتابیں پڑھنے کا شوق ہے — ؟'

'وہ زیادہ تر رومانی یا مذہبی کتابیں پڑھتی ہے بھیّا — جاسوسی یا بھوت پریت کی کہانیوں پر وہ مطلق یقین نہیں کرتی —'

'اچھا — کل کیا ہوا تھا...... مجھے پوری تفصیل بتاؤ —'

اس نے یاد کرنے کی کوشش کی — کل صبح میں دس بجے کوٹھی سے نکلا — دس بجے تک سب کچھ ٹھیک تھا — وہ میرا کھانا پیک کرنے لگی تو میں نے منع کر دیا کیونکہ مجھے کئی جگہوں پر جانا تھا — میں کھانا لے کر کہاں کہاں گھومتا — ؟ شام کے ۷ بجے واپس آیا تب بھی وہ بالکل ٹھیک تھی — ہم کافی دیر تک کمرے میں رہے — ادھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے — ۹ بجے کے آس پاس ہم نے رات کا کھانا ساتھ ہی کھایا۔ رات کھانے کے بعد برش کرنا اس کا روز کا معمول ہے۔ اور اس کے بعد وہ سیدھے کمرے میں آ گئی۔ وہ تھک گئی تھی۔ اس لیے اس نے مجھ سے کہا کہ آج اسے نیند آ رہی ہے۔ وہ رات زیادہ دیر تک گفتگو میں شریک نہیں ہو سکتی۔ میں بستر پر، تکیے پر سر رکھ کر دن بھر کے حساب کتاب دیکھ رہا تھا کہ اچانک......

'اچانک کیا ہوا — ؟'

وہ زور زور سے گلہ پھاڑ کر چلانے لگی۔ بالکل اچانک — چادر کو اس نے بستر سے باہر اچھال دیا — اور میری طرف بیحد غصہ بھری نظروں سے دیکھنے لگی...... میں تو جیسے پاگل ہی ہو گیا۔ میں نے اسے بستر پر آرام کرنے کی صلاح دی...... مگر اس کے چہرے کا رنگ بدل چکا تھا — اس کے منہ سے عجیب عجیب آوازیں نکل رہی تھیں — میں نے اسے بستر پر لانا چاہا تو اس نے مجھے زور سے دھکا دے دیا —'

'پھر......؟'

'رات کے بارہ بج چکے تھے۔ اس عالم میں، میں کس کے پاس جاتا — مجھے بس آپ کا ہی خیال آ رہا تھا — بیڈروم میں ایک آرام چیئر ہے۔ منہ سے آواز نکالتی ہوئی وہ ساری رات اس آرام

چیئر پر بیٹھی رہی۔ میں ساری رات ٹہلتا رہا — مگر ایک بار بھی نظر اٹھا کر اس نے میری طرف نہیں دیکھا.....'

نور محمد کی آنکھوں میں تشویش کے ڈورے تیر رہے تھے — 'محبت کو نظر لگ گئی بھیّا — میں اندر سے بہت ڈر گیا ہوں — اماں کو کھو چکا اب نادرہ کو نہیں کھو سکتا — میں مر جاؤں گا بھیّا —'

'گھبراؤ مت نور محمد — کوئی ضروری نہیں ہے کہ نادرہ کو وہی بیماری ہو جو تمہاری اماں کو تھی — میرا یقین کرو — نادرہ اچھی ہو جائے گی۔'

میں نے اس کے ہاتھ کو تھامتے ہوئے کہا۔ ہم آج ہی کسی اچھے ڈاکٹر سے رجوع کریں گے۔

نادرہ نے چائے کے لیے آواز لگائی تھی —

اتنی دیر میں اس نے چائے بھی بنالی تھی اور فریش بھی ہو گئی تھی — کپڑے رات کے ہی تھے — لیکن اس نے اپنے حسین لمبے بالوں کو جوڑے کی شکل دے دی تھی —

'چائے دیکھیے بھیّا — کیسی بنی ہے —'

وہ پاس ہی بیٹھ گئی — نور محمد کو دیکھ کر وہ مسکرا رہی تھی —

'آپ بھی نا......کوئی اتنی جلدی پریشان ہوتا ہے کیا — رات میری طبیعت ذرا سی ناساز تھی — ہلکا سا فیور بھی تھا.....'

میں نے نور محمد کی طرف دیکھا —

'یہ بات تو تم نے بتائی نہیں —'

وہ معصومیت سے بولا — یہ بات بھی مجھے ابھی معلوم ہو رہی ہے۔ نادرہ نے مجھے یہ بات نہیں بتائی تھی —'

نادرہ زور سے ہنسی — اب یہ چھوٹی چھوٹی باتیں بتانے کے لیے ہوتی ہیں — اسی لیے تو کل رات جلدی سو گئی تھی —

’نور محمد شرمندہ سا لگ رہا تھا— میں مسکرایا— چلو کوئی بات نہیں— اسی بہانے تم دونوں سے ملاقات تو ہوگئی—‘

●●

کیا نادرہ ہم سے کچھ چھپانے کی کوشش کر رہی تھی؟ یا سچ مچ اس کے ساتھ ایسا کچھ بھی نہیں ہوا تھا جسے زیادہ سنجیدگی سے لیا جا سکے— اس دن ڈرائنگ روم میں بیٹھنے کے باوجود میری ہمت اس تصویر کو دیکھنے کی نہیں ہوئی، جسے میں نے خود بنائی تھی۔ میں خود کو اس طرح کی بیوقوفیوں سے دور رکھنا چاہتا تھا— میں اس نتیجہ پر بھی پہنچنا چاہتا تھا کہ ممکن ہے رات والا حادثہ بے خوابی یا کسی اور وجہ سے سامنے آیا ہو— سفیان ماموں کے لیے یہ معمولی حادثہ نہیں تھا— اور ان کی رائے تھی کہ کوٹھی کو فروخت کرنے کے بعد نور محمد اور نادرہ کو کہیں اور بس جانا چاہئے— انہوں نے اپنے گھر کی بھی پیش کش کی تھی— ظاہر ہے ان دونوں کے بعد یہ گھر نادرہ اور نور محمد کی ہی ملکیت ہونے والا تھا—

سن ۱۹۷۲ء کی سردیوں کے دن شروع ہو گئے— تب یہ دنیا آج کی طرح نہیں تھی— نہ میڈیکل سائنس نے اتنی ترقی کی تھی— سائیکریٹس یا نفسیاتی معالج مشکل سے ملتے تھے۔ ڈاکٹر مختلف طرح کے ٹیسٹ سے زیادہ اپنی دوائیوں پر بھروسہ کرتے تھے— ڈاکٹر بھارتیندو میرے جاننے والے تھے— کچھ دن تک نادرہ کا علاج چلا— وہ ایک دم نارمل تھی—

●●

تب یہ دنیا شاید اس قدر نہیں پھیلی تھی—
تب یہ دنیا شاید اس قدر نہیں مسکرائی تھی—

آسمان پر چاند روشن تھے۔ تارے ٹمٹما رہے تھے— نیلے آسمان پر دو ایک بادلوں کے ٹکڑے نظر آئے— مگر رم جھم چمکتے تاروں کے قافلوں نے جھومتے ہوئے بادلوں کی اس چادر کو اوڑھ لیا— پھر اس چادر کو وہیں چھوڑ کر، جھومتے کارواں کے ساتھ یہ تارے آگے بڑھ گئے۔

تب کمپیوٹر نہیں تھا—

انٹرنیٹ نہیں تھا—اپسرائیں نہیں تھیں۔

عمر کی اپنی حدیں مقرر تھیں— اوران حدود سے تجاوز کرنا بغاوت سمجھا جاتا تھا— تب جادو کا گھوڑا نہیں تھا۔ مگر تب بھی تھی محبت— شاید موجودہ وقت سے زیادہ آزاد اور روحانی— جسم کی جگہ سیدھے روح میں اتر جانے والی محبت— تب چاندنی راتیں ہوا کرتی تھیں— ہندوستان کے اچھے خاصے شہر کسی گاؤں یا قصبے جیسے لگتے تھے— فون نہیں، ٹیلیفون نہیں، موبائل تو کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا— چھوٹے شہر میں اپنی تمام دقتوں اور پریشانیوں کے باوجود ایک سیدھی سادی زندگی کا ہی تصور تھا— تب محبت کی اپنی شکل تھی— اپنی ترنگ، اپنی لہر تھی— بارش اور خوشبو جیسے تصورات میں— محبت کی گنگناتی موجوں کی طرح— اور آسمان پر دور چمکتے کسی ننھے چمکتے تارے کی طرح— مگر اس تارے کو دیکھ لینا یا چھو لینا سب کے بس کی بات نہیں تھی۔

گہرے سناٹے اور پراسرار اُداسی کی اپنی الگ شاعری ہوتی ہے— ہوا کی اپنی موسیقی— خوشبو کے اپنے سرتال— اور محبت کے اپنے راگ ہوتے ہیں۔ ممکن ہے یہ کہانی جنم ہی نہیں لیتی— وہ بھی میرے جیسے شخص کے لیے، جس کی زندگی کے لیے ٹھہرے ہوئے پانی یا سمندر کی خاموش لہروں کی مثال ہی دی جاسکتی ہے— لیکن معاف کیجئے گا— اس کہانی کے شروع ہونے کا وقت سنگین ہے— اور اس کہانی کے لیے آج کے سنگین وقت اور وقت سے جڑے انسانی حقوق کو گواہ بنانا ضروری—

نادرہ پر ٹھہر ٹھہر کر دورے پڑنے کی شروعات ہو چکی تھی— اور ٹھیک ایک سال بعد اسی کیفیت میں نادرہ نے ایک بچی کو جنم دیا......(یہاں آپ کو ٹھہرنا پڑے گا......)

نور محمد نے اس کا نام نگار رکھا، جیسا کہ شادی سے قبل وہ مجھ سے یہ بات پہلے بھی کہہ چکا تھا کہ اگر لڑکی ہوئی تو وہ اس کا نام نگار رکھے گا— لیکن یہ بچی آٹھویں مہینے میں ہی اس دنیا میں آ گئی

تھی اور اتنی کمزور تھی کہ ڈاکٹر کے لیے اس ننھی سی جان کو بچانا ایک مشکل کام تھا—

تب آج کی طرح انکیوبیٹر بھی نہیں تھے جہاں ایسے کمزور بچوں کو ڈال دیا جاتا تھا— شیشے کے ایک چھوٹے سے گھر میں— ڈاکٹر کی مزید اطلاع ہم سب کے لیے پریشانی کا باعث تھی کہ نو مولود بچی صرف روئے جا رہی ہے اور کسی صورت میں اس کا رونا بند نہیں ہو رہا ہے—

ڈاکٹر نے اسے ایک طرح کا دماغی جھٹکا، سیزر یا دورہ بتایا تھا، (جس کا ذکر آئندہ کے صفحات میں کیا جائے گا—)

مجھے نور محمد کا چہرہ یاد ہے، جو میرے ہاتھوں کو تھامے پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا—

'بھیّا— میرے ساتھ تقدیر یہ کیسے کھیل، کھیل رہی ہے! میرا گناہ کیا ہے؟ کیا یہ سب صرف میرے ساتھ ہونا ہے— نادرہ نے پہلے ہی کوئی کم ظلم سہا ہے جو اللہ پاک اس کا امتحان پر امتحان لیے جا رہا ہے— خوشیوں کی مدت اتنی کم کیوں ہوتی ہے بھیّا— میری نگار بچ تو جائے گی نا؟ اسے کچھ ہوگا تو نہیں نا، بھیّا؟

اس کے آنسو مجھے پاگل کر رہے تھے— لیکن میں نادرہ کے بارے میں سوچ رہا تھا— جانے اس بیچاری کا کیا حال ہوگا— خدانخواستہ بچی کو کچھ ہوگیا تو یہ صدمہ وہ کس طرح جھیل پائے گی—

میں نور محمد کو سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا— فکر مت کرو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا— اللہ کے حضور میں اپنے گناہوں کے لیے معافی مانگو۔ گڑگڑاؤ، سب ٹھیک ہو جائے گا— تقدیر کے ستم ہیں نور محمد— اسے سہہ جاؤ۔ کہتے ہیں برے دنوں کے بعد ہی اچھے دنوں کی شروعات ہوتی ہے......

نور محمد چلاّیا— 'کب اچھے دنوں کی شروعات ہوگی بھیّا— میں تو پاگل ہو چکا ہوں— میری دماغی کیفیت اچھی نہیں— بس کسی طرح خود کو سنبھالے ہوا ہوں کہ اگر خدانخواستہ مجھے کچھ ہوگیا تو نادرہ کو کون سنبھالے گا۔ میں اس کے بغیر مر جاؤں گا بھیّا— مجھ سے اس کی حالت نہ دیکھی

جائے گی—'

سفیان ماموں کا خیال تھا کہ یہ سب کوٹھی کی وجہ سے ہو رہا ہے— نادرہ کی بیماری نے انہیں توڑ دیا تھا— میں نے انہیں سمجھایا کہ اس وقت وہ نور محمد سے ایسی کوئی بات نہ کریں۔ اس وقت اسے صرف تسلی کی ضرورت ہے—

رقیہ، سفیان ماموں کی باتوں سے اتفاق کرتی تھی—

'آپ اُنہیں کیوں نہیں مشورہ دیتے— جبکہ وہ آپ کی ہر بات مانتے ہیں۔ کوٹھی کیا جان سے بڑھ کر ہے......'

میں اسے کیسے سمجھاتا کہ ان تمام واقعات کے باوجود میں ابھی تک سائنسی نظریہ حیات کا قائل تھا اور اوہام پرستی کو انسانی ارتقاء کے راستے میں ایک رکاوٹ محسوس کرتا تھا— لیکن شاید ایک گھر سے اتنے سارے خوفزدہ واقعات وابستہ ہو گئے تھے کہ اب میں بھی اسی شک کے دائرے میں آ گیا تھا—

لیکن ان سب سے بڑی حقیقت یہ تھی کہ نگار دنیا میں آ گئی تھی۔ اور مسلسل روئے جا رہی تھی اور ڈاکٹر اس کا رونا کسی بھی صورت بند کرانے میں ناکام تھے......

'وہ رو رہی ہے......'

'ہاں......'

کسی بچی کو آج تک اس طرح روتے نہیں دیکھا؟ یہ نور محمد تھا—

'تو......؟'

'خدانخواستہ کہیں وہ بھی......'

'پاگل مت بنو......'

'وہ روتے روتے مر جائے گی......'

’نہیں مرے گی......‘

تسلّیاں سوگئی تھیں—

نور محمد کا چہرہ پتھروں میں تبدیل ہوگیا تھا—

حصہ سوم

نیا انسان

"وہ پیدا ہوچکا ہے
اور یقین مانو وہ پیدا ہوچکا ہے /
تمہاری اس دنیا میں /
تیر کمان اور بھالوں سے الگ کی /
اس خطرناک دنیا میں /
جس کے لیے تم انتہائی مہذب ہونے کی
دہائیاں دیتے ہو......

●●

وہ پیدا ہوگیا ہے /
کینسر اور ایڈز جیسی بیماریوں کے عہد میں /
جہاں گلیشیر تیزی سے پگھل رہے ہیں /
سائبیریا کے برفیلے علاقوں میں اُگنے لگی ہے گھاس /
بدلنے لگا ہے موسم کا مزاج
وہ پیدا ہوگیا ہے /

(۱)

نور محمد کے لیے یہ سمجھنا مشکل تھا کہ سارے فساد کی جڑ یہ کوٹھی ہے— اور کوٹھی کی وجہ سے آس پاس کے لوگ بھی اس کے یہاں آنے سے گھبراتے ہیں۔ کوٹھی کو فروخت کرنے کی بات پر اسے غصہ آجاتا تھا۔

’آخر مجھے کیوں بیچنا چاہئے کوٹھی؟ کس نے کہا یہاں بھوت رہتے ہیں یا جناتوں کا بسیرا ہے— آخر اسی گھر میں، میں نے بھی تو آنکھ کھولی ہے— مجھے کچھ کیوں نہیں ہوا— ابّا بھی تو تھے— ابّا پر کبھی سایہ کیوں نہیں ہوا— آخر سب لوگ مجھے یہ مشورہ کیوں دے رہے ہیں کہ میں کوٹھی فروخت کردوں اور بھی تو راستے ہوں گے— بلند شہر میں اگر علاج ممکن نہیں ہے تو دلّی جاؤں گا—‘

’اور اگر وہاں بھی علاج نہ ہوسکا تو......؟‘

سفیان ماموں پریشانی کے عالم میں ٹہل رہے تھے...... میری سات پشتوں میں ایسی بیماریاں کسی کو نہیں تھیں۔ اگر کوٹھی میں کوئی گڑبڑ نہیں ہے تو سارے محلے میں ایسی وارداتیں صرف اس کوٹھی میں کیوں ہورہی ہیں— سب سے پہلے تمہاری ماں بیمار ہوئیں— انتقال بھی ہوگیا— پھر نادرہ دلہن بن کر اس کوٹھی میں آئی— کوٹھی میں آنے سے قبل تک وہ بالکل ٹھیک تھی۔ کبھی کوئی ایسی بیماری سامنے نہیں آئی— پھر کوٹھی میں آتے ہی بیمار کیوں پڑ گئی— اور اب یہ تمہاری بیٹی— یہ تو پیدائش کے ساتھ ہی بیمار ہوگئی—‘

’بھیّا، کیا آپ ان باتوں کو مانتے ہیں؟ آپ ہی بتائیے نا— آپ تو پڑھے لکھے ہیں بھیّا— وہ میری طرف مڑا تھا—

’سچ بات یہ ہے کہ میں ان باتوں کو نہیں مانتا—‘ میں نے اپنا فیصلہ سنا دیا— میرے لیے یہ تسلیم کرنا مشکل ہے کہ کوئی انسانی گھر منحوس بھی ہوسکتا ہے— یا وہاں روحوں، بدروحوں کا بسیرا بھی ہوسکتا ہے۔ میں اتنا جانتا ہوں کہ نیا زمانہ اپنے ساتھ بیماریاں لے کر آیا ہے۔ دنیا کی ترقی اپنے ساتھ بیماریاں بھی لے کر آتی ہے۔ رہی بات، ان بیماریوں کو سمجھنے میں انسانی دماغ قاصر ہے۔ مگر

ہر روز میڈیکل سائنس میں بھی نئے نئے تجربے ہو رہے ہیں— نئی نئی بیماریوں کے ساتھ ان کے علاج بھی تلاش کیے جا رہے ہیں— پہلی بات......'

میں نے نور محمد کو دیکھا— نادرہ بیمار نہیں ہے۔ ممکن ہے جو کچھ اس کے ساتھ ہوا، یا ہو رہا ہے ابھی اس کی تشخیص اچھے طریقے سے نہ کی جا سکی ہو مگر اس کی بہت سی وجوہات ہو سکتی ہیں......

میں نے سفیان ماموں کی طرف دیکھا— شدت...... کسی بھی چیز کی شدت انسان کو بیمار کر سکتی ہے— مثال کے لیے، میں نے اس پہلو پر بہت سوچا ہے— اور جو کچھ سوچا ہے اسے آپ کے سامنے رکھنا چاہوں گا— نادرہ کی کوئی خاص عمر نہیں تھی جب اس کی امی کا انتقال ہوا۔ وہاں اس کے رشتے دار نہیں تھے— اور جیسا کہ ایک بار اس نے مجھ سے کہا تھا— ابو کی وجہ سے امی کے انتقال پر وہ ڈھنگ سے رو بھی نہیں سکی— تو یہ رہی پہلی وجہ— وہ ایک بڑے صدمے کو پی گئی— جبکہ حقیقت یہ تھی کہ وہ صدمہ یا درد اس کے اندر موجود تھا— دراصل یہ درد کسی بھی راستے باہر نکلنا چاہتا تھا۔ نتیجہ ایک ایسی نادرہ سامنے آئی جو بیحد خاموش رہتی تھی۔ کسی سے باتیں نہیں کرنا، گفتگو نہیں کرنا— خود میں ڈوبے رہنا۔ اس لیے آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے کہ دراصل وہ اندر ہی اندر اپنی ہی گھٹن کا شکار تھی— وہ صدمے میں بھی تھی اور اسے باہر بھی نہیں نکال سکتی تھی۔ دراصل ابھی دو دن پہلے میں نے نادرہ کے موضوع کو لے کر اپنے ڈاکٹر دوست سے بات کی تھی— وہ مجھے مینٹل ڈس آرڈر کی اس طرح کی بہت ساری قسموں کے بارے میں بتا رہے تھے...... کچھ ایسی بیماریاں جنسی نا آسودگی کو بھی لے کر ہیں۔ یہ بیماریاں بھی بہت چھوٹی عمر سے حملہ کرنا شروع کرتی ہیں— میں فی الحال اس موضوع کو چھوڑتا ہوں، لیکن جب بھی میں نے نادرہ کو لے کر سوچنا شروع کیا تو مجھے یہی احساس ہوا کہ اس لڑکی کے اندر اتنا کچھ ہے، جسے نکالنا بہت ضروری ہے— اور اگر نہیں نکالا گیا تو ایک دن یہ خاموشی اسے کسی بھی ڈس آرڈر کے قریب کر سکتی ہے......'

نور محمد بغور میری بات سن رہا تھا۔

میں نے اپنی بات جاری رکھی— پھر نادرہ کی شادی ہوئی— ایک ایسے آدمی سے جو

صرف محبت کی زبان جانتا تھا۔ یہاں بھی ایک شدت ہے— شادی کے ہفتے دس دنوں تک جیسے وہ اپنے سارے رنج، صدمات بھول گئی— مگر اچانک نور محمد کے باہر جاتے ہی، سناٹے اور تنہائی میں وہ ایک ساتھ بہت ساری باتوں کی زد میں آ گئی— مثال کے لیے ماں کا چلے جانا— یا پھر مثال کے لیے نور محمد کی اماں کے انتقال کی ایک پوری کہانی جو خوف سے متعلق تھی— ایک ملٹی پل ڈس آرڈر تھا، جو آہستہ آہستہ نادرہ میں جگہ بنا رہا تھا— اور پھر ایک دن یہ ایکسپلوزن یا دھما کہ تو ہونا ہی تھا— اور اُسے دورے پڑنے شروع ہو گئے—'

'بالکل غلط'— سفیان ماموں زور سے چلائے— اپنی سائنس کی منطق تم اپنے پاس ہی رکھو— یہاں لوگوں کی جان جا رہی ہے اور تم منطق بگھاڑ رہے ہو— وہ غصے میں چلاّئے— میری بیٹی بیمار نہیں تھی۔ اس گھر نے بیمار کیا ہے...... تم نے بیمار کیا ہے......'

'میں نے بیمار کیا ہے......' پاگلوں کی طرح ٹہلتا ہوا نور محمد میرے سامنے آ کر ٹھہرا— اب دیکھیے بھیّا، مجھے قصوروار ٹھہرایا جا رہا ہے۔ کیا میں نادرہ کے بارے میں ایسا سوچ بھی سکتا ہوں...... ارے میں تو اس کے چہرے کی ایک شکن تک گوارہ نہیں کر سکتا......'

'ہاں تم نے کیا— سفیان ماموں گلہ پھاڑ کر چلاّئے— اور اس کے ساتھ ہی وہ زور زور سے رونے لگے— مجھے پہلے ہی احساس ہونا چاہیے تھا کہ میں اپنی بیٹی کس گھر میں دے رہا ہوں۔ ایسا نہیں ہے کہ میں اس گھر سے واقف نہیں تھا۔ مگر مجھے کیا معلوم تھا کہ ایک دن اس گھر کا جنّاتی ماحول میری بیٹی کو بھی بیمار بنا دے گا۔ میں پاکستان سے آیا ہی کیوں؟ اللہ کسی کی ایسی بری قسمت بھی نہ بنائے۔ سوچا تھا، ملک تقسیم ہوا تو کیا— اپنا ملک آخر تو ہندستان ہی ہے۔ بیوی ختم ہوئی اور میں رہنے کے ارادے سے یہاں آ گیا— لیکن کیا معلوم تھا کہ اس بہانے بدقسمتی کو دعوت دے رہا ہوں— کیسی پھول سی بچی تھی میری۔ ہر وقت چہکتی رہتی تھی— مگر ہوا کیا؟ کوٹھی آتے ہی بیمار پڑ گئی اور اب......'

سفیان ماموں نے گھوم کر نور محمد کو دیکھا— بولو کون ذمہ دار ہے۔ اس بربادی کا— صرف

تم؟ جب قسمت پھوٹتی ہے تو آنکھوں پر پٹّی بندھی ہوتی ہے۔ میں نے بھی نہ آگے سوچا نہ پیچھے۔ جھٹ رضامندی دے دی اور اب......میری پھول سی بچی......'

وہ دوبارہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے تھے......

میں نے سمجھایا — اس طرح ایک دوسرے پر الزام دینے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ نادرہ اور نگار دونوں ابھی اسپتال میں ہیں۔ اس لیے یہ سوچنا واجب ہے کہ ان دونوں کے حق میں بہتری کے لیے کیا کیا جاسکتا ہے۔ اگر نور محمد علاج کے لیے دلّی جانا چاہتے ہیں تو انہیں جانا چاہئے — جہاں تسلی ہو۔ انسان کو وہی کام کرنا چاہئے —

●●

سفیان ماموں اور مامی کو کمرے میں چھوڑ کر نور محمد میرے ساتھ باہر آگیا — اسے اسپتال بھی جانا تھا — نادرہ اور بچی دونوں کو ایمر جنسی وارڈ میں رکھا گیا تھا — اور ڈاکٹر نگار کو بچانے کی حتی الامکان کوشش کر رہے تھے — پیدا ہونے کے کافی دیر تک اس کا رونا بدستور جاری رہا تھا — وہ چپ ہوجاتی — کچھ دیر تک دوا کا اثر ہوتا — اس کے بعد پھر اس کا رونا شروع ہوجاتا — ڈاکٹر کی پریشانی یہ تھی کہ کئی بار اس طرح مسلسل رونے کی وجہ سے بھی، دم گھٹنے سے موت ہوجاتی ہے۔ باہر آنے کے بعد بھی نور محمد کے چہرے پر معصومیت بھرا وہی سوال ناچ رہا تھا جس کی شروعات سفیان ماموں نے کی تھی —

میرا قصور کیا ہے؟

'کوئی قصور نہیں ہے —'

'تو سب مجھے موردِ الزام کیوں ٹھہراتے ہیں —'

'ابھی سب کے بارے میں نہیں — صرف نادرہ اور نگار کے بارے میں سوچنے کا ہے۔'

وہ ایک بار پھر اسی سوال پر لوٹ آیا تھا—

'ایسا میرے ساتھ ہی کیوں ہوتا ہے......'

'تقدیر کے کھیل کوئی نہیں جانتا نور محمد—بس اوپر والے پر بھروسہ رکھو—'

'بھروسہ رکھ کر تو یہ حال ہو گیا ہے۔ اب بھروسہ اٹھ گیا بھیّا—'

'ایسا نہیں کہتے نور محمد، حالات سے لڑنے والا ہی تو بہادر ہوتا ہے......'

'سب کتابی باتیں ہیں بھیّا— کوئی کتنا حالات سے لڑ سکتا ہے— شادی کے بعد کتنا خوش تھا— جیسے دنیا کی ساری خوشیاں بس میری جھولی میں آ گئی ہوں اور بس چند دنوں بعد ہی— میرے اندر آہستہ آہستہ یہ شک اب یقین میں بدلتا جا رہا ہے کہ یہ اوپر والے جیسی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ اگر وہ ہوتا تو اتنا ظالم نہیں ہوتا بھیّا—

وہ اپنے آنسو پوچھ رہا تھا—

●●

اس رات کافی دیر تک رقیہ اور شان سے باتیں کرنے کے بعد میں اپنی چھوٹی سی لائبریری میں آ گیا۔ یہاں دنیا بھر کی کتابیں تھیں—اور یہ کتابیں میری زندگی بھر کا تحفہ تھیں—بلند حویلی کے خاموش در و بام نے مجھے اچھی زندگی کے لیے جو راستہ دکھایا تھا وہ ان کتابوں سے ہو کر جاتا تھا— اسکول اچھا چل رہا تھا—بس نگہداشت کے لیے وہاں کچھ دیر کے لیے میرا جانا ضروری ہوتا تھا— اور باقی وقت کتابوں کے ساتھ گزرتا— تنہائی میں کتابوں کے صفحے مجھے کسی اور دنیا کا ہم سفر بنا دیتے تھے۔

بلند حویلی سے لے کر نور محمد اور کوٹھی کے واقعات نے میرے دل و دماغ پر اپنا بسیرا کر رکھا تھا۔ اچانک مجھے نکولائی گوگول کی کتاب Dead Souls کی یاد آ گئی—اس کا ایک کردار جو مرے ہوئے غلاموں کی خرید کر کے ایک بڑا رئیس زادہ بننے کا خواب دیکھ رہا ہے۔ وہ ایسے

جاگیرداروں سے ملتا ہے جن کے پاس ہزاروں کی تعداد میں غلام تھے اور بہت سارے غلاموں کے مرجانے کے باوجود بھی ان کے نام سرکاری اعداد و شمار کے رجسٹر میں درج تھے اور یہاں اُنہیں زندہ دکھایا جا رہا تھا — اور حکومت اب تک ان غلاموں پر ان کے مالکان سے ٹیکس وصول کر رہی تھی — وہ کردار ایسے ہی مردہ روحوں کی خریداری کر کے، سرکاری کاغذات میں راتوں رات رئیس زادوں میں اپنا ایک بڑا مقام بنانے کا خواب دیکھ رہا تھا —

مجھے ہنسی آرہی تھی۔ کچھ کچھ یہاں کا نظام بھی ایسا تھا۔ آزادی ایک مردہ آسیبی نظام کو اپنے ساتھ لے کر آئی تھی...... مجھے کچھ دن پہلے راستہ میں ملے ایک پاگل کی یاد آئی جو کسی کوڑے کے ڈھیر سے ایک کپڑے کا گڈّا اٹھا لایا تھا اور اسے پیٹ رہا تھا۔ پوچھے جانے پر اس نے بتایا......

'میرا ملک بیمار ہے — اسے اچھا کر رہا ہوں......'

یہ گڈّا اس پاگل کے لیے ایک بیمار ملک کی حیثیت رکھتا تھا — مگر یہاں —

کہانیاں آپس میں گڈمڈ ہو گئی تھیں۔

یہاں اسی بیمار ملک میں ایک بچی پیدا ہوئی تھی۔

جو اپنے جنم سے مسلسل روئے جا رہی تھی۔

●●

نادرہ کے زرد چہرے اور کمزور جسم کو دیکھنے کی مجھ میں ہمت نہیں تھی — ہم بڑی بڑی سیڑھیوں سے ہو کر اس وارڈ میں پہنچے تھے، جہاں کمزور بچوں کو رکھا جاتا تھا اور ان کی نگہبانی کے لیے نرسوں کا جال بچھا ہوا تھا۔ اندر جانے کی ممانعت تھی...... وہ ایک شیشے کے کیبن طرح تھا...... جہاں باہر سے ہم ایسے بچوں کو صرف اپنی آنکھوں تک محسوس کر سکتے تھے......

وہ ہے......

لیکن کہاں......

’ادھر دیکھو تو سہی......‘

اُدھر کہاں......؟

ارے اُدھر......اس طرف...... جہاں وہ گوری والی نرس......‘نور محمد اشارے سے مجھے کچھ دکھانے کی کوشش کر رہا ہے......

میرے اندر تیز دھماکے گونج رہے ہیں۔ نادرہ کی بیٹی...... نگار...... اُس کے جسم سے برآمد......اس کے نوخیز جسم سے برامد ہونے والی......شاید ایک حسین تتلی......اور تتلی کے پروں کے لمس جیسے اب بھی میرے ہونٹوں پر محفوظ تھے......

نور محمد کے ساتھ میں اس وقت نگار کی خیریت لینے آیا تھا......ایک قطار سے نظر آنے والے بچوں میں مجھے نگار کہیں نظر نہیں آ رہی تھی......

ارے وہ ہے......اس طرف......نور محمد اشارہ کر رہا تھا۔

لیکن کہاں......

بالکل وہیں...... جہاں میری یہ شہادت کی انگلی ہے......دراصل......

دراصل کیا......

وہ بن رہی ہے......

’بن رہی ہے......؟‘ میں ایک دم سے چونک گیا تھا......

اس کے رونے کی آواز سنیے۔ وہ بن رہی ہے—وہ وقت سے پہلے آ گئی ہے—اور یقیناً ایک دن وہ ایک مکمل بچی میں تبدیل ہو جائے گی......لیکن وہ رو کیوں رہی ہے......‘

اور حقیقت یہ ہے کہ مجھے نگار کہیں نظر نہیں آئی—ہاں نور محمد مطمئن تھا کہ ایک دن وہ صحتمند ہو جائے گی—اور سب ٹھیک ہو جائے گا......لیکن باہر آنے کے بعد اس کے یہ احساس ٹوٹ گئے تھے......وہ بچوں کی طرح رو رہا تھا......اور ایک بار پھر وہی جملہ اس کے ہونٹوں پر تھا—

’بھیّا—یہ سب میرے ساتھ ہی کیوں ہوتا ہے......‘

●●

ادھر سفیان ماموں نے ایک نیا راگ الاپنا شروع کر دیا تھا...... پاکستان کے بٹوارے سے جہاں وہ خوش تھے، وہیں بنگلہ دیش میں شیخ مجیب الرحمٰن کی حکومت آنے کے بعد وہ دوبارہ واپس جانے کے خواہشمند تھے— لیکن یہ ضرور تھا کہ بنگلہ دیش کی بجائے وہ اپنی عافیت پاکستان میں ہی تلاش کر رہے تھے— لیکن شاید اب یہ کام آسان نہ تھا— اس لیے سب سے زیادہ ناراضگی اُنہیں اپنے ہی گھر میں جھیلنی پڑی—

ممانی کو غصہ تھا— اب یہ کیا پاگل پن سوار ہو گیا— وہاں ہے ہی کون جو جایے گا— اور جانا ہے تو اکیلے جایئے— ہم تو نہیں جائیں گے......

واہ یہ کیسے ممکن ہے—

'یہ ایسے ممکن ہے کہ ہم نہیں جائیں گے بس— ہمارا اپنا ملک ہی بھلا۔ رہیں گے یہیں اور مریں گے بھی یہیں—'

ممانی اپنے فیصلے پر قائم تھیں— اور ادھر سفیان ماموں دو ایک روز اپنی الجھن میں ساری دنیا بھول بیٹھے تھے—

ممانی انہیں سمجھانے کی کوشش کرتیں—

'آپ تقدیر سے کیوں الجھ رہے ہیں۔ مت الجھیے— سب ٹھیک ہو جائے گا۔ مصیبت کہاں نہیں آتی۔ لیکن مصیبت سے باہر نکلنے کے لیے سوچتے ہیں۔ مصیبت کے آگے ہتھیار نہیں ڈالتے......'

'ہاں، بالکل ٹھیک......'

'سب سمجھتے ہیں آپ— پھر بھی بچے بن جاتے ہیں—' ممانی آنسو پوچھ رہی تھیں—

سفیان ماموں پان کھاتے ہوئے ٹہل رہے تھے— لیکن کیا کروں...... نادرہ کی بدنصیبی نہیں دیکھی جاتی—'

’اللہ یہ کیسی زبان بول رہے ہیں آپ؟ کوئی اپنی بیٹی کو بدنصیب کہتا ہے— زندگی آزمائش ہے—اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ —‘

’وہ ...... نگار...... اسے کچھ ہوگا تو نہیں نا......‘ سفیان ماموں اب میری آنکھوں میں جھانک رہے تھے......تم تو اسے دیکھ کر آئے ہو......کیسی ہے وہ؟ میری تو ہمت ہی نہیں......‘

میں سناٹے میں تھا— چارلس ڈکنس کی دنیا میں...... اے ٹیل آف ٹوسیٹیز — اندھیرے میں اپنے ہی لفظوں کی گونج نے مجھے ہراساں اور پریشان کر دیا تھا—

’یہ سب سے اچھا وقت ہے

اور شاید یہ سب سے برا وقت بھی—

یہ بیحد سمجھداری کا وقت ہے......

اور بیحد بے وقوفی کا بھی—

یہ نیندوں سے جاگنے کا وقت ہے—

اور بے یقینی کا بھی‘

یہ اُجالوں کا موسم بھی ہے

اور اندھیرے کا بھی—

شاید ہمارے سامنے سب کچھ ہے

اور شاید ہمارے سامنے کچھ بھی نہیں—

ہم سیدھے روشنی کی طرف بڑھ رہے ہیں......

یا نہ ختم ہونے والے اندھیروں کی طرف......

●●

’وہ رو رہی ہے—ڈاکٹر کہتا ہے......وہ نہیں بچے گی—وہ مر جائے گی......‘

نور محمد کانپ رہا ہے— نادرہ گھٹ گھٹ کر مر جائے گی بھیّا— نگار کو بچنا ہی ہوگا......

'اُس کا رونا کم ہی نہیں ہو رہا ہے...... میں نے اس سے پہلے کیا کیا نہیں دیکھا تھا بھیّا— کیسی کیسی انوکھی بیماریاں......جنگیں صرف بیماریاں ہی تو پیدا کرتی ہیں— مگر یہ انوکھی بیماری— اس نے ایک برے موسم میں آنکھیں کھولی ہیں۔ شاید بے حد برے موسم میں اور وہ......صرف روئے جا رہی ہے......

میں خاموش تھا— اس سے پہلے میں نے نگار کے موضوع پر ڈاکٹر ابھیتوش سے باتیں کی تھیں— پھر اس لیڈی ڈاکٹر سے بھی جو نگار کا کیس دیکھ رہی تھی— میں نے کئی ڈاکٹروں سے اس بارے میں گفتگو بھی کی تھی— دلّی کے ڈاکٹروں سے بھی مشورہ ہوا تھا—

ڈاکٹر ابھیتوش نے کہا تھا— وہ برطانیہ سے آنے والی ایک رپورٹ کا انتظار کر رہے ہیں— نگار کے بارے میں تمام تفصیلات برطانیہ کے ایک بڑے ہاسپٹل کے ایک قابل ڈاکٹر کو بھیج دی گئی ہیں۔ اُس اسپتال کا تحقیقی ادارہ اسی موضوع پر کام کر رہا ہے......

ہندستان اور پاکستان کے درمیان اب بھی جنگ کے گھنے سائے برقرار تھے۔ بنگلہ دیش بن جانے کے باوجود دونوں ملکوں میں رسہ کشی جاری تھی—

اور ادھر— نگار پیدا ہو چکی تھی— مگر المیہ تھا کہ وہ مسلسل روئے جا رہی تھی—

●●

آسمان پر منڈرانے والے جنگی طیارے خاموش تھے......لیکن دلوں میں جنگ کے احساس اب بھی زندہ تھے— پاکستان اور بنگلہ دیش کی کہانیاں گھر گھر سنی جا رہی تھیں— ہر جگہ شیخ مجیب الرحمٰن اور اندرا گاندھی کے چرچے تھے— نئے موسم میں جنگ کے جراثیم اب بھی باقی تھے— اور یہ جراثیم آہستہ آہستہ نفرت بن کر دلوں میں سلگنے کی تیاری کر رہے تھے—

سناٹے میں آوارہ روحوں کا حملہ مجھ پر تیز ہو جاتا......

ہم دراصل دو دنیاؤں کے درمیان پھنس چکے ہیں—
ایک دنیا، جہاں صرف اپنا بچاؤ کرنا ہے۔
اور دوسری دنیا، جہاں جنگی طیارے منڈرا رہے ہیں—
آنکھوں کے پردے پر نور محمد کا چہرہ منڈراتا—وہ بچ جائے گی نا؟ ورنہ نادرہ بھی مرجائے گی......'

اس کے آنسو بہہ رہے تھے......میں اُس کا کھونا کبھی برداشت نہیں کرسکتا......'

میں اس سے کیا کہتا، کہ میں خود بھی اسی راستے کا مسافر ہوں—جہاں نادرہ کو کھودینے کا احساس مجھے بھی اتنا ہی پاگل کرتا ہے، جتنا تمہیں......

لیکن وہ ان باتوں کو جانتا ہی کب تھا—

ڈاکٹر ابھیتوش کا فون آیا تھا—برطانیہ والی رپورٹ آچکی ہے۔ مجھے فوراً بلایا تھا—

(۲)

ڈاکٹر ابھیتوش کی نظریں فائل پر جھکی ہوئی تھیں—اس کے ہاتھ تیزی سے صفحے پلٹ رہے تھے—آنکھوں میں حیرانی کی چمک تھی—مختصر سا کمرہ تھا۔ دیوار پر اس کے پیشے سے منسلک کچھ تصویریں آویزاں تھیں—میں سامنے والی کرسی پر بیٹھا اس کے چہرے کے بدلتے تاثرات کو دیکھ رہا تھا—

'میڈیکل سائنس انسانی امراض کے لیے ابھی تجربے کے مراحل میں ہے......انسانی جسم کا سب سے اہم حصہ ہے دماغ—دماغ ہی پورے جسم کو کنٹرول میں رکھتا ہے—' وہ مسکرایا......

یہ رپورٹ دیکھو—یہ سین فرانسسکو کی ایک عورت کے بارے میں ہے—پیدائش سے 62 سال کی عمر تک وہ مسلسل روتی رہی—اور 62 سال کی عمر میں اس کی موت ہوئی—

حیرت ہے......

اور یہ...... نیوزی لینڈ کی ایک بچی— محض تین سال تک زندہ رہی— اس کا رونا کچھ وقفے تک کم ہو جاتا تھا۔ پھر کچھ دوا کے اثرات بھی کام کرتے تھے۔ ڈاکٹر اس کے ذہن کو زیادہ تر سلا کر رکھتے تھے— جاگتے ہی وہ رونا شروع کر دیتی تھی۔ پیدائش 1930 ، انتقال 4/ جون 1933۔

اوہ...... میں اس بچی کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ تصویر میں بھی وہ روتی ہوئی نظر آرہی تھی—

اور یہ...... یہ کچھ سنگین تصویریں......' ڈاکٹر ابھیتوش میری طرف مڑا— یہ کاغذات مجھے حیران کر رہے ہیں کاردار۔ مائی گاڈ— میں نے اب تک ان حیران کن نتائج کے بارے میں نہیں سوچا تھا— یہاں کئی بچے ہیں۔ اور یہ بچے اُنہیں دنوں پیدا ہوئے جب عالمی جنگ کے شعلوں سے ساری دنیا ڈری ہوئی تھی— ان میں سے کئی بچے پہلے اور دوسرے ورلڈ وار کے بعد پیدا ہوئے......'

اس نے کاغذ کے پلندے میری طرف بڑھائے...... ان میں سے کوئی بھی پانچ چھ دنوں سے زیادہ زندہ نہیں رہا— ویت نام...... جاپان...... ناگا ساکی...... جرمنی...... روس...... پٹنا گن...... پیدا ہوتے ہی یہ بچے آنسوؤں کی دنیا میں آ گئے— انہیں بھی رونے کے دورے پڑتے تھے...... اور ان میں سے کوئی بھی لمبی حیات نہیں پا سکا......'

مجھے وہ جنگی طیارے نظر آئے جو بس ابھی کچھ دنوں پہلے تک مسلسل آسمان میں گشت کرتے ہوئے نظر آرہے تھے......

'اور یہ...... پاکستان میں پیدا ہونے والے کچھ بچوں کی رپورٹ— وہاں بھی ایک سال پہلے ایسے دو بچے پیدا ہوئے— ان میں ایک لڑکی تھی— لڑکی پیدا ہونے والے دن ہی مر گئی— اور لڑکا دو دن تک زندہ رہا— نتیجہ دیکھو— روتے روتے دم گھٹنے سے موت......'

'کیا یہ بچے بھی جنگ کی پیداوار تھے؟'

'نہیں کہا جا سکتا......'

'کیوں......؟'

’سائنس ٹھوس نتیجوں پر پہنچنے سے پہلے فیصلہ نہیں دیا کرتا۔اسی لیے ان بیماریوں پر ریسرچ کا کام ابھی جاری ہے۔جنگیں اور تباہیاں اپنے ساتھ ہزاروں طرح کی بیماریاں بھی ساتھ لے کر آتی ہیں......اور یہ دیکھو کا ردار......

ایک خوبصورت سی لڑکی تھی— جو کہیں سے بھی بیمار نہیں نظر آ رہی تھی...... میں چونک گیا تھا—

یہ نیوزی لینڈ میں پیدا ہوئی—32 سال تک کی حیات ملی۔مگر ساری زندگی رونا ہی اس کا مقدر رہا— دن میں کئی کئی بار رونے کے دورے پڑتے تھے......مگر عام لڑکیوں جیسی ہی ایک لڑکی......‘

ابھیتوش میری طرف دیکھ رہے تھے—

’شاید اسی لیے ابھی تک اس بیماری کو کوئی نام نہیں دیا جا سکا ہے۔بچوں کی ان بیماریوں کے پیچھے دراصل تین چیزیں ہوتی ہیں— اسے سمجھو—Mental, Emotional اور Behavioral Disorder ان سب کے اثرات بھی مختلف ہوتے ہیں— جیسے۔مثال کے لیے......‘

ڈاکٹر ابھیتوش مسکرائے—

Anxiety disorders, severe depression, Bipolar disorder, attention-deficit/Hyaperactivity Disorder, Learning Disorders, Conduct Disorder, Eating Disorders, Autism, Schizophrenia.

لیکن ان سب کا تانا بانا کہیں نہ کہیں دماغ سے جڑا ہوا ہے— پیدا ہوتے ہی کچھ بچوں کو سیزر یا جھٹکے شروع ہو جاتے ہیں۔کچھ ایسے بھی بچے ہوتے ہیں جو پیدا ہوتے ہی آدھے ادھورے ہمارے سامنے ہوتے ہیں۔جیسے ہونٹ کا حصہ نہیں بن پایا— یا گال کے پاس کا......ان بچوں کی

پیدائش کے ساتھ ہی ہم تینوں کیفیت کو لے کر اپنی ریسرچ کو آگے بڑھاتے ہیں— ان میں کچھ بچے اگر grow کر بھی جاتے ہیں، اس کے بعد بھی ان کی بیماریاں بنی رہتی ہیں— مینٹل، ایموشنل اور بیہویریل پرابلم ان کے بڑے ہونے کے ساتھ ساتھ زیادہ تکلیف دہ ہونے لگتا ہے— اور اسی لیے ہم انہیں Disorder کہتے ہیں۔ مینٹل ڈس آرڈر...... ہم اس Disorder کو Identity کرنے یا Require Treatment کی کوشش کرتے ہیں لیکن زیادہ تر چانسیز اس بات کے ہوتے ہیں کہ بچے عام نارمل لائف کو Enjoy نہیں کر پاتے۔ ایسے بچوں کا دنیا میں آنا بھی ایک تکلیف دہ مرحلہ ہوتا ہے— اور ان کے ساتھ زندگی گزارنا بھی—'

میں آہستہ سے بڑبڑا رہا تھا...... 'ہم ان دیکھی جنگوں کی طرف بڑھ رہے ہیں اور جنگیں ہمیں تباہ کر رہی ہیں ڈاکٹر......'

ڈاکٹر ابھیتوش کھڑکی کے باہر دیکھتا ہوا بتا رہا تھا—

Mental health disorders in children and adolescents are caused by biology, environment, or a combination of the two. Examples of biological factors are genetics, chemical imbalances in the body, and damage to the central nervous system, such as a head injury. Many environmental factors also can affect mental health, including exposure to violence, extreme stress, and the loss of an important person.

Families and communities, working together, can help children and adolescents with mental disorders. A broad range of services is often necessary to meet the

needs of these young people and their families.

میں نے سنبھلنے کی کوشش کی — ایسے بچوں کے لیے dedication کا جذبہ — وہ بھی اس پاگل بھاگتی دنیا میں — جہاں ہر طرف ایک ریس ہے...... ایک جنگ ہے...... اور بچے اپاہج پیدا ہو رہے ہیں...... جہاں ہر طرف تباہیاں ہیں اور بچے آدھے ادھورے جنم لے رہے ہیں۔ جہاں بم پھٹ رہے ہیں — گولے داغے جا رہے ہیں...... اور بچے پیدائش کے ساتھ ہی سیزر اور جھٹکے سہنے لگتے ہیں — ایک جنگ کے بعد دوسری جنگ — اور بچے مسلسل مینٹل ڈس آرڈر کا شکار ہوتے جا رہے ہیں — یہ سب کیا ہے ڈاکٹر......'

'یہ سب آپ کی کتابیں بول رہی ہیں — ہم اس سطح پر اتنے جذباتی ہو جائیں تو پھر ہار کر بیٹھ جائیں — اسی لیے' ہمارے لیے نتیجہ اہم ہے — ہم ہارنے کے باوجود ہر بار ایک بہتر نتیجے کی امید کرتے ہیں۔ کبھی کبھی تو سینکڑوں سال تک —'

'لیکن عام زندگی سینکڑوں سال انتظار کہاں کرتی ہے ڈاکٹر؟ وہ بچی جو اس دنیا میں آئی ہے' وہ بھی ان لوگوں کی طرح ہے، جس کی رپورٹ اور تصویریں آپ کی میز پر پھیلی ہوئی ہیں — عام آدمی کو صرف ایک چیز سے مطلب ہوتا ہے — اس کا مریض بچے گا یا مر جائے گا — مجھے بتایئے — نگار کا کیا ہوگا......؟'

'ساری — یہ نہیں بتا سکتا — ہم آخر وقت تک انسانی جان کے تحفظ کے لیے لڑتے ہیں اور یہ کام ابھی بھی جاری ہے۔

'تو آپ اسے بچا لیں گے؟' میری آنکھوں میں الجھن کے آثار تھے — یا پھر وہ لڑکی آپ کے تجربے کا ایک حصہ بن جائے گی —؟ ان تصویروں کی طرح...... یا ان تصویروں میں ایک اور کا اضافہ — پھر آپ اپنی یہ رپورٹ برطانیہ کے ہسپتال کو مزید تجربے کے لیے بھیج دیں گے —'

'یہ تجربہ کسی ایک کے لیے نہیں ہوتا، اس کے پیچھے آنے والی انسانی نسلیں ہوتی ہیں — تجربے نہ ہوں تو نہ نئی تحقیق سامنے نہ آئے اور نہ نئی میڈیسن —'

ڈاکٹر ابھیتوش میرے فکر مند چہرے کو دیکھ رہا تھا— 'کچھ بچے پیدائشی ذہنی معذور نہیں ہوتے— پھر بھی پیدائش کے کچھ دنوں بعد یا نوجوانی میں پہنچے کے بعد بھی وہ Anxiety کا شکار ہوجاتے ہیں۔ 9 سال کے بچے— تیرہ سال کے۔ سولہ سال کے— ایک سروے کے مطابق اب ہمارے ہی ملک میں Anxiety disorder والے بچوں کی تعداد کافی بڑھتی جا رہی ہے—'

'لیکن کیوں ڈاکٹر......'

'ڈر......خوف...... نئے بچوں کی سب سے بڑی بیماری ہے خوف— ایک ان دیکھا خوف اُنہیں جکڑتا چلا جاتا ہے۔ کچھ ماں باپ بیحد پیار کرتے ہوئے بھی اپنے بچوں کے اندر کے اس خوف کو نہیں جان پاتے— یا بچے جب ان کے سامنے ہوتے ہیں تو وہ اس خوف سے الگ ہوتے ہیں— مگر ذرا بھی تنہائی کا احساس اُنہیں دوبارہ خوف کے چنگل میں قید کر دیتا ہے— اور آپ کہہ سکتے ہیں — بیحد معصوم نظر آنے والے یہ بچے بھی اچانک Severe Depression کا شکار ہوجاتے ہیں۔

میرے دماغ میں مسلسل ایک فلم چل رہی تھی......کوٹھی میں آسیب اور جنات کا ہنگامہ— بلند حویلی کے زوال کی دردناک داستان— ماضی سے لپٹے ہوئے لوگ— گمشدہ خزانے کی تلاش— آسمان پر منڈرانے والے جنگی طیارے— ہندستان اور پاکستان کی جنگ— آنکھوں میں سمائی ہوئی نفرت— پاکستان کی تقسیم— دونوں ملکوں کے آپسی رشتوں کا تکلیف دہ حد تک خراب ہوجانا— سفیان ماموں کا آنا— نادرہ کی شادی اور...... نگار کا جنم...... مسلسل خوف کی بارش......جنگیں......تباہیاں......اور ایک نئے انسان کی آمد......

ڈاکٹر ابھیتوش میری طرف مڑے— میں آپ کو کچھ ایسے ڈس آرڈر کے بارے میں بتاتا ہوں۔ مثال کے لیے—

☆ Phobias, which are unrealistic and

overwhelming fears of objects or situations.

☆ Genernalized anxiety disorder, which causes children to demonstrate a pattern of excessive, unrealistic worry that cannot be attributed to any recent experience.

☆ Panic disorder, which causes terrifying "panic attacks" that include physical symptoms, such as a rapid heartbeat and dizziness.

☆ Obsessive-compulsive disorder, which causes children to become "trapped" in a pattern of repeated thoughts and behaviors, such as counting or hand washing.

☆ Post-traumatic stress disorder, which causes a pattern of flashbacks and other symptoms and occurs in children who have experienced a psychologically distressing event, such as abues, being a victim or witness of violence, or exposure to other types of trauma shuch as wars or natural disasters.

ڈاکٹر ابھیتوش مسکرائے...... یہ ہے آج کی حقیقت کا ردار— پہلے ہم سب سوچتے تھے کہ چھوٹے بچوں پر سویرڈپریشن کا اٹیک نہیں ہوسکتا جبکہ آج تسلیم کیا جاچکا ہے کہ یہ اٹیک کسی بھی عمر کے بچوں پر آسکتا ہے— اب آپ نگار کو ہی لیجئے— میں آپ کو سمجھاتا ہوں کہ اموشنل اٹیک کی کیا کیا

قسمیں ہو سکتی ہیں — جیسے کچھ بچے پیدا ہوتے ہی ایک SAD چہرہ لے کر آتے ہیں۔ اور کچھ زور زور سے چلّانے یا رونے لگتے ہیں — اب ان بچوں کا ایک دوسرا چہرہ دیکھیے — Motivation کچھ بچے کھیلنے کودنے سے دور بھاگتے ہیں یا اسکول ہوم ورک میں ان کی دلچسپی نہیں کے برابر رہ جاتی ہے — Day to day life — کھانے پینے میں دل نہیں لگنا۔ وقت پر نہیں سونا — کسی Sleeping pattern کا نہیں ہونا — بچوں کے یہ مسائل Physical complaints میں آتے ہیں — اور اسی ڈس آرڈر کی ایک اور تہہ ہے — — Thoughts بہت سے بچے سوچتے ہیں کہ وہ خوبصورت نہیں ہیں۔ یا سامنے والا اُنہیں مار سکتا ہے — یا وہ کسی کام کو صحیح طریقے سے انجام دینے کے لائق نہیں ہیں — اور پھر یہ...... کہ یہ دنیا اور زندگی ایک بالکل ہی واہیات یا بیکار سی شے ہے — اسی لیے — Attention Deficit، Bipolar Disorder، Eating Disorder، Conduct Disorder، Learning Disorder Autism کی طرح ایک اور اٹیک ہے — Schizophrenia۔ بچے حقیقت سے آنکھیں چار کرتے ہوئے گھبراتے ہیں...... اور کہیں بھی خوش نہیں رہ پاتے۔ یا دوسری صورت میں وہ اپنے لیے ہر جگہ، ہر مقام پر دکھ کے سوراستے خود پیدا کر لیتے ہیں......'

'مائی گاڈ......' میری آنکھیں بند تھیں — بچوں کی ننھی سی خوبصورت دنیا بیماریوں میں بدل گئی تھی — ایک بیمار نظام میں پیدا ہونے والے بیمار بچے —

میری آواز کمزور تھی...... آپ کا میڈیکل سائنس صرف ریسرچ کر رہا ہے یا ایسے بچوں کی تندرستی اور صحت کے لیے......

'ہو...... ہو......' ڈاکٹر ابھیتوش زور زور سے ہنسے...... ساری دنیا آپ کے سامنے ہے کاردار — لوگ مر رہے ہیں لیکن لوگ زندہ بھی ہیں، جس تیزی سے لوگ مر رہے ہیں، اسی تیزی سے پیدا بھی ہو رہے ہیں —'

'اپنی بیماریوں کے ساتھ......'

'بالکل صحیح کہا— لیکن ایک حقیقت اور بھی ہے کاردار— ہم انسان ہیں اور انسان ہار نہیں مانتا—'

'میں بھی نہیں مانوں گا—'

'لیکن ایک بات ضرور کہوں گا— ڈاکٹر ابھیتوش نے گہری سانس لی— مان لیجئے یہ بچی بچ جاتی ہے......تو......؟'

'مطلب؟'

'کتنے سال زندہ رہے گی؟' ابھیتوش میری آنکھوں میں جھانک رہے تھے— ایک بیمار بچی کا آپ کیا کریں گے—' وہ دوبارہ کھڑکی سے باہر جھانک رہے تھے— ڈاکٹروں کے ایک بڑے پینل نے تکلیف دہ بیماریوں کے لیے Mercy Death کا فارمولہ کھوج نکالا تھا۔ مگر مہذب دنیا کے چلانے والوں کو یہ فارمولہ منظور نہ تھا— آپ ایک بیمار کے ساتھ رہتے ہیں تو خود بھی بیمار ہو جاتے ہیں۔

میں خوفزدہ آنکھوں سے ڈاکٹر کے چہرے کو پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا—

'ابھی آپ کو میں نے کچھ رپورٹ دکھائی— اس حالت میں سب سے زیادہ زندگی پانے والی خاتون کی عمر 62 سال تھی۔ کیا آپ سوچ سکتے ہیں، یہ 62 سال کس طرح گزرے ہوں گے اور 62 برسوں میں اس عورت سے وابستہ لوگوں پر کیا گزری ہوگی—؟

'تو آپ کا خیال ہے مرسی ڈیتھ......'

آخر اسے عام کرنے میں برائی ہی کیا ہے— جب ہم جانتے ہیں کہ دولت بھی اس مرض کے آگے بیکار ہے......'

'یعنی ایک موہوم سی امید کے آگے......؟'

'آپ اس موہوم سی امید کو جلائے رکھیے— اور ڈاکٹر اپنی تجربہ گاہ کو جلائے رکھے گا—'

'یعنی آپ کے لیے کوئی انسانی زندگی......؟'

'معنی رکھتی ہے کا ردار — لیکن ایک بیمار' جس کے بچنے کا کوئی چانس نہ ہو — اور جس کے بارے میں پتہ ہو کہ یہ زیادہ دن سروائیو نہیں کر سکے گا......'

'اور اسی لیے مرسی ڈیتھ......' میں تکلیف دہ حد تک لہولہان تھا — چلیے، ایک دن مہذب دنیا کے لوگوں کو عقل آ جائے گی — اور وہ اس مرسی ڈیتھ کو قبول کر لیں گے......

میں جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا تھا —

(۳)

نگار اسپتال سے کوٹھی میں آ گئی — اور یہ فیصلہ نور محمد نے لیا تھا۔ شاید وہ تقدیر اور ڈاکٹروں کے آگے ہار گیا تھا — میں دیکھ رہا تھا، ادھر کئی دنوں سے اس پر چڑچڑا پن حاوی ہوتا جا رہا تھا — وہ ذرا ذرا سی بات پر چیخ اٹھتا۔ سفیان ماموں اور ممانی سے بھی وہ زیادہ باتیں نہیں کرتا تھا — ہاں کوٹھی میں لانے سے پہلے میری اس سے مختصر گفتگو ہوئی تھی —

جیسے اس نے کہا تھا — میں نے اب فیصلہ کر لیا ہے — میں نگار کو کوٹھی لے آؤں گا......

'لیکن اگر ڈاکٹر اجازت دیں گے......تب......نا......'

'نہیں......ڈاکٹر کے لیے میری بیٹی صرف ایک تجربہ ہے۔ میں اپنی بیٹی کو ان کی تجربہ گاہ کی بھینٹ نہیں چڑھاؤں گا — دونوں صورتوں میں، اس کا لہجہ سخت تھا — اگر وہ زندہ رہتی ہے...... یا پھر......خدا نے اس کی قسمت میں اتنی ہی عمر لکھی ہے۔ تب بھی......میں اسے کوٹھی لے آؤں گا......'

'پھر کیا کرو گے......؟'

'وہ میں نے سوچ لیا ہے......' اس کی آنکھیں خلاء میں دیکھ رہی تھیں۔ اور میں جانتا ہوں، آپ ان باتوں کو تسلیم نہیں کرتے......

'مثلاً......'

'جیسے میں یہ کہوں کہ اب مجھے ان ڈاکٹروں پر بھروسہ نہیں رہ گیا......'

'ہوسکتا ہے، ڈاکٹر تمہاری بیٹی کے مرض کی تشخیص اب تک نہیں کر پائے ہوں۔ کبھی کبھی وقت لگتا ہے......'

'یہ تشخیص اب ان کے بس کا روگ نہیں ہے۔'

'مطلب؟' اس بار چونک کر میں نے اس کی طرف دیکھا تھا— تمہارے کہنے کا مطلب کہیں یہ تو نہیں......'

'یہی ہے کہ اب مجھے ان ڈاکٹروں پر بھروسہ نہیں رہا—'

'وہی تو پوچھ رہا ہوں— پھر کیا کروگے—'

'وہ— جواب میرا دماغ کہتا ہے— اور جس کے لیے اب تک میں خود سے لڑتا رہا— میں وہی کرنے جا رہا ہوں...... اور میں جانتا ہوں بھیّا، آپ میری ان باتوں کو کبھی نہیں مانیں گے—'

'میں اب بھی نہیں سمجھا......'

'کچھ باتیں ڈاکٹروں کی پہنچ سے اوپر کی ہوتی ہیں— اسی طرح کچھ بیماریاں، جو ڈاکٹروں کی سمجھ میں کبھی نہیں آسکتیں......'

میرا دماغ بھنّا گیا تھا۔ میں اس کی طرف دیکھ رہا تھا، اس کا چہرہ جذبات سے عاری تھا۔

'تانترک، جھاڑ پھونک...... درگاہ...... پیر صاحب...... منّتیں...... چڑھاوا...... سدّھی...... منتر جاپ...... اور دعائیں......' وہ آہستہ آہستہ بدبدا رہا تھا...... میں وہیں واپس آگیا ہوں۔ کل ایک تانترک ملا تھا۔ اس نے بتایا...... نگار پر وہی جن سوار ہے، جو اماں پر تھا—

میں نے کچھ بولنے کی کوشش کی تو نور محمد نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے روک لیا—

'نہیں— بھیّا— کوئی نصیحت نہیں— میں آپ کے میڈیکل سائنس سے ہار گیا۔ اب مجھے میرے دل کی بات سن لینے دیجیے۔ ورنہ نگار کو کچھ ہوگیا تو مجھے زندگی پھر یہ بات پریشان کرے گی کہ میں ایک اچھا باپ ثابت نہیں ہوا— میں اس کے لیے اپنے دل کی آواز بھی نہیں سن سکا—'

●●

ایک بیحد کمزور اخلاقیات، جیسا کہ ایسے موقعوں پر ایک باپ کی ہو سکتی ہے۔ ایک باپ جو ساری زندگی خوشیوں کے لیے ترس گیا تھا— اور جب خوشیوں کے پھولوں کو چننے کا موسم آیا تو وہاں بھی خزاں رسیدہ موسم کی شروعات ہو چکی تھی—

گھر آنے کے بعد بھی نگار پر مسلسل دورے پڑ رہے تھے— نادرہ جیسے ایک خاموش بت میں تبدیل ہو چکی تھی۔ نگار کا رونا شروع ہوتا تو پھر بند ہونے کا نام ہی نہیں لیتا— رونے کے ساتھ ہی اسے جھٹکے آنے لگے تھے...... اور ایسا لگتا تھا جیسے اس کی سانسوں کی لڑیاں لمحہ بھر میں ٹوٹ کر بکھر جائیں گی—

دوبار رقیہ اسے دیکھنے آئی— مگر دونوں بار وہ شان کو گھر میں ہی چھوڑ کر آئی تھی۔ کیونکہ کوٹھی کے آسیبی ماحول میں اب نگار کے رونے کی آواز کچھ کچھ رات میں بھیڑیے کے رونے کی آواز سے ملتی تھی— نادرہ پھٹی آنکھوں سے لیٹی لیٹی بس نگار کو دیکھ لیتی تھی...... رقیہ نے محبت سے اسے ایک بار گود میں لینا چاہا تھا— مگر نگار کی ہچکیاں بندھ گئیں— رقیہ نے گھبرا کر اسے دوبارہ بستر پر لٹا دیا—

ایک بیحد کمزور سے جسم میں دو ننھی آنسوؤں میں لپٹی آنکھیں— میں نے کتنی بار ان آنکھوں کو دیکھنے کی کوشش کی— مگر ایک بار بھی مجھے اس مقصد میں کامیابی نہ مل سکی—

نور محمد نے نگار کی دیکھ بھال کے لیے ایک آیا رکھ لی— امّاں جی، سب اسے اماں جی بولتے تھے— بچے چھوڑ کر چلے گئے تھے— اماں جی محلے میں بچہ کھلائی کے لیے مشہور تھیں— لیکن اماں جی دو دن میں ہی یہ کام چھوڑ کر چلی گئیں—

'نا جی...... مجھ سے نہ ہوگا— اس بچی پر تو سایہ ہے......'

دو تین بچہ کھلائی کے بعد اب یہ مورچہ بانو نے سنبھالا تھا— بانو کے بارے میں مشہور تھا کہ اس کے شوہر نے چھوڑ دیا ہے— اور وہ بنگلہ دیش سے بھاگ کر آئی ہے— بانو کا اس دنیا میں

کوئی نہ تھا— گہرا سانولا رنگ، قد پانچ فٹ چار انچ کے آس پاس۔ چھریرہ جسم— ساڑی پہنتی تھی اور زیادہ تر خاموش رہتی تھی— لیکن اچھی بات یہ ہوئی کہ بانو کو اس کام میں مزہ ملنے لگا۔

نگار کو دن میں رونے کے جھٹکے کم از کم دو بار ضرور پڑتے تھے۔ اور یہ جھٹکے ایسے ہوتے کہ سامنے والا یقینی طور پر بچی کی زندگی سے مایوس ہو جاتا— بانو ایسے موقع پر مسکرا کر چپ رہنے کا اشارہ کرتی— اور کوئی بہاری، بنگالی گانا شروع کر دیتی— اس کا بچپن بہار میں گزرا تھا— پھر گھر کے لوگ بنگلہ دیش چلے گئے— وہاں تباہی مچی اور شوہر نے چھوڑ دیا تو وہ بھی ایک قافلے کے ساتھ بھاگ کر ہندستان چلی آئی—

وہ آرام سے اسے گود میں لیے کام کرتی رہتی— اور دل ہی دل میں کچھ نہ کچھ گاتی رہتی— اور اس درمیان اگر نگار کو رونے کا اٹیک آتا تب بھی اس کے کام میں کوئی فرق نہ آتا—

نور محمد، بانو کے آجانے سے خوش تھا— لیکن ٹھیکے کا کام اب لگ بھگ چھوٹ چکا تھا— وہ سارا سارا دن مولویوں اور تانترکوں کے پاس بھاگتا رہتا تھا— کبھی کوئی تعویذ...... کالے کپڑے میں لپٹی شمشیر...... ایک مولوی نے گھر کے ہر کمرے میں بڑی بڑی کیلیں ٹھونکیں— عام طور پر اس کے گھر کے دروازے پر اب ایسے جھاڑ پھونک کرنے والوں کو دیکھا جا سکتا تھا—

اسے سمجھانا بیکار تھا— کیونکہ اب وہ اسی راستے پر چل پڑا تھا—

●●

اس دن میں سفیان ماموں کو لے کر آیا تھا— بانو نے بتایا کہ نگار کو آج غیر معمولی طور پر جھٹکے آئے تھے— اور ابھی کچھ دیر پہلے ہی وہ روتے روتے سوگئی ہے—

سفیان ماموں، ممانی کے ساتھ ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر چائے پینے لگے— میں نگار اور نادرہ کو دیکھنے آگیا— میری آنکھیں سوئی ہوئی نادرہ پر جمی تھیں— آنکھیں بند تھیں— اس درمیان اس کا جسم بھی بے حد کمزور ہو گیا تھا— مگر ہونٹوں پر وہی گلاب روشن تھے— بیماری کے

باوجوداس کے چہرے کی خوبصورتی اور شادابی میں، کہیں کوئی فرق نہیں آیا تھا— اچانک اس نے کروٹ بدلی...... اور سامنے مجھے دیکھ کر ایک عجیب سی پر اسرار مسکراہٹ اس کے چہرے پر روشن ہوگئی— اس نے اٹھنا چاہا...... تو میں نے منع کر دیا—

'نہیں— آرام کرو...... طبیعت کیسی ہے......'

'جیسی دیکھ رہے ہو...... اس کے لب کانپ رہے تھے......' یہ...... یہ کہاں ہیں......'

'باہر...... نور محمد کے بارے میں پوچھ رہی ہو نا......؟'

جی......

'میرے ساتھ سفیان ماموں اور ممانی بھی ہیں— بلاؤں......؟ وہ ڈرائنگ روم میں ہیں...... بلاؤں......'

'نہیں......' اس کے چہرے پر تذبذب کے آثار تھے...... 'کچھ کہنا تھا تم سے— نہیں جانتی، زندگی کب بے وفائی کر جائے......'

'نہیں نادرہ......' میرے جسم میں اچانک کنکپی چھا گئی...... فرط جذبات سے میں نے اس کے ہاتھوں کو چوم لیا— 'نور محمد کی نہیں جانتا، لیکن یہ جدائی مجھے بھی برداشت نہیں ہوگی......'

'تو پھر مجھے چھینا کیوں نہیں......؟ اس کی آواز لڑکھڑا رہی تھی— آنکھوں میں چمک تھی— بولو رحمٰن— چھین سکتے تھے مجھے— تمہارے ہی گھر میں تھی— کوئی کچھ نہیں بولتا— کیوں نہیں چھینا......؟، اس نے گہری سانس لی— دوبارہ میرے ہاتھوں کو چھوا— میری انگلیاں سہلاتے ہوئے اس کے آنسو بہہ رہے تھے......

'مجھے بولنے دو رحمٰن...... اور ہاں...... ہاتھ مت ہٹانا...... پکڑے رہنے دو— اچھا لگ رہا ہے— مدتوں بعد...... سمجھ رہے ہو نا...... مدتوں بعد— تم نے تو خود سے ہی کاٹ دیا...... ایک لڑکی کے احساس بھی نہیں سمجھ سکے تم...... اور خود کو سب سے زیادہ ہوشیار سمجھتے رہے—

لمحے ٹھہر گئے تھے۔ یہ آسیبی حویلی اچانک طلسم ہوشربا میں تبدیل ہوگئی— میرے سامنے

وہ ساحرہ تھی، جسے میں نے پیار کیا تھا— ایک ایسی ساحرہ جس کی آنکھوں کی پراسرار چمک نے اس وقت مجھے کسی بے جان بت میں تبدیل کر دیا تھا......

وہ میرے ہاتھوں کو تھامے ہوئی تھی— اس کی انگلیاں، میری انگلیوں سے کھیل رہی تھیں۔ میرے سارے جسم میں گمشدہ وہی انگارے جمع ہو گئے تھے جب میں نے پہلی بار اس کے پھول جیسے ہونٹوں کا بوسہ لیا تھا—

نادرہ نے نظر اٹھائی۔ میری طرف دیکھا— 'یاد ہے جب میں پہلی بار تمہارے گھر آئی تھی— تمہیں دیکھ کر ہی، پہلی بار میں تڑپ گئی تھی— بات کیسے کرتی— تمہیں دیکھتے ہی امی کا دکھ بھول گئی— اور پھر ایسا لگا، جیسے تم بھی اسی احساس سے گزر رہے ہو۔ پاگل۔ ایک ہفتہ بعد تم سے بات ہوئی تھی— اور تم میری خاموشی کو پڑھ بھی نہیں سکے— تم مجھے بانہوں میں لیتے تھے اور اس سے پہلے ہی میں خود کو تمہارے حوالے کر دیتی تھی— پھر بھی تم اپنی نادرہ کو سمجھ نہیں پائے......'

اُس کے لفظوں میں تھرتھراہٹ تھی...... پھر تیز کھانسی اٹھی......

'نادرہ...... نادرہ......'

اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ 'پریشان مت ہو...... بیمار ہوں— لیکن یہ وقت خدا نے عطا کیا ہے...... بہت کچھ کہنا ہے تم سے— تمہارا انتظار کرتی تھی۔ ہمیشہ سوچتی تھی' آخر وہ کون سا لمحہ ہوگا جب تم ان سے الگ مجھ سے ملنے آؤ گے...... تم نے ایک بار بار بھی میرے بارے میں نہیں سوچا...... یہ بھی نہیں کہ میرا کیا ہوگا؟

میرے دماغ میں میزائلیں چھوٹ رہی تھیں— دھماکے ہو رہے تھے...... ابھی بھی اس کی انگلیاں، میری انگلیوں میں پیوست تھیں۔ اور جیسے اس ایک لمحے وہ وحشت اور خوف کی وادیوں سے دور نکل آئی تھی...... جسے آنا ہے آ جائے...... جسے جو سمجھنا ہے، وہ سمجھ لے— وہ کافی کمزور ہو گئی تھی۔ ایک جھٹکے سے وہ بستر پر بیٹھ گئی—

'ہاں...... مجھے دیکھنے دو...... برسوں گزر گئے...... ایسے ہی رہو...... ڈرو مت رحمٰن— یہ

آ بھی گئے تو کوئی زلزلہ نہیں آ جائے گا۔ مجھے دیکھنا ہے تمہیں؟'

وہ میرے چہرے پر جھک گئی تھی۔ اس کی آنکھیں میری آنکھوں میں جیسے گزرے ہوئے کل کو پڑھنا چاہتی تھیں —

نادرہ مسکرائی — چلو، تسلی ہوگئی — تمہاری آنکھوں میں اب بھی ہوں میں — اور ہاں — ابھی بھی تم بالکل ویسے ہی ہو...... ذرا بھی نہیں بدلے۔ آج بھی اچھے لگتے ہو۔ اسمارٹ...... ، وہ مسکرا رہی تھی......

لیکن دوسرے ہی لمحے اس کے چہرے کی دھوپ کو فکر کی بدلیوں نے ڈھک لیا تھا —

تم میرے کیوں نہیں ہو...... بولو......؟

نا...... نادرہ......

'کیوں نہیں ہو میرے — کمی کیا تھی مجھ میں — مانگ کیوں نہیں سکے مجھے — ابو تو لٹے لٹائے جان کی خیرات مانگنے پہنچے تھے تمہارے گھر — مانگا ہوتا تو آسانی سے مل جاتی میں — میں ہمیشہ سوچتی تھی، تم اب مانگو گے مجھے...... اب مانگو گے...... مگر تم نے تو...... ایسا کیوں کیا رحمٰن...... بولو...... کیوں کیا ایسا......'

میری آواز گنگ تھی — ہونٹ خاموش — جسم میں جیسے خون کا ایک قطرہ بھی نہیں — آواز کانپ رہی تھی......

'سب...... میں نے کیا نادرہ...... یا تم نے......؟ اچانک تم بدل گئی...... یاد ہے...... تم نے کبھی محبت کا اظہار نہیں کیا...... کچھ بھی نہیں بھولا میں...... سب کچھ یاد ہے — پھر احساس ہوا کہ صرف میں ہی محبت کرتا ہوں تم سے...... اور تم جو کچھ میرے ساتھ کرتی رہی، بس وہ ایک نازک عمر سے جڑا احساس تھا۔ اور اسی لیے خاموش محبت کے باوجود کبھی تم سے پوچھنے کی ہمت بھی نہیں ہوئی کہ تم مجھ سے پیار بھی کرتی ہو یا نہیں......

'پیار کے لیے پوچھا نہیں جاتا — بولنا ضروری نہیں ہوتا رحمٰن — دل کے جذبے تو بس

دل ہی سمجھتے ہیں— مجھے لگا، شاید میرے دل کی زبان سے تم واقف ہو گے......لیکن اب آہستہ آہستہ تمہیں بھولنے کی کوشش کر رہی ہوں......'

نادرہ مسکرائی— 'مشکل یہ ہے کہ ہمارے یہاں اگلا جنم بھی نہیں ہوتا......اس جنم میں تو تمہیں بھولنے سے رہی— اور اگلا جنم ہوتا نہیں......' اس بار اس کی آنکھیں ڈراؤنی لگ رہی تھی— انگلیاں، میری انگلیوں پر سخت ہو گئی تھیں— آواز بھی بھاری تھی—

'مجھے کیوں نہیں مانگا— ؟ دیکھو میری بیٹی کو......زندہ لاش لگتی ہے نا......ممکن ہے۔ تمہاری ہو جاتی تو زندگی میں یہ وقت ہی نہیں آتا— کیوں نہیں چھینا مجھے......ماردوں گی تمہیں......'

اس نے گردن پر اپنی انگلیاں سخت کیں اور دوسرے ہی لمحے پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی— مار بھی تو نہیں سکتی تمہیں— تمہارا یہی احساس تو بس مجھے اب تک زندہ رکھے ہے رحمٰن— ورنہ یہ نادرہ تو کب کی مر گئی ہوتی......'

میرے ہوش وحواس پر جیسے کوئی بجلی گری ہو—

وہ مسکرا رہی تھی......کہیں تم یہ تو نہیں سمجھ رہے تھے کہ میں نور سے پیار کرنے لگی تھی......

'ہاں......' میں نے گہری سانس کھینچی—

'مجھے بھی بعد میں یہی احساس ہوا— پاگل تھے تم۔ اس کی کہانی میری جیسی تھی۔ اس نے بھی ماں کو کھو دیا تھا— میری بھی ماں نہیں تھی— بس، ہمدردی تھی مجھے اس سے......سنا—' وہ چیخی— اور آج بھی ہمدردی ہے......میں پیار نہیں کرتی اسے— پیار صرف تم سے کیا۔ پیار صرف تم سے کرتی ہوں رحمٰن— تم کیوں نہیں سمجھ پائے مجھے...... پوچھا کیوں نہیں ایک بار بھی کہ سچ کیا ہے......میں سب بتا دیتی......اس زمانے میں، مجھے ابو سے نفرت ہو گئی تھی— بس کچھ بھی اچھا نہیں لگتا تھا— ابو شادی کرنے والے تھے— اور میں اس شادی کے خلاف تھی— میں امّی کو کیسے فراموش کر سکتی تھی— ابو میرا درد نہیں سمجھتے تھے۔ مگر— تم تو سمجھتے تھے۔ ان دنوں میری دنیا اجڑ گئی تھی— تم تو سہارا بن سکتے تھے میرا......

وقت ٹھہر گیا تھا......

وان گاگ کی پینٹنگ جاگ گئی تھی......تتلی کی طرح ایک لڑکی کی چمکتی، بولتی آنکھیں— اور یہ بولتی آنکھیں پوچھ رہی تھیں......

بتاؤ تو......وہ کیا ہے جو اچانک گوند کی طرح ہمیں ایک دوسرے سے چپکا دیتی ہے؟

زمان ومکان سے بے خبر—

جنگ اور تباہیوں سے الگ—

ہمیں کچھ اور سوچنے نہیں دیتی—

بتاؤ تو......وہ کیا ہے......جو دھماکوں کے باوجود ہونٹوں پر مسکراہٹ لا دیتی ہے......

اندھیرے کے باوجود آنکھوں میں چمک......

وہ کیا ہے......جو یاد کی رہ گزر پر آپ کو بے سہارا نہیں چھوڑتی......مرنے نہیں دیتی......

اور پینٹنگس سے نکل کر چپکے سے اڑ جانے والی تتلی کہتی ہے......محبت...... یہ تو بس محبت ہے......

اور اس پل—اس لمحے......صرف محبت کا خمار ہے......محبت کا نشہ......نہ روحیں......نہ بدروحیں......نہ جناتی سایوں کا بسیرا—نہ ویران چھتوں پر گھومتی چمگادڑیں......ڈراکیولا گم ہے...... ویمپائر دو محبت کرنے والوں کو دیکھ کر جیسے اپنے کوفن میں قید—اور یہاں...... چپکے سے محبت اپنی بانہیں پھیلائے کھڑی ہے—

شکوے روشن......

اور شکایتیں جاگ گئی ہیں—

'کیوں مرنے کے لیے چھوڑ دیا مجھے......کیوں نہیں بنے سہارا......میں گم ہو رہی ہوں رحمٰن......

نادرہ......خدا کے واسطے......میرے لفظوں میں تھرتھراہٹ ہے......

'کس کی نظر لگ گئی ہمارے پیار کو— یا تم سمجھ ہی نہیں پائے— میں نے تو پورا پورا خود کو تمہارے حوالے کر دیا تھا...... یاد ہے...... اس نے چپکے سے میری انگلیوں کو چھوا...... پھر ہونٹوں کو— یہ لمس آج بھی مجھ میں قید ہے—

ایک لمحے کو جیسے کمرے میں طوفان آ گیا۔

وہ جھکی— اور آگے بڑھ کر اپنے ہونٹ میرے ہونٹ پر رکھ دیئے...... جیسے ساری دنیا گھوم رہی تھی......

میں ایک بار پھر اسی ذائقہ، اسی احساس سے ہمکنار تھا...... اس نے آنکھیں بند کر لیں......

پھر ایک جھٹکے سے خود کو الگ کیا—

'میں بری روح نہیں بننا چاہتی تھی رحمٰن...... اس لیے...... مجھے یہ بھی احساس نہیں ہے کہ تم پرائے ہو چکے ہو...... یا میں کسی اور کی ہو چکی— میں شاید ان رسموں رواجوں کو بہت زیادہ نہیں مانتی— اور شاید تم بھی نہیں مانتے— مجھے نہیں معلوم، کتنی بچی ہے میری سانسیں، اس نے اشارے سے مجھے روک دیا تھا۔ اس لیے آج اپنے حصے کی آگ لے لی...... اس سے زیادہ کچھ چاہئے بھی نہیں تھا۔ اب کوئی گلہ نہیں۔ کوئی شکوہ نہیں— پہلے بھی کوئی شکایت نہیں تھی۔ اپنوں سے شکایت ہی کب ہوتی ہے— بس تم ذرا سیمنٹ اور چونے کی بنی دیواروں میں کسی اور کو لے آئے تھے— بس۔ لیکن جانتی تھی۔ دل کی آباد دنیا پر صرف میرا حق ہے—'

وہ ایک بار پھر ٹھہر گئی تھی—

میں کسی جادو نگری میں تھا— قدم قدم پر جادو کے کرشمے— اس کی آواز جیسے جسم کے اندر اندر تک ہلچل مچا رہی تھی......

شاید میں رو رہا تھا......

آنسو بہہ رہے تھے......

'غلطی تمہاری بھی تھی نادرہ...... نہیں— شاید صرف میری غلطی تھی— تم نور پر اپنی

ہمدردیاں خرچ کررہی تھی اور میں اسے محبت سمجھ رہا تھا— بلند حویلی کی کھوئی ہوئی شان کو نئی زندگی کی ضرورت تھی اور امّاں جلد از جلد میری شادی کرنا چاہتی تھیں— میں کیا کرتا نادرہ...... ایک بار بھی......بس ایک بار بھی تم نے پلٹ کر مجھے آواز دی ہوتی......اس زمانے میں، تو جیسے میری طرف دیکھنا بھی گناہ ہوگیا تھا— میں محبت کی زبان کیسے سمجھتا نادرہ...... مجھے معلوم ہے دیر ہوچکی ہے— اب کچھ بھی ممکن نہیں— ہم دونوں الگ الگ دو گھروں سے بندھے ہوئے لوگ ہیں— لیکن اس کے باوجود میری روح پر صرف تمہاری حکومت ہے نادرہ......'

'یاد ہے......' نادرہ اچانک میری طرف پلٹی...... یاد ہے رحمٰن، اس دن تم شان کے ساتھ آئے تھے۔ کاش تم میری خوشیاں دیکھ سکتے۔ میں پاگل ہوگئی تھی رحمٰن......شان میں پورے پورے تم اترے ہوئے تھے— وہی ناک نقشہ...... وہی ادائیں...... وہی ہونٹ...... لگا، بس تم ذرا سا چھوٹے کردیئے گئے ہو— میں تو شان کو گود میں لیے ہوا میں اڑ رہی تھی رحمٰن......میرے لیے وہ لمحہ جیسے میری زندگی بن گیا تھا— مجھے سمجھ میں نہیں آرہا تھا— میں کیا کروں؟ کیسے دکھاؤں اپنے جذبات— ایسا کیا کروں کہ تم......تم میرے جذبات کو سمجھ سکو......تم تب بھی نہیں سمجھ سکے...... کہ میں شان کے ساتھ اتنا خوش کیوں ہوں......ارے وہ شان نہیں— وہ تم تھے رحمٰن...... میں برسوں، مدت بعد بلند حویلی لوٹ گئی تھی......'

نادرہ کے آنسو بہہ رہے تھے— لیکن ایک بار بھی تم نے میرے احساس کو نہیں سمجھا— شان کے لیے میری تڑپ نہیں سمجھ پائے— کیوں رحمٰن...... بولو......جواب دو رحمٰن......؟

نادرہ......

اور جیسے اس پل روکتے روکتے میں نے خود کو احساس کی لہروں کے حوالے کردیا...... میں نے نادرہ کو اپنی بانہوں میں لے لیا— اس نے ایک جاگتے گھر کے خوف کے باوجود خود کو میری بانہوں میں گم ہوجانے دیا— مگر وہ سسک رہی تھی......اس کے آنسو رکنے کا نام نہیں لے رہے تھے......

سنو رحمٰن ...... وقت بہت کم بچا ہے...... سنو...... اس سے پہلے کہ کوئی آ جائے...... وہ مچھلی کی طرح میری بانہوں سے پھسل کر الگ ہوئی—

'یقین کرو— اپنی سانسیں جی چکی میں — بہت کم سانسیں بچی ہیں میرے پاس...... میں ایک بے حد خوفناک خواب کو اپنے آس پاس گھومتے ہوئے محسوس کر رہی ہوں...... شی......

اس بار پھر اس نے مجھے بولنے سے روک دیا تھا—

وہ ڈری، خوفزدہ آنکھوں سے چاروں طرف دیکھ رہی تھی...... کچھ اس سے بھی زیادہ برا ہونے والا ہے رحمٰن — بہت برا — مگر وعدہ کرو...... تم میری بچی کا ساتھ دو گے...... دیکھو— کبھی تم نے اس کی آنکھیں دیکھی ہیں...... دیکھونا...... یہ جیسی بھی ہے...... مگر اس کی آنکھیں تمہارے جیسی ہیں...... دیکھونا......

وہ پھر سے چپ ہوگئی تھی— میں ڈر رہی ہوں رحمٰن...... کچھ...... بہت برا ہونے والا ہے...... بس تم ہی سنبھال سکتے ہو— اور یہ...... تمہاری ساری باتیں مانتے ہیں......

میں نادرہ سے پوچھنا چاہتا تھا— اب جو کچھ اس کوٹھی میں ہوا، بھلا اس سے برا کیا ہوسکتا ہے—؟

لیکن نادرہ نے جیسے میری بات سنی ہی نہیں— وہ دوبارہ خلاء میں دیکھ رہی تھی—

'میں جھوٹ نہیں بول رہی— میں آنے والے سچ کی آہٹ پڑھ لیتی ہوں رحمٰن...... اور میرا یقین کرو— جو ہونے والا ہے، یعنی جو مستقبل میں پیش آنے والا ہے، اس کے سامنے، یہ واقعات کچھ بھی نہیں— کچھ ایسا کہ تمہارے لیے یقین کرنا مشکل ہوجائے مگر وعدہ کرو— ہر حال میں اگر نگار...... میری نگار زندہ رہے تو اس کی مدد کرو گے......

'ہاں نادرہ......'

'کرو گے نا......؟'

'ہاں نادرہ......'

بس اب میں مطمئن ہوں—اب میں آرام سے مرسکوں گی......'

اور یہی لمحہ تھا، جب نادرہ کے بستر پر بیٹھتے ہی نگار نے رونا شروع کر دیا تھا—

نادرہ نے پلٹ کر دیکھا......

نگار کا سارا جسم کانپ رہا تھا......اس پر دوبارہ دورہ پڑ چکا تھا—

نادرہ ایک بار پھر سے بت میں تبدیل ہو چکی تھی—

بانو بھاگتی ہوئی آئی—اس نے نگار کو گود میں اٹھا لیا—اچانک چونک کر میری طرف دیکھا—ایک لمحے کے لیے اس کی آنکھوں میں حیرت کے قمقمے روشنے ہوئے، پھر وہ نگار میں مصروف ہوگئی......

ائے......لے......لے......لے......

میری بیٹی......

نہ......نہ......مت رو بیٹی......میری جان......میری گڑیا......

اے......ای......لے......لے......نا......نا......

نگار مسلسل روئے جا رہی تھی—

نادرہ نے آنکھیں بند کر لیں—وہ دوبارہ بستر پر دراز ہوگئی تھی—

اے......ای......لے لے......میری گڑیا......میری جان......

بانو نگار کو چپ کرانے میں لگی تھی......

میں کچھ دیر کے لیے دوبارہ اس کہانی میں گم تھا، جسے ایک مدت بعد نادرہ نے دوبارہ جگا دیا تھا......

نگار چیخ چیخ کر روئے جا رہی تھی......

نادرہ کے الفاظ میرے کان میں چنگھاڑ رہے تھے— کچھ بہت برا ہونے والا ہے رحمٰن......اور یقیناً اسے صرف تم ہی سنبھال سکتے ہو......

(۴)

ایک کھلے سماج کے لیے سب سے بڑی گارنٹی یہ ہے، جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ہم اس سماج کے نظریے سے اتفاق نہیں کرتے—

●●

ایک آزاد نظریہ کی وکالت اس ٹی پارٹی سے مختلف ہے، جہاں سب ایک دوسرے کی ہاں میں ہاں ملائے جاتے ہیں—'

●●

"ایک بیحد کھلی کائنات کی آزادی کے لیے ضروری ہے کہ ہم فنون لطیفہ کو بھی آزاد ہوا میں سانس لینے کا موقع دیں......

●●

رات کے گہرے سائے پھیل چکے تھے—

میں کمرے میں داخل ہوا تو رقیہ شان کو پڑھانے میں مصروف تھی— مجھے دیکھ کر ایک بیحد حسین سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر طلوع ہوئی......

آ گئے آپ......

شان دوڑتا ہوا میرے قدموں سے آ کر لپٹ گیا—

'آپ جانتے ہیں اسے پڑھانے کے لیے کتنی منتیں کرنی پڑتی ہیں مجھے......' وہ ہنس رہی تھی— چائے پئیں گے یا کھانا نکالوں؟

'ابھی کچھ دیر بعد میں نے مسکرانے کی کوشش کی—

رقیہ میری آنکھوں میں جھانک رہی تھی— پریشان لگ رہے ہیں آپ؟ وہاں سے لوٹ کر زیادہ پریشان نظر آتے ہیں— نور بھائی صاحب کے یہاں گئے تھے نا......؟

ہاں......

نادرہ کیسی ہے......

میری خاموشی کو اس نے جواب سمجھ لیا تھا......

'نگار......؟ آپ سمجھاتے کیوں نہیں۔ وہ جو کچھ کر رہے ہیں کریں......مگر ڈاکٹر اور دوا بھی ضروری ہے......'

میں نے بہت سمجھانے کی کوشش کی......' میرے لہجے میں اداسی تھی......

'سمجھ سکتی ہوں......تقدیر— تقدیر کو مانتے ہیں آپ؟ ایک بار پھر رقیہ مسکراتی آنکھوں سے میری آنکھوں میں جھانک رہی تھی—'

ہاں......

تو سب تقدیر پر چھوڑ دیجئے— تقدیر کو اپنے کھیل کھیلنے دیجئے— اور مجھے لگتا ہے، سب ٹھیک ہو جائے گا......

لیکن تم اتنے وثوق سے کیسے کہہ سکتی ہو؟

رقیہ میرے بیحد قریب آ گئی تھی— اس کی دونوں آنکھیں کسی دیئے کی طرح اس وقت روشن تھیں...... کیونکہ اس خاندان سے آپ بھی وابستہ ہیں اور جہاں آپ ہوں، وہاں تقدیر کے ستم زیادہ دنوں تک نہیں رہیں گے...... چلیے— شان کو سلا کر آتی ہوں— آپ بے وجہ پریشان نہ ہوئیے......آج ہم دیر تک باتیں کریں گے......

وہ مسکراتی ہوئی، شان کا ہاتھ تھامے آگے بڑھ گئی—

رقیہ اور نادرہ— آنکھوں کے پردے پر دونوں کی تصویریں گڈمڈ ہو رہی تھیں—

●●

شان سو گیا تھا—

کھانے کے بعد ہم بستر پر آ گئے— رقیہ آہستہ آہستہ میرے بالوں میں انگلیاں پھیر رہی تھی—

’تم پریشان رہتے ہوتو سب سے زیادہ میں ٹوٹتی ہوں— اسی لیے آج تقدیر کی بات کی— کیونکہ جانتی ہوں— تم تقدیر کو مانتے ہو—ایک بات اور جانتی ہوں، جو تم نے کبھی بتائی نہیں......

کیا......؟ میں چونک گیا تھا......

نہیں بتاتی......وہ معنی خیز انداز میں مسکرائی۔

’تم لوگ ایسا کیوں سمجھتے ہو کہ ساری بیویاں ایک جیسی ہوتی ہیں— کمزور، بزدل اور ہر بات کو غلط سمجھنے والی......

مسکراتے ہوئے اس کے ہونٹ اچانک میرے ہونٹ پر آگئے...... وہ مجھ پر جھکی ہوئی والہانہ انداز سے میری طرف دیکھ رہی تھی......

’اور شاید اسی لیے تقدیر کو میں بھی مانتی ہوں—اور تم بھی مانتے ہو......‘

وہ کھلکھلا کر ہنسی......

میں ایک دم سے چونک گیا تھا......

یہاں تقدیر کہاں سے آگئی......؟

آگئی نا......، وہ ہنس رہی تھی......اسی راستے سے، جہاں سے تم آئے......تقدیر نہ ہوتی تو تم اس راستے سے میرے پاس کہاں آنے والے تھے......

اس کی متوالی ہنسی میں، ہزاروں گھنگھروؤں کی کھن کھن شامل تھی...... میرے اندر کا چور الجھن میں تھا—

رقیہ کی باتیں سمجھ میں نہیں آرہی تھیں— میں بغور اس کے چہرے کو پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا—

آج تم پہیلیاں بجھا رہی ہو......جان......‘

’جان......‘ اس کی آنکھیں بند تھیں...... جان...... ذرا پھر سے اس لفظ کو دہرانا......

جان......تم نے ان سناٹوں میں اپنے اس لفظ کے خمار سے آگ لگا دی ہے— جان...... کہاں چھپا کر رکھا تھا یہ لفظ......

وہ میرے جسم پر بچھ گئی تھی......اس کے لب کانپ رہے تھے......

'دیکھو......سب کچھ جانتے ہوئے بھی، کبھی بھی تم سے کچھ جاننے کی کوشش نہیں کی— جانتے ہو کیوں؟ اس لیے کہ پورے پورے میرے تھے تم......اور پھر تم نے اپنا عکس بھی مجھے تحفہ میں دے دیا......شان...... جب تم نہیں ہوتے تو میں گھنٹوں شان سے کھیلتی ہوں...... تمہیں محسوس کرتی ہوں......'

اندر پھر سے ایک چھناکا ہوا تھا......

آنکھوں کے پردے پر نادرہ کا عکس ابھرا تھا— 'اس دن تم شان کے ساتھ آئے تھے۔ کاش تم میری خوشیاں دیکھ سکتے......'

'کیا سوچ رہے ہو...... کسی اور نے بھی ایسا کچھ کہا کیا؟' وہ شرارت سے مسکرائی تو جسم میں اندر تک آگ بھر گئی—

ایک بات پوچھوں......

ہو......نہہ......

برا تو نہیں مانو گے......؟

نہیں......

سچ بتاؤ گے......

ہاں......

'تو پھر سچ بتانا...... جھوٹ بالکل نہیں...... کتنا پیار کرتے ہو نادرہ سے؟

'نا......نادرہ سے؟'

میں سناٹے میں تیر رہا تھا—

’جھوٹ مت بولنا— ویسے بھی تمہیں جھوٹ بولنا آتا کہاں ہے۔عورت مرد کی انگلیاں تھامتے ہی اس کے احساس کی جھاڑیوں میں بھی پہنچ جاتی ہے...... کنٹیلی جھاڑیوں میں...... پیار کرتے تھے نا......؟ اب بھی کرتے ہو......؟ تو کرونا......منع کس نے کیا ہے......

وہ زور سے ہنسی......مگر واپس آؤ تو میرے حصے کا پیار لے کر آیا کرو......میرا پیار باہر کے آنگن میں مت تقسیم کرنا......سمجھے تم......؟

اس نے سینے پر سر رکھ دیا— پہلے ہی دن سے سب کچھ جانتی تھی۔مگر کبھی برا نہیں مانا— تقدیر— اس کو مانتی ہوں میں— اور تقدیر سے بھی کہیں زیادہ تم کو— اس لیے کبھی برا نہیں لگا— وہ مسکرا رہی تھی— اسے یوں بھی کہہ سکتے ہو کہ تمہاری بیوی ہوں......تمہاری بیوی کی ذہنیت چھوٹی نہیں اور دل بہت بڑا ہے— یہ بھی یقین ہے کہ بہت سی نادرائیں آجائیں تب بھی تم میرے ہی رہو گے......

●●

رقیہ سوچکی ہے......

باہر بھونکنے والے کتّے اب خاموش ہیں— رقیہ کے معصوم چہرے کو میری آنکھیں مسلسل دیکھے جا رہی ہیں—

کیا میں اس معصوم سی گڑیا کے ساتھ چھل کر رہا ہوں......

بے وفائی؟

کیا مجھے ایسا کرنے کا حق حاصل ہے؟

اچانک ہونٹوں پر نادرہ کے گرم ہونٹوں کا ذائقہ ابھرتا ہے......’دیکھنے دو......کوئی زلزلہ نہیں آجائے گا......تم نے چھینا کیوں نہیں مجھے؟

میں کھڑکی کے پاس آگیا ہوں—

روشن جھلملتارے بادلوں کی آغوش میں چلے گئے ہیں......

نادرہ کی آواز میرا راستہ روک لیتی ہے۔ وعدہ کرو...... ہر حال میں میری بیٹی کی مدد کرو گے...... وعدہ کرو رحمٰن......'

بادلوں کی آغوش سے ستارے دوبارہ واپس آ گئے ہیں......

میں اندھیری سلطنت میں گم ہونے کی تیاری کر رہا ہوں......

'پروفیسر نیلے...... مجھے آپ کی ضرورت ہے......'

حصہ چہارم

جبلّت

یہاں سب کچھ
بے حد سنگین ہے
اور موت
دبے پاؤں ہمارا پیچھا کر رہی ہے۔

●●

جنگ ہر بار /
ایک اپاھج معاشرہ کو جنم دیتی ہے

دھماکہ ہونے والا ہے
لیکن یہ نئی تہذیب کا دھماکہ ہے

(۱)

سامنے ہری ہری گھاس پر پلاسٹک کی رنگین کرسیاں بچھی تھیں—— پروفیسر نیلے صبح کی چائے پیتے ہوئے اداس تھے——امریکہ سے ان کے بیٹے اور بہو چھٹیاں منانے آئے تھے——اور یہ دن چھٹیوں میں ہی گزر گئے—— بیٹے بہو آئے بھی اور چلے بھی گئے لیکن پروفیسر نیلے کو اس بات کا غم ستاتا رہا کہ بچوں کے پاس ان کے لیے وقت ہی نہیں تھا—— وہ سارا سارا دن کار لے کر گھومتے رہے اور جب رات کو واپس آتے تو تھکان ان پر مسلط ہو جاتی اور وہ سونے چلے جاتے—— لیکن یہ چند دن محض ان کی موجودگی کے احساس نے اس گھر کو گلزار کر دیا تھا—— ہاں ان کی بیوی کے چہرے پر بیٹوں کے جانے کا صدمہ باقی رہ گیا تھا——اور پروفیسر نیلے اس صدمے کو دور کرنے کے لیے بہانے تلاش کرتے رہتے تھے......

'ارے تمہیں یاد ہے پچھلی بار ہم مہا کالی مندر کے پاس والی پہاڑی پر گئے تھے—— وہاں ایک ڈھابہ تھا......

ہاں ......لیکن یہ تو دو برس پہلے کی بات ہے......

'کتنی حسین پہاڑیاں تھیں—— بالکل پگوڈا کی طرح......ہم نے آڑو اور خوبانیاں بھی چکھی تھیں۔ چلغوزے اور اخروٹ کے بھی مزے لیے تھے۔ میں نے اس سے زیادہ رسیلے آڑو اس سے پہلے کبھی نہیں چکھے ...... اور پھر یاد ہے وہاں دور تک لال لال چیری کے درخت—— پہاڑی ڈھلانوں پر سیبوں کے باغات......تم تو کچھ بھی یاد نہیں رکھتی......

اب ان باتوں کو یاد کرنے سے فائدہ......

فائدہ کیوں نہیں—— سوچتے ہیں دوبارہ وہاں جانے کو—— تم کالی کے درشن کر لینا اور میں چیری، چلغوزوں کے مزے لوں گا......'

'اب رہنے بھی دیجئے......'

پروفیسر نیلے ٹھہا کا لگا کر ہنسے......'ویسے آپ کے گالوں کی سرخی آج بھی لال لال چیری

کے پھلوں سے کم نہیں— کیا کروں— اس عمر میں خود کو دہرانا اچھا لگتا ہے۔ گزری یادوں کی کہانیاں مجھے پسند ہیں اور مزہ یہ، کہ انہیں جب جی چاہے، زندہ کرلیتا ہوں...... تمہیں یاد ہے......؟ تمہیں کیا یاد ہوگا۔ تم سب بھول جاتی ہو— اب دیکھو نا، گلوبل وارمنگ بھلا ان پہاڑوں کا کیا بگاڑ سکے گی— مجھے تو نہیں لگتا— ہاں موسم بدل رہے ہیں...... یاد ہے، پچھلی بار ہم ستلج کی گھاٹیوں سے ہوتے ہوئے گزرے تھے۔ بجلی کے بڑے بڑے کھمبے— دور تک پھیلے ننگے تار...... پہاڑوں میں سرنگیں کھودی جارہی تھیں......وہیں فادر ملے تھے— فادر اسمتھ— اداس......ان کے لہجے میں بھی اداسی کا رنگ شامل تھا— سرکاری منصوبوں پر کام چل رہا ہے— یہ پہاڑی ڈھلانیں، ندی کی سرنگوں کے لیے کھودی گئی ہیں— یہاں کی زمین اکثر زلزلے کی طرح کانپتی رہتی ہے— کم بخت انسانوں نے پہاڑوں کو بھی نہیں چھوڑا—

میں جس وقت وہاں پہنچا، میز پر چائے کے خالی کپ رکھے تھے—

پروفیسر نیلے بیحد تپاک سے ملے— میں نے اُنہیں خوشخبری سنائی کہ سارہ دوبارہ واپس آ گئی ہے—

’تب تو یقیناً آپ کا گھر گلزار ہوگا......‘

’جی ہاں......‘

’جیسے میرے یہاں میرے بچے واپس چلے گئے......آپ یہاں اُداسی کے نغمے سن سکتے ہیں......‘

پروفیسر نیلے نے مسکرانے کی کوشش کی— ’یہ زندگی بھی عجیب ہے کاردار صاحب— ساری عمر ہم بچوں کے لیے جیتے ہیں۔ پھر ایک عمر آتی ہے جب بچوں کے دیدار کو ترس جاتے ہیں......‘

’کیونکہ بچے آہستہ آہستہ اپنی عمر کے رتھ پر سوار ہو جاتے ہیں۔ نئی جستجو......نئی منزلیں......‘

’اور ہمارے لیے ان کے پاس وقت ہی نہیں ہوتا......‘

مسز نیلے چائے لے کر آ گئی تھیں— کچھ دیر تک ہم خاموشی سے چائے پیتے رہے۔ مسز نیلے سونے کا بہانہ کر کے اپنے کمرے میں لوٹ گئیں......اور یہی وہ وقت تھا جب میں پروفیسر نیلے سے اپنی ذاتی زندگی کے بکھرے ہوئے صفحوں کو شیئر کرنا چاہتا تھا—

وہ غور سے میری باتیں سن رہے تھے۔ کئی بار ان کے چہرے پر ایک بالکل ہی نئی چمک کا احساس ہوا، لیکن وہ جذبات چھپانے میں ماہر تھے— یا پھر اس عمر میں یہ ایک عام بات ہو جاتی ہے—

'آؤ— پہاڑیوں کا لطف اٹھاتے ہیں—'

انہوں نے آہستہ سے کہا۔ شاید میں بھی یہی چاہتا تھا۔

مین گیٹ سے ہم باہر نکل آئے— آہستہ آہستہ ٹہلتے ہوئے ہم کافی دور نکل آئے—

وہ آہستہ سے بولے...... مجھے اس ننھی سی جان سے ہمدردی ہے— بس ہمدردی— ہونٹ چباتے ہوئے انہوں نے اشارہ کیا— وہاں بیٹھتے ہیں—

ہم ایک پہاڑی ٹیلے پر بیٹھ گئے—

وہ اب بھی کسی سوچ میں گم تھے—

'میں بچپن سے آزاد تھا کا ردار— اس لیے ایک کھلی دنیا اور کھلی کائنات کے خواب ہی دیکھتا تھا— اس خواب میں مذہب کہیں دور دور تک شامل نہیں تھا— مجھے لگتا تھا، انسانوں نے خود ہی مذہب کو اپنی اخلاقیات کے لیے مسلط کر لیا ہے......کوئی شے مطلق نہیں— جیسے انسان کے لیے کوئی اخلاقیات— آئن اسٹائن نے زمان و مکان کے مطلق ہونے کے نظریے کو تسلیم نہیں کیا— اور فرائیڈ کے جنسی نظریات نے اخلاقی بنیادوں کی حیثیت پر سوالیہ نشان لگا دیئے......'

پروفیسر نیلے نے پلٹ کر میری طرف دیکھا— جیسے ہم ایک وقت میں کئی لوگوں سے محبت کر سکتے ہیں اور اس لیے کہ ہم انسان ہیں— اور انسان کی سرشت میں اسکی آزادی کو دخل ہے۔

لیکن یہاں بھی ہم اخلاقیات کی چھوٹی چھوٹی شاخیں لے کر آ جاتے ہیں—— خاندان، معاشرہ، سماج، تہذیب......اور مذہب—— ہم بہت کچھ چاہتے ہیں......شاید سکون سے جنسی سکون اور جبلّت تک......شاید کسی کسی لمحہ ہم پوری طرح جانور بن جانا چاہتے ہیں......لیکن مہذب ہوتے ہوئے وہی اخلاقیات یہاں بھی ہمارے آڑے آ جاتی ہے—— ہم آج کی نئی اخلاقیات میں تہذیب کے کھلے پن کو دیکھ رہے ہیں اور وہاں یوروپی مما لک میں عام ذہن اس کھلے پن سے اتنا گھبرا چکا ہے کہ وہ یوگ، سادھنا، عبادت اور آشرم میں پناہ لے رہا ہے......اور اسی اخلاقیات کا دوسرا سلسلہ بازار سے جڑا ہے—— اب یہاں کے سادھو، سنت اور آشرم کے قصے دیکھو—— کتنے ہی آشرم ہیں جہاں سیکس ریکٹ چلائے جا رہے ہیں۔ ہندستان اس مہذب ہوتی صدی میں ساری دنیا کے لیے سیکس کا ایک بڑا بازار بنتا جا رہا ہے—— اور وہاں......غیر ملکی کھلے پن سے گھبرا کر اب انہی آشرموں میں پناہ لے رہے ہیں۔ ایک ہی زندگی میں کتنے تضاد ہیں کاردار...... ہر دوسرے قدم پر انسانی اخلاقیات ایک نیا تماشہ دیکھنے پر مجبور ہے۔ لیکن ہم اپنے اصولوں میں، مذہب کے آدرش میں محض اعلیٰ انسان ہونے کا ڈھونگ کیے جا رہے ہیں......دیکھو کاردار......'

پروفیسر نیلے مسکرائے......

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہہ شیشہ گری کا......

خوب......کیا خوب شعر ہے—— ذرا اس شعر کے پردے میں تو جھانکو......اس عالم آب و گل کو ایک چھوٹے سے کانچ کے باریک شیشے کا محل یا قید خانہ سمجھ لو—— یہی کانچ کا باریک شیشہ ہماری دنیا ہے—— ہماری تمہاری یہ مہذب دنیا، اور اسی شیشے کی باریک دنیا میں ہم اپنے جینے کا جتن کیے جا رہے ہیں—— لیکن یہ شیشہ اتنا نازک، اسقدر باریک ہے کہ ہماری سانسوں سے بھی اس کے ٹوٹنے کا خطرہ پیدا ہو جاتا ہے...... ہر سانس ایک نئی عبارت خلق کر رہی ہے...... ہر سانس ایک نئی دنیا بن رہی ہے—— اور یقیناً پریشان ہوں گے وہ لوگ، جو اب تک اپنی پرانی دنیاؤں سے چپکے ہوئے

ہیں— کاردار ہم تم جتنے بھی فلسفے اور نظریات قائم کریں یا جس نظریہ سے بھی دنیا کو دیکھنے کی کوشش کریں، مگر بھول جاتے ہیں کہ کوئی ہمیں دیکھ رہا ہے......کوئی اپنے حساب سے انسانی Destiny کی عبارت لکھ رہا ہے......کون......؟ قدرت......؟

پروفیسر نیلے ہنس رہے تھے— تمہاری کہانی بھی تم نے کہاں لکھی کاردار— ' قدرت نے لکھی ہے— اور قدرت جس قدر حسین ہے، اتنی ہی سفاک بھی— وہ تمہیں پتہ بھی نہیں چلنے دیتی، اور تمہاری زندگی کے سفر کو موڑ دیتی ہے—

انہوں نے میری طرف دیکھا......

'تو تم نے نگار کی ذمہ داری لی......؟ تمہارا چہرہ بتا رہا ہے......نہیں......لیکن تم ان لمحوں کے گواہ بن کر افسوس تو کر ہی سکتے ہو......

'میں ذمہ داری اٹھانے کے قابل نہیں تھا......'

ہوا تیز ہوگئی تھی— میں تیزی سے ٹیلے سے اٹھا— اور جھکی ہوئی شاخ سے ایک سبز پتہ توڑ لیا—

''ہم سوچتے کچھ ہیں اور ہوتا کچھ ہے— اور آپ نے صحیح کہا— قدرت کا انتقام جاری رہتا ہے— میں عمر کے اس پڑاؤ پر کھڑا تھا، جہاں رقیہ کے لیے میرے اندر ایک Guilt جاگ رہا تھا—

'جانتا ہوں......'

'نادرہ میرے بچپن کی محبت تھی— اور شاید اسے بھول پانا میرے لیے ممکن بھی نہیں تھا۔ مگر......وہ گم ہو رہی تھی— اس دن شاید اتنی بہت سی باتیں کرنے کے لیے ہی وہ ٹھیک ہوئی تھی— اس کے بعد پھر کبھی میں نے اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نہیں دیکھی— اور شاید رقیہ مجھ سے زیادہ میرے اس احساس سے واقف تھی کہ میں کہیں بھی جاؤں، لوٹ کر تو اسی کے پاس آنا ہے......

'ہونہہ......'

پھر دیکھتے ہی دیکھتے سات سال گزر گئے — ماشاء اللہ میرا بیٹا شان بارہ سال کا ہو چکا تھا — اور ادھر ہوا کے سرد و گرم سہتی ہوئی نگار نے کسی طرح زندگی کے سات سال نکال لیے تھے — سات بے رحم سال...... اس پر ٹھہر ٹھہر کر اب بھی دورے پڑتے تھے۔ ہاں اس درمیان نور محمد نے میری بات مان کر ڈاکٹر سے علاج بھی جاری رکھا تھا — اس علاج کا فائدہ یہ ہوا کہ دوروں میں کمی آ گئی تھی — مگر وہ ایک دماغی مریضہ تھی — اور سب سے عجیب بات کہ ذہنی معذور ہوتے ہوئے بھی اس کا قد سرو کی طرح لمبا ہوا جا رہا تھا — وہ چہرے مہرے سے نادرہ کی طرح ہی خوبصورت لگتی تھی — اگر آپ اسے کہیں بیٹھے ہوئے دیکھ لیں تو یقین کرنا مشکل ہوتا تھا کہ یہ خوبصورت سی، پیاری سی بچی دماغی طور پر معذور بھی ہو سکتی ہے — مگر اس حقیقت سے آنکھیں چرانا ناممکن تھا — نور محمد نے بہت کوشش کی کہ نگار تھوڑا بہت پڑھنا سیکھ لے، لیکن نگار کے لیے یہ ممکن بھی نہیں تھا۔ دو چار بار ایسا ہوا جب اس نے تمام کتابیں، کاپیاں بے دردی سے پھاڑ ڈالیں اور روتے روتے سارا گھر سر پر اٹھا لیا — پھر نور محمد نے اسے کتابوں سے دور ہی رکھا — وہ ہر حال میں ان دونوں کی زندگی چاہتا تھا۔ اس کے لیے پڑھائی سے زیادہ ضروری نگار کی زندگی تھی —

سات سال کی عمر تک نگار کو نہلانا، دھلانا، یہاں تک کہ اس کے کپڑے تک تبدیل کرنا اس کا روز کا معمول بن چکا تھا — ہاں جب دورے پڑتے تھے، تو اسکا خیال بانو رکھتی تھی۔ اس طرح بانو بھی اس گھر کی ایک ضروری فرد بن گئی تھی — ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ نگار صرف تین لوگوں کو پہچانتی تھی۔ نادرہ، بانو اور نور محمد — کسی چوتھے کی طرف نہ وہ آنکھ اٹھا کر دیکھتی — اور نہ ہی اس کا اپنی طرف دیکھنا پسند کرتی — سات سال کی عمر تک اسے بولنا بھی نہیں آیا تھا — وہ آدھے ادھورے جملے بھی بمشکل ادا کرتی تھی...... جیسے اماں اور ابا...... یہ دو لفظ وہ سیکھ گئی تھی — بانو نے اپنا نام لینا بھی اسے سکھا دیا تھا — اور سب سے بری بات، اب اس میں ضد کرنے کی قوت زور پکڑتی جا رہی تھی — میں اس سلسلے میں ڈاکٹر ابھیتوش سے ملا تھا — میرا دل یہ قطعی طور پر ماننے کو تیار نہیں تھا کہ جو بچی دماغ سے معذور ہو وہ ضد کیسے کر سکتی ہے — کیونکہ ضد کرنا یا اپنی بات منوانا، یہ فعل بھی تو سیدھے

دماغ سے جڑا ہے— میری بات پر ڈاکٹر ابھیتوش زور زور سے ہنسے تھے—

'ایسی بچیوں میں لاشعوری طور پر ایک ضد آ جاتی ہے— کیونکہ ایسے بچے کسی چیز کو ٹارگٹ کرتے ہیں— مثال کے لیے کوئی کھلونا...... وہ اس سے گھنٹوں کھیلیں گے— مثال کے لیے...... اگر ضد سما جائے کہ اُنہیں چادر پر ہی پیشاب کرنا ہے تو وہ اسے گیلا کر کے چھوڑیں گے— اور ایک نہیں کئی بار—'

پروفیسر نیلے غور سے میرا چہرہ پڑھنے کی کوشش کر رہے تھے......

'جیسے اگر کسی مقام پر وہ بیٹھی ہے تو وہ وہاں گھنٹوں بیٹھی رہے گی— ہوا میں بال لہرا ہی ہے تو یہ عمل بھی گھنٹوں چلے گا— چہرہ پر ذرا بھی ریکشن نہیں— جذبات یا احساس کا کوئی بھی رنگ شامل نہیں— اس کا جسم عام انسانوں کی طرح کھنچا ہوا نہیں ہے— اس میں ایک لوچ ہے— جھکاؤ ہے— سر عام سات سال کے بچے سے چھوٹا سر— کپڑوں کا بھی کوئی ہوش نہیں رہتا......

میں نے گہری سانس لی— لیکن نور محمد کی تعریف کرنی ہوگی۔ اس نے جیسے اس بیمار نظام کے لیے خود کو وقف کر دیا— اور وہ نہیں جانتا کہ آنے والے وقت میں اور کیا مصیبتیں سامنے آ سکتی ہیں— وہ شاید محبت نبھا رہا تھا یا اپنی انسانی ذمہ داریاں ادا کر رہا تھا— وہ سب سے کٹ گیا ہے— پہلے بھی محلے والے خوف کے مارے کوٹھی جانے سے گھبراتے تھے— اور اب سب طرف اس کی پاگل بیٹی نگار کا ہی تذکرہ تھا— کئی بار احساس ہوا، نگار اور نادرہ کے وجود سے خود بخود ایک تیسرے وجود کا جنم ہوا— یعنی نور محمد کا— اور شاید اس میں بھی قدرت کو دخل ہے کہ وہ ہر طرح کے نظام میں آپ کو فٹ ہونے کا پورا موقع میسر کراتا ہے— مجھے یاد ہے، تب گھر میں نگار کو لے کر چھوٹی چھوٹی باتوں پر نور محمد خوش ہو جایا کرتا تھا......

جیسے بانو اسے بتایا کرتی...... آج وہ ہنسی تھی......

ارے نہیں—

سچ میں، آج نگار کھلکھلا کر ہنسی تھی......

نا......

میں کہہ رہی ہوں نا......آپا بھی وہیں پر تھیں......کیوں آپا......؟ بانو، نادرہ سے پوچھتی تو اسکی کھوئی کھوئی آنکھیں ایک ٹک چھت کو گھور رہی ہوتیں—

'اچھا میرے سامنے اسے ہنسانے کی کوشش کرو......'

'ایسے کہاں ہنسے گی......لیکن وہ آج ہنسی تھی......اور کتّی پیاری لگ رہی تھی......جیسے اس دن— بانو نے نور محمد کو بتایا......

'آج نگار نے کہا......بانو کھانا دو......'

یہ پورا جملہ......؟

ہاں، نہیں مان سکتا......

وہ بولی تھی......بانو کھانا دو......

لیکن کبھی میرے سامنے تو نہیں بولی۔

'آپ کے سامنے نہیں بولی— لیکن میرے سامنے تو بولی— آپ دن بھر رہتے کہاں ہیں۔ میری نہیں مانتے تو آپا سے پوچھ لیجئے—'

'آپ کی آپا اب مجھ سے ناراض رہتی ہیں۔ بات ہی نہیں کرتی......'

بس نور محمد کو ایک ہی بات سے ڈر لگتا تھا— نگار کے رونے سے— جس میں کمی تو آئی تھی لیکن یہ دورہ اکثر و بیشتر نگار کو جسمانی طور پر بھی کمزور کر دیتا— رونا شروع ہوتا تو بند ہونے کا نام نہیں لیتا— لیکن یہ بانو کا ہی کرشمہ تھا کہ اس نے نگار کے ان حملوں کو بھی محبت کے ساتھ برداشت کر لیا تھا—

نادرہ اب بیحد کمزور ہو گئی تھی— جسم سوکھ کر کانٹا بن چکا تھا— اس کی جسمانی خوبصورتی گم تھی اور وہ محض ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گئی تھی۔ مجھے شدت سے اس بات کا احساس تھا کہ اب زیادہ دن تک وہ زندگی کے منہ نہیں دیکھ سکے گی— میں جیسے تیسے اس سے ملنے کمرے میں تو آجاتا، مگر

زیادہ دیر تک مجھے اپنے آنسو چھپانے میں دشواری پیش آتی — میں کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر کمرے سے نکل جاتا……

'اس دن……'

کہتے کہتے میں رک گیا تھا — بمشکل اپنے آنسوؤں کو روکنے کی کوشش کی — نور محمد نے بانو کو گھر بھیجا تھا — بانو خبر کرنے آئی تھی کہ آپا کی طبیعت اچانک بہت خراب ہوگئی ہے — آپ گھر چلیے ……

دروازے کے باہر نگار دیوار سے ٹیک لگائے ایک گڈے سے کھیل رہی تھی — نور محمد گھبرائی ہوئی حالت میں ٹہل رہا تھا……

'نادرہ بیہوش ہے……اب کیا ہوگا……بھیّا —

'کچھ نہیں ہوگا……'

'کچھ بولتی ہی نہیں نادرہ…… بیہوش ہے……اسے کہئے نا — مجھ سے باتیں کرے — آپ کی تو سب باتیں سنتی ہے……

میں کمرے میں آیا — قدم ساکت — آنکھیں پتھرا گئی تھیں۔ سامنے بستر پر بے جان لاش کی طرح نادرہ پڑی تھی…… میرا سارا جسم کانپ رہا تھا — میرے ہونٹ لرز رہے تھے — آنکھوں سے آنسو رواں تھے……

'یہ کیا بدتمیزی ہے نادرہ — آنکھیں کھولو — ' میں زور سے چیخا — آنکھیں کیوں نہیں کھولتی تم……

بانو سجدے میں گری ہوئی تھی……

میں نے کانپتے ہاتھوں سے نبض دیکھی……نبض بہت ٹھہر ٹھہر کر چل رہی تھی…… میں آنسوؤں کو سنبھالتے ہوئے نور محمد کی طرف مڑا —

'تم نے ڈاکٹر کو خبر کی؟'

’نہیں بھیا......‘

میں زور سے چیخا— ’مجھے خبر کرنے سے زیادہ ضروری تھا کہ تم ڈاکٹر کو بلاتے— میں ڈاکٹر کو لے کر آتا ہوں......‘

میں دوبارہ نادرہ پر جھک گیا— میرے ہونٹ کانپ رہے تھے...... دیکھو نادرہ۔ میں ڈاکٹر کے پاس جارہا ہوں— مگر خبردار......زیادہ ہشیاری مت دکھانا......ہمیں چھوڑ کر اتنی جلد جانے کی ضرورت نہیں ہے—‘

میری آنکھوں سے آنسو رواں تھے......قدم بوجھل—اور پھر تیز قدموں سے میں ڈاکٹر کو لانے چل دیا تھا......

●●

میں کسی ایسی زندگی کا تصور نہیں کرسکتا تھا جہاں نادرہ نہ ہو—

کوئی ایسا لمحہ......جو نادرہ کے بغیر کا ہو—

وہ کہنے کو پرائی ہوچکی تھی مگر روحانی سطح پر میں اب بھی اس کے ساتھ تھا......اس لیے باہر نکلتے ہوئے میرے قدم شل تھے—

آنکھوں کے آگے اندھیرا پھیلتا جارہا تھا......

اور جب دوبارہ ڈاکٹر کو لے کر میں کوٹھی کے اندر داخل ہوا، کوٹھی کے اندر سے آنے والی ماتمی صداؤں نے میرا راستہ روک لیا—

دروازے کے باہر ہی سفیان ماموں گلہ پھاڑ کر چلاّ رہے تھے......

’میری پھول جیسی بیٹی کو آخر اس مردود نے مار ڈالا......اب کیا کروں میں......کہاں جاؤں......‘

محلے والے جمع ہونے لگے تھے—

نور محمد بستر پر ڈھیر ہو گیا تھا—

ممانی زار و قطار روئے جا رہی تھیں......

کمرے میں بستر پر نادرہ پڑی تھی— اس کے چہرے اور جسم پر سفید کپڑا ڈال دیا گیا تھا......

انا للہ وانا الیہ راجعون......

میری آنکھوں کے آگے کا اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا—

●●

(۲)

کمرے میں اگربتی کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی— چوکی، چادر اور باقی سامان ہٹا دیئے گئے تھے— لوبان جل رہا تھا— باہر کچھ عورتیں قرآن شریف کی زور زور سے تلاوت کر رہی تھیں— لاش زمین پر رکھ دی گئی تھی— چہرہ اور جسم ڈھک دیا گیا تھا— نگار اب بھی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی اپنے کھیل میں گم تھی—

محلے سے لوگوں کا آنا جانا شروع ہو گیا تھا— نور محمد آخری سفر کے انتظام کی تیاریوں میں مصروف تھا— سفیان ماموں کی حالت غیر تھی اور اُنہیں کمرے میں آرام کرنے کا مشورہ دیا گیا تھا— عورتیں غسل کی تیاری کر رہی تھیں— محلے کے کچھ بزرگوں کا ماننا تھا کہ لاش کو زیادہ دیر تک رکھنا مناسب نہیں— نور محمد سے گفتگو کرنے کے بعد، بعد نماز عشاء مٹی منزل کا وقت مقرر کر دیا گیا تھا—

سارا ماحول غمگین تھا— نور محمد بار بار اندر اور باہر کے لوگوں کی خبر لے رہا تھا— برآمدے میں چارپائیاں ڈال دی گئی تھیں— ایک قطار سے کرسیاں لگا دی گئی تھیں— نادرہ اور اس کی بیٹی کو لے کر کہانیاں بنانے والوں کی اس ماحول میں بھی کوئی کمی نہیں تھی......

میں ٹوٹ چکا تھا—

رقیہ کی آنکھوں میں آنسو تھے...... اتنے سارے لوگوں کے درمیان بھی وہ مجھے دلاسہ دینے کے لیے موجود تھی...... خود کو سنبھالیے...... میں جانتی ہوں، آپ پر کیا گزر رہی ہوگی— لیکن نور بھائی صاحب کو دیکھیے......

میں نے اسے یقین دلایا کہ میں بالکل ٹھیک ہوں— لیکن میں کہاں ٹھیک تھا— زندگی کی ریل چھک چھک کرتی ہوئی آنکھوں کے پردے پر ٹھہر گئی تھی—

یہاں نادرہ کا بچپن بھی تھا......

بلند حویلی کے تنہا گوشے میں اس کی یادوں کے ہر طاق روشن تھے...... آنکھ مچولی...... اس کا بھاگ کر میرے جسم میں سمٹ آنا— اور مرنے سے پہلے کا وہ جذباتی اقبالیہ بیان...... مجھے چھینا کیوں نہیں......

آنکھوں سے آنسو رواں ہیں......

لوگ نور محمد سے تعزیت کر رہے ہیں— نور محمد آسمان کی طرف اشارہ کر رہا ہے...... سب اللہ کی مرضی......

کوٹھی میں آج اتنے لوگوں کی موجودگی کے باوجود سناٹا بکھرا ہے— وحشت ناک سناٹا— آج تو جیسے سارا شہر امڈ آیا ہے...... عورتیں نادرہ کو آخری غسل دے رہی ہیں...... میں صرف خبریں سن رہا ہوں...... نور محمد مجھ سے آنکھیں چرا رہا ہے۔ یا میں نور محمد سے آنکھیں چرا رہا ہوں...... وہ پاس آیا تو میرے صبر کا باندھ بھی ٹوٹ جائے گا......

سفیان ماموں کی بڑبڑاہٹ جاری تھی...... سب میری غلطی— پاکستان سے لٹے لٹائے یہاں پہنچے۔ کیا معلوم تھا کہ ہندوستان نہیں، بیٹی کی قبر پر مٹی ڈالنے جا رہا ہوں...... یہ کوئی عمر تھی جانے کی...... رحمٰن— بتاؤ...... جانے کی تو میری عمر تھی— لیکن نادرہ چلی گئی— میری بیٹی چلی گئی......'

'سفیان ماموں...... ایسے تڑپیں گے تو نور محمد کا کیا ہوگا— اسے دیکھئے۔ کس طرح اس نے اپنے سینے پر پتھر رکھ لیا ہے— وہ آخری سفر کی تیاریاں کر رہا ہے، سب کام خود سے کر رہا ہے— نادرہ کی بیماری کے بہانے اس نے خود کو ہی ختم کر لیا......سفیان ماموں...... ہوش میں آیئے...... ابھی اس وقت نور محمد کو آپ سب کے ساتھ کی ضرورت ہے— حوصلہ کی ضرورت ہے— ذرا نگار کے بارے میں سوچئے— پہلے کم از کم نادرہ کی موجودگی کا احساس تو تھا— اور اب نادرہ کے بغیر...... ذرا سوچ کر دیکھئے سفیان ماموں...... وہ کیسے کرے گا— ننھی سی جان کو کیسے سنبھالے گا......کیسے زندگی گزارے گا...... یہ وقت اسے حوصلہ دینے کا ہے— غصہ اتارنے کا نہیں......نادرہ کے انتقال سے اب تک اس کے ایک آنسو نہیں ٹپکے ہیں— سفیان ماموں، اسے سنبھالیے— اللہ نے پہاڑ سا غم دیا ہے اسے—

میرے آنسو بہہ رہے تھے......

ممانی کی اندر کمرے سے چیخ چیخ کر رونے کی آوازیں آ رہی تھیں— اور اس آواز میں قرآن پاک کی آیتوں کی آواز بھی ابھر ابھر کر سامنے آ رہی تھی......

سفیان ماموں ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گئے۔ پھر دوسرے ہی لمحے وہ اٹھ کھڑے ہوئے— برآمدے کے دوسری طرف ستون سے ٹیک لگائے نور محمد کسی کو قبرستان بھیجنے کی تیاری کر رہا تھا......

●●

شام ہو گئی تھی— بتیاں جل گئی تھیں— احتیاط کے طور پر لالٹین اور لیمپ بھی روشن کر لیے گئے تھے......

سفیان ماموں آگے بڑھے۔ کانپتا ہاتھ نور محمد کے کندھے پر رکھا— اور پیار سے اسے سینے سے لگا لیا—

'میرا بیٹا......'

نور محمد کی سسکیاں گونج گئیں—

پیچھے میں کھڑا تھا—

نور محمد لرز رہا تھا— اس کا جسم شدید جذبات کی تاب نہ لا کر کانپ رہا تھا...... ہونٹ کنپکنپا کر رہ گئے—

'بھیا......نہیں معلوم......اب کیا کروں گا—

ہمت، میں نے آسمان کی طرف اشارہ کیا—

'ہمت رکھو بیٹے— تمہارا درد غیر معمولی ہے۔ ہم سمجھ سکتے ہیں— مگر نگار کے لیے— سفیان ماموں رو رہے تھے— بن ماں کی بچی ہے اب— معذور، اپاہج، تم ہی سہارا ہو......بس— جانے اوپر سے کتنی عمر لکھوا کر لائی ہے......'

'بس ابو......سب کچھ کہیے۔ یہ نہ کہیے......'

نور محمد کی آواز بھاری تھی— اور آواز کی یہ گونج سارے گھر نے سنی۔ وہ تیز تیز بول رہا تھا—

'وہ لمبی عمر جیے گی...... نادرہ سے میں نے وعدہ لیا ہے......جیسی بھی ہے میری بیٹی ہے۔ میں مرنے نہیں دوں گا اسے— وہ خیرات میں نہیں ملی ہے......اور دنیا میں کون بیمار نہیں ہوتا؟ آپ بیمار نہیں ہوئے؟ نادرہ بیمار نہیں تھی۔ نگار بھی بیمار ہے— اچھی ہو جائے گی......اس کے بارے میں، میں کوئی بری بات برداشت نہیں کروں گا......

اس کی تیوریاں چڑھ گئی تھیں۔ منہ سے جھاگ نکلنے لگی تھی— 'میں ہوں نا— اس کا باپ— باپ ہوتے کس دن کے لیے ہیں— میں سنبھالوں گا اپنی بچی کو— مگر— مرنے نہیں دوں گا ابو— وہ جو بھی کہے گی کروں گا— اس کی ہر بات مانوں گا— مگر مرنے نہیں دوں گا......'

ہم سکتے میں تھے۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے ایک بے بس اور لاچار باپ کا چہرہ دیکھ رہے تھے۔ وہ بچوں کی طرح بار بار ایک ہی بات دہرا رہا تھا......'وہ جو کچھ کہے گی کروں گا— اس کی ہر

بات مانوں گا، مگر مرنے نہیں دوں گا اسے......'

محلے والوں کو کچھ ہدایت دے کر نور محمد قبرستان کی طرف روانہ ہو گیا......سفیان ماموں دوبارہ کرسی پر بیٹھ گئے—

ذہن میں دھماکے گونج رہے تھے......

(تب احساس نہیں تھا، آنے والے کچھ ہی برسوں میں نور محمد کی یہی باتیں ایک ایسے ڈراؤنے منظر میں تبدیل ہو جائیں گی، جس کے بارے میں سوچتے ہوئے بھی سارے بدن میں کنکنپی طاری ہو جائے گی—اور حقیقت یہی ہے کہ وقت شاید اس سے بھی بے رحم اور بھیانک کہانی لکھنے کی تیاری کر رہا تھا......)

اور یہی وقت تھا جب اتنے سارے لوگوں کو اچانک دیکھ کر نگار ڈر گئی تھی اور اس نے خوف سے رونا اور چلاّنا شروع کر دیا تھا...... بانو اسے سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھی— مگر ننھی نگار کی چیخ تھمنے کا نام نہیں لے رہی تھی—

بانو نگار کو سنبھالنے کی کی کوشش کر رہی تھی......

میری گڑیا......میری جان......چپ ہو جا......

اسکے آنسو بہہ رہے تھے......

آج تو چپ ہو جا......تیری امی جا رہی ہیں......ہمیشہ کے لیے......چپ ہو جا......'

نگار مسلسل روئے جا رہی تھی......وہ نہ چھٹپٹا رہی تھی......نہ ہاتھ پاؤں چلا رہی تھی— بس ایک ہی سانس میں روئے جا رہی تھی—میت میں آئے ہوئے لوگوں کے لیے یہ منظر انوکھا تھا—نگار اور بانو کے آس پاس کچھ مرد اور عورتیں جمع ہونے لگے تھے۔ ان لوگوں کے لیے نگار کا اس طرح رونا کسی انوکھی بات سے کم نہیں تھا—اسی لیے بے خیالی میں مشورے بھی دیئے جا رہے تھے......

پانی پلاؤ......

شکر ڈال کر پلاؤ—

شہد چٹاؤ......

ارے کوئی اس طرح روتا ہے—

پھر بانو سے کوئی ایک سوال......آخر یہ کیسے چپ ہوگی؟

'ارے وہی لڑکی ہے نا، جو پگلی ہے......'

'اس کی ماں پر بھی جنات سوار تھا......'

'وہی جنات اس پر بھی سوار ہے......؟'

اور یہی وقت تھا جب ہٹو...... ہٹو......' کہتا ہوا نور محمد آگے بڑھا۔ وہ قبرستان سے لوٹ آیا تھا—لوگوں کی آنکھیں اس کی پیٹھ پر چبھ رہی تھیں— مگر وہ زمانے بھر سے بے نیاز بانو کی گود میں سمٹی، نگار کو دیکھ رہا تھا......ایک ہی سانس میں روتے ہوئے جس کا پورا چہرہ نیلا پڑ گیا تھا...... گلے سے رونے کی جگہ ڈراؤنی آوازیں باہر نکل رہی تھیں......

وہ زور سے چلّایا—

'یہ بھیڑ کس لیے ہے......ہٹیے ......ہٹیے آپ لوگ—تماشہ مت بنایئے......

بانو پریشان آنکھوں سے نور محمد کو دیکھ رہی تھی......

نور محمد نگار کے پاس آیا......اس کی آنکھوں میں اس وقت یقین اور طاقت دونوں کو ایک ساتھ محسوس کیا جاسکتا تھا......

نگار......چپ ہوجاؤ......

چپ ہوجاؤ......

نگار......تم نے سنا میں نے کیا کہا......چپ ہوجاؤ......

رات کا اندھیرا چاروں طرف پھیل چکا تھا—ابھی عشاء کی نماز میں دیر تھی— کچھ لوگ مغرب کی نماز کے بعد لوٹ آئے تھے—

لیکن نگار کا رونا کسی صورت میں کم نہیں ہو رہا تھا—

اور اچانک نور محمد نے محسوس کر لیا— نگار شاید اتنے سارے لوگوں کی بھیڑ کو دیکھ کر ڈر گئی ہے— کبھی گھر میں ایک ساتھ اس نے اتنے سارے لوگوں کو نہیں دیکھا— نور محمد کے چہرے کا رنگ اس درمیان کئی بار بدلا......ایک کے بعد دوسرا رنگ......اور اچانک اسے احساس ہوا کہ اگر یہ لوگ جمے رہے تو وہ نادرہ کے ساتھ نگار کو بھی کھو دے گا......وہ نگار کو کھونا نہیں چاہتا تھا......اس کا جسم لرز رہا تھا— وہ ایک ٹک نگار کے چہرے کو دیکھ رہا تھا— جیسے روتے روتے اس کی آواز گھٹ گئی ہو— سانسیں رک گئی ہوں— چہرہ پیلا پڑتا جا رہا تھا— اور اچانک وہ میت میں آئے ہوئے لوگوں کی طرف پلٹا اور تیز آواز میں چلّایا—

'جائیے— واپس اپنے گھروں میں جائیے آپ لوگ— سنا آپ لوگوں نے— اس گھر کو کسی کی ضرورت نہیں— خدا کے لیے واپس جائیے آپ لوگ— میت اٹھانے کے لیے صرف چار کاندھے کی ضرورت ہوتی ہے— وہ چار کاندھے ہیں ہمارے پاس......ہمیں کسی کی ضرورت نہیں ہے— میری بیٹی مر جائے گی— میں نادرہ کے بعد نگار کو کھونا نہیں چاہتا— جائیے......سنا آپ لوگوں نے......واپس جائیے......'

وہ بچوں کی طرح رو رہا تھا......

میں نے آہستہ سے اس کے کندھے پر اپنا کانپتا ہوا ہاتھ رکھا—

'میت میں آنے والوں کو اس طرح جانے کے لیے نہیں کہتے نور محمد......'

'یہ لوگ رہے تو میری بیٹی مر جائے گی......'

وہ اشارہ کر رہا تھا......اس کی سانسیں گھٹ رہی ہیں— 'بھیّا میری نگار کو بچا لیجئے—'

جس نے بھی نور محمد کی چیخ سنی، وہ اپنی جگہ سناٹے میں رہ گیا— آج تک میت میں آنے والوں کے ساتھ یہ سلوک نہیں کیا گیا— لوگ غصے میں پاؤں پٹکتے واپس جا رہے تھے......

'نور محمد......روکو انہیں—' میں آہستہ سے بولا......

'نہیں بھیّا— ان سے زیادہ مجھے نگار کی ضرورت ہے...... اب میرے پاس کیا ہے بھیّا— کچھ بھی نہیں بچا جینے کے لیے— صرف نگار— میں نگار کے لیے وہ سب کروں گا، جو کسی بھی باپ نے آج تک نہیں کیا ہو...... میں اس کی ہر بات مانوں گا بھیا...... لیکن......

●●

میرے لہجے کی برف پگھل رہی تھی— شاخوں سے ٹوٹ کر، لہراتے ہوئے پتّے زمین پر بکھر رہے تھے...... سامنے دور تک ننگے درختوں کی ایک نہ ختم ہونے والی قطار نظر آ رہی تھی...... دور پہاڑیوں پر بنے ہوئے مکانات ایسے لگ رہے تھے جیسے تاش کا محل کھڑا کیا گیا ہو...... سورج سر پر آ گیا تھا......

میں لمبی لمبی سانس لے رہا تھا......

پروفیسر نیلے غور سے میرے چہرے کا جائزہ لے رہے تھے......

'آہ، یہ زندگی بھی کتنی خوفناک ہے کاردار......'

انہوں نے اپنا کانپتا ہاتھ میرے کندھے پر رکھا— ماضی صرف پریشان کرنے کے لیے ہوتا ہے— ماضی کی ان سرنگوں میں اسی لیے جانے سے ہول آتا ہے مجھے— یادیں بدروحوں کی طرح گھیر لیتی ہیں—'

اُن کی آنکھوں میں چمک لہرائی تھی— پھر کیا ہوا......؟

'دیر رات تک ہم قبرستان سے واپس آئے...... نگار سو گئی تھی...... میں نادرہ کی یادوں سے خود کو باہر نکالنے کے لیے جدوجہد کر رہا تھا— مگر...... یادوں سے کب کوئی چھٹکارا حاصل کر سکا ہے جو میں کرتا......'

پروفیسر نے گردن ہلائی—

'مگراس دن کے بعد ایک اور بات ہوئی— نگار لوگوں کو دیکھ کر ڈر جاتی تھی— بانو، اور نور محمد کو چھوڑ کر وہ کسی بھی انسانی خوشبو سے واقف نہیں تھی۔ یہاں تک کہ مجھے، رقیہ اور شان کو دیکھ کر بھی اس کی چیخ نکل جاتی— یہ سمجھنا مشکل تھا کہ وہ نادرہ کو تلاش کر رہی ہے یا نہیں— مگر شاید قدرت نے ایسے معذور اور اپاہج بچوں میں بھی خون کے احساس کو زندہ رکھا ہے— شاید کچھ دنوں تک وہ نادرہ کو تلاش بھی کرتی رہی...... مگر پھر...... شاید اسے تلاش کرنے کی ضرورت بھی نہیں تھی......

میں نے گھڑی کی طرف دیکھا...... سارہ انتظار کر رہی ہوگی......

پروفیسر نیلے مسکرائے......

ہم دونوں ٹیلے سے اٹھ کر کھڑے ہوئے— مگر سارے راستے ساتھ چلنے کے باوجود ہم دونوں خاموش تھے......

پروفیسر نیلے کو ان کے گھر کے دروازے پر چھوڑ کر میں اپنے گھر کے لیے چل پڑا—
لیکن ذہن اب بھی سائیں سائیں کر رہا تھا—

(۳)

'آپ نے سچ مچ بھوت دیکھا ہے ابو بابا؟' سارہ کی آنکھوں میں شک کی پرچھائیاں تیز ہو رہی تھیں۔

'لو سنو...... بی بی کی بات— اور نہیں تو کیا— اب اس عمر میں کیا جھوٹ بولوں گا— ہم تو بچپن سے دیکھتے آئے ہیں......

'اور بھوت سے کشتی بھی لڑی ہے......' حلیمہ نے ہنستے ہوئے کہا...... لو، یہ سب اور کون بتائے گا— بس...... سارا دن بھوتوں کے قصے ہی تو سناتے ہیں—'

سارہ کی آنکھوں میں حیرت تھی— بھوت کیسے دکھتے ہیں— میرا مطلب ہے، دکھنے میں

کیا ہمارے جیسے ہوتے ہیں—

'لو...... یہ کس نے کہا...... بھوت تو بھوت ہوتے ہیں— دس دس فٹ کے......

'دس دس......؟'

اور نہیں تو کیا...... کچھ تو اس سے بھی زیادہ لمبے ہوتے ہیں—

'پھر وہ گھروں میں کیسے گھوم سکتے ہیں— یہاں کی چھتیں تو کافی نیچی ہیں—'

'لو، بی بی کی سنو......' زور سے ہنسے ابو بابا— ارے بھوت ہیں بھوت— جب مرضی دس فٹ کے ہوگئے جب مرضی چار فٹ کے— ایک بار جنگل میں جاتے ہوئے مجھے لمبا تگڑا بھوت ملا تھا......

'کتنے فٹ کا؟' یہ حلیمہ تھی—

'پندرہ فٹ سے کم نہیں تھا— یہ لمبا...... چوڑا......'

'پھر تو آپ بھاگ کھڑے ہوئے— ہے نا ابو بابا......'

لو سنو بی بی کی بات— ارے بھوت کو میرے ہونے کی آہٹ بھی مل جاتی تو وہ مجھے ہاتھ بڑھا کر پکڑ نہیں لیتا— ارے یہ جنگل کے بھوت ہوتے ہیں بی بی— لمبے تگڑے— سارا دن جنگلوں میں گھومتے رہتے ہیں......

سارہ کے سارے جسم میں جھرجھری پھیل گئی—

آپ مجھے ڈرا رہے ہیں ابو بابا...... میں ددّو سے شکایت کروں گی......'

'ارے نہیں بی بی...... اللہ معاف کرے......' ابو بابا نے اپنے دونوں سخت ہاتھ گال پر جڑے— اب صاحب کو یہ سب مت بتانا— صاحب ان باتوں کو نہیں مانتے نا...... وہ مجھ سے ناراض ہو جائیں گے—

'لیکن میں تو بتاؤں گی—' حلیمہ نے ہنس کر کہا—

'کیا بتاؤ گی—؟'

’یہی، کہ آپ سارہ بیٹا کو الٹی سیدھی کہانیاں سنا رہے تھے—‘

’لو بی بی...... کیا میں نے آپ کو کوئی الٹی سیدھی کہانی سنائی—ارے بھوت پریت کہاں نہیں ہوتے—اب میں نے دیکھا تو جھوٹ کیسے بولوں کہ نہیں دیکھا— کتنی بار تو ان کے چنگل سے بچا ہوں۔ باپ رے— پکڑا جاتا تو میری ہڈیاں تک نہیں ملتیں—

ابو بابا کچھ سوچتے ہوئے بولے—ابھی پچھلے سال ہی کی بات ہے—یہ جو مین گیٹ ہے نا...... رات کے وقت مجھے نیند نہیں آ رہی تھی—بدہضمی کی شکایت بھی تھی—سوچا، ذرا سیر کر لوں تو آرام سے نیند آ جائے گی— گیٹ کھول کر آگے بڑھا—ابھی چار قدم چلا ہوں گا کہ لگا...... کوئی میرے پیچھے آ رہا ہے—میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو کوئی نہیں......‘

پھر—؟ سارہ نے چونک کر پوچھا—

’پھر میں آگے آگے چلتا گیا۔ چاندنی رات تھی— مجھے پھر احساس ہوا کہ ہو نہ ہو کوئی ضرور ہے جو میرا پیچھا کر رہا ہے۔ اس وقت تک مجھے بھوت پریت کا خیال بھی نہ آیا تھا—میں نے ایک بار پھر پیچھے پلٹ کر دیکھا—اس بار بھی کوئی نہ تھا—مجھے آ گیا جوش—غصے سے بولا—اگر کوئی مائی کا لعل میرا پیچھا کر رہا ہے تو سامنے آ کر دکھائے—برا حال نہ کر دوں تو ابو نام نہیں—

پھر......؟ سارہ کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے......

’بولنے کو تو بول دیا بی بی...... لیکن دوسرے ہی لمحے ڈر سے میری گھگھی بن گئی— بھوت پریت کا احساس تو فوراً ہو جاتا ہے—مجھے اچانک احساس ہوا، میرا پیچھا ہو نہ ہو کوئی انسان تو نہیں کر رہا ہے—پھر—میں نے پلٹ کر دیکھا—اور جیسے سانس گلے میں اٹک گئی—اب کیا بتاؤں بی بی— آپ تو یقین کرنے سے رہیں—سامنے ایک بڑا سا کالا دیو کھڑا تھا—20 فٹ سے بھی زیادہ—جتنے بڑے تاڑ کے پیڑ ہوتے ہیں—اتنی اونچائی سے وہ مجھے دیکھ رہا تھا اور اس سے پہلے کہ وہ مجھے ہاتھ بڑھا کر پکڑ لے، میں نے اللہ کا نام لیا— کلمہ پڑھا—اور سر پر پاؤں رکھ کر گھر کی طرف بھاگ کھڑا ہوا— گھر تو پہنچ گیا بی بی— مگر حلیمہ گواہ ہے پورے ایک ہفتہ تک تیز بخار میں

جلتا رہا— ابھی بھی دیکھو بی بی، اس بھوت کے نام سے میرے روئیں کھڑے ہیں۔ یہ دیکھو بی بی......'

'ہاں یہ تو ہے—' حلیمہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس بات کی تو میں بھی گواہ ہوں۔ پورے ایک ہفتہ بیمار رہے تھے یہ۔

'اچھا......' سارہ حیرت سے ابو بابا کے چہرے کو پڑھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ جیسے یہ اندازہ لگا رہی ہو کہ ابو بابا کی بات کس حد تک سچ تسلیم کی جا سکتی ہے......

●●

میں مین گیٹ سے نکل کر کچن کی طرف آ چکا تھا۔ چائے کی طلب ہو رہی تھی— لیکن ابو بابا کی دلچسپ گفتگو نے مجھے روک لیا تھا۔ عام طور پر یہ بات بھی اخلاقیات سے پرے ہے کہ کسی کی چھپ کر گفتگو سنی جائے۔ مگر پروفیسر نیلے کے گھر سے نکلنے کے بعد میں ذرا سا ریلیکس ہونا چاہتا تھا۔ میں ابو بابا کی باتوں پر زیر لب مسکرایا— پھر گلہ کھنکھارنے کی آواز نکالی۔

سارہ نے پلٹ کر دیکھا......

'ددّو کب آئے......؟ وہ تیزی سے آگے بڑھی اور پیار سے مجھ سے لپٹ گئی— انکل کے یہاں گئے تھے نا؟ مجھے کیوں نہیں لے گئے......'

ابو بابا مجھے دیکھ کر سکتے میں تھے......جبکہ حلیمہ خاموشی سے مسکرا رہی تھی۔

میں نے ازراہ تبسم دریافت کیا— ابو بابا......کیا فرما رہے تھے......

'ددّو......وہ......'اس سے پہلے کہ سارہ کچھ کہتی حلیمہ زور سے بولی۔

'وہ اپنے پاؤں میں درد کے بارے میں بتا رہے تھے......آج کل جوڑوں میں کافی درد رہنے لگا ہے......

سارہ کھلکھلا کر ہنس پڑی—

'ابو بابا چائے بھیج دیجئے گا......'

میں سارہ کو لے کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا......

●●

سارہ کی آنکھوں میں ڈھیر سارے سوال ناچ رہے تھے......'ابو بابا سچ بولتے ہیں دڈّو...... کیا سچ مچ میں......'

'نہیں بیٹا'...... میں آہستہ سے مسکرایا— 'حقیقت صرف ہم ہیں۔ یہ بات ہمیشہ یاد رکھو—'

سارہ اپنے لفظ چبا رہی تھی...... ہر دوسرا آدمی ایک جہنم ہے......ہیل......'

'نہیں بیٹا...... میں اس بات کو بھی تسلیم نہیں کرتا— ہمارے وجود سے وابستہ کتنے ہی لوگ ہوتے ہیں اور ہر شخص کی اہمیت مسلم ہے......لیکن ان سب سے الگ اپنی شخصیت کا جادو بھی ہوتا ہے۔اور بہتر ہے کہ تم یہ جادوگری سیکھ لو......'

وہ ہنس رہی تھی۔آپ کا مطلب ہے دڈّو— پرسنالٹی میکنگ...... یہ ہمیں کالج میں سکھایا جاتا ہے۔ہم کیسے اپنی شخصیت میں چمک لائیں۔ہمیں سے لی بریٹیز کے انٹرویو اور ان پر بنے ہوئے پروگرام دکھائے جاتے ہیں—

اٹھ کر وہ کھڑکی کے پاس آ گئی— 'ہوا تیز ہے دڈّو۔موسم یہاں کا ہمیشہ ایک جیسا رہتا ہے— ہے نا دڈّو......'

'نہیں بیٹا— اب یہاں کے موسم بھی تیزی سے بدلنے لگے ہیں۔بہت تیز گرمی اور بہت تیز سردی......

وہ ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولی...... وہ تمہاری منکی کیپ......تم اب ذرا بھی اپنی فکر نہیں کرتے دڈّو......'

میں ہنس رہا تھا— تو آ گئی ہے نا...... ایک پیاری سی پوتی۔ پھر اپنا خیال کیوں رکھوں میں...... تیرا باپ تو خیال نہیں رکھتا میرا......'

میں نے ازراہِ مذاق کہا۔ مگر سارہ سیریس ہوگئی—

'ایسی بات نہیں ہے دڈّو— پاپا ممّی آپ کو بہت مس کرتے ہیں۔ شاید بہت زیادہ۔ پاپا میں بھی ایک ناسٹیلجیا بستا ہے دڈّو۔ شہر کے اتنے بڑے ڈاکٹر ہیں۔ اتنے بڑے بڑے لوگوں سے ملتے ہیں خود بھی بڑے آدمی ہیں۔ مگر جب اکیلے ہوں گے تو بس آپ کی باتیں اور وہ کیا ہے...... بلند......'

'بلند حویلی......' سارہ کے منہ سے شان کی باتیں سنتے ہوئے اچھا لگ رہا تھا......تو وہ بلند حویلی کو بھولا نہیں۔ وہ وہاں کے قصے سناتا ہے......'

'ہاں دڈّو— کتنے انوکھے قصے۔ پاپا کی بات پر یقین کرنے کی خواہش نہیں ہوتی۔ وہ...... پاپا بتا رہے تھے......گھومتا خزانہ...... سمتھنگ سمتھنگ ...... حویلی...... کوٹھی...... خزانہ۔ مائی گاڈ...... آپ لوگوں کی تو پرورش ہی Fantacy کے ماحول میں ہوئی۔ تب کتنا ایڈونچر ہوگا دڈّو— کھلا آسمان...... کبوتر...... مرغیاں— راجے مہاراجوں کی طرح کوٹھیاں اور خزانے کی تلاش...... دل نہیں مانتا دڈّو کہ انسانی تہذیب میں، بس کچھ سال پہلے تک ایسا بھی ہوتا ہوگا— اچھا...... تمہیں ان دنوں کی یاد آتی ہے دڈّو......'

سارا کی بات پر خاموش ہوگیا ہوں— کیا جواب دوں...... گمشدہ خزانے کی تلاش میں تو ہم کامیاب نہیں ہوئے لیکن میری زندگی کا اصل خزانہ تو وہی ہے۔ میرا گزرا ہوا ماضی...... میرا بچپن...... میری نوخیز شرارتوں کے دن...... مرغی کا دربہ...... صحن...... چھت کو جاتی لمبی لمبی سیڑھیاں...... محراب نما دروازے...... محبت کی تنہائی اور نادرہ کا ساتھ......

'تم کس سوچ میں ڈوبے ہو دڈّو......'

سارہ مجھے غور سے دیکھ رہی تھی— بڑے سے بڑے آدمی کا ایک بچپن ہوتا ہے۔ ایک گزرا

ہوا کل...... ہے نا دڈّو...... پاپا کو دیکھتی تھی تو یقین نہیں آتا تھا۔ پاپا ہر وقت سنجیدہ رہتے ہیں۔ گھر پر بھی مریضوں کا آنا جانا لگا رہتا ہے۔ نرسنگ ہوم سے فرصت ہی نہیں ملتی۔ پاپا کو دیکھ کر اکثر سوچتی تھی...... کیا پاپا میں بھی کہیں کسی گوشے میں بچپن چھپا ہوگا......؟ ددو...... یقیناً میرے لیے یہ چونکنے کی بات تھی — بلند شہر کو یاد کرتے ہوئے آج بھی پاپا کی آواز بھرا اٹھتی ہے —

اچانک جیسے اسے کچھ یاد آ گیا۔ وہ میری طرف مڑی......

ایک بات پوچھوں دڈّو......

ہاں......

جھوٹ مت بولنا......

اس کے چہرے پر شرارت تیر رہی تھی...... پچھلی بار جب آئی تھی تو تم ایک خط سے ڈر گئے تھے۔ ڈر گئے تھے نا......؟

میرے دماغ میں ایک بار پھر میزائلیں چھوٹ رہی تھیں......

’کس کا خط تھا......؟ بولو دڈّو......‘

میرے چاروں طرف جیسے ایک نہ ختم ہونے والے سناٹے کا جال سا بن دیا گیا تھا —

سارہ میری آنکھوں کو بغور دیکھ رہی تھی۔ ’اچھا مت بتاؤ ددو۔ پاپا کو بھی یہ بات بری لگتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کبھی کسی سے زبردستی کوئی کام نہیں لینا چاہئے۔ وہ ایک لمحے کو ٹھہری — مگر میرا دل کہتا ہے دڈّو۔ اس خط کے آنے کے بعد سے لے کر اب تک آپ کی بے چینی میں کمی نہیں آئی ہے دڈّو — ساری دڈّو۔ میرا ارادہ آپ کے دل کو دکھانا نہیں تھا۔ مگر آپ ددو ہیں نا...... آپ کو پریشان کیسے دیکھ سکتی ہوں میں......

ابو بابا چائے لے کر آ گئے تھے۔

’اچھا دڈّو — میں نیٹ کرنے جا رہی ہوں۔ کچھ دیر چیٹنگ کروں گی۔ پھر پاپا سے موبائل پر بات کروں گی — تم بھی آرام کرنا دڈّو......‘

سارہ ابو بابا کے ساتھ واپس جا چکی ہے......

مگر اس کی آواز اب بھی کانوں میں گونج رہی ہے۔

●●

ہوا تیز چل رہی ہے......

کھڑکی کے پٹ ڈول رہے ہیں—

یادوں کی ریل آہستہ آہستہ چل پڑی ہے۔ آنکھوں کے پردے پر نگار کی تصویر ابھرتی ہے۔ اب اس کے سیزر یا جھٹکے آنے کی شکلیں بدل گئی تھیں—وہ لوگوں کو دیکھ کر ڈرنے لگی تھی۔ یوں بھی میت کے دن کے ناخوشگوار حادثے کے بعد محلے والوں نے نور محمد سے علیک سلیک بھی بند کر دیا تھا— دو ایک بار رقیہ کے ساتھ میں نگار سے ملنے گیا۔ مگر وہ خوفزدہ سی نور محمد سے چپک گئی— میں نے محسوس کیا، وہ لمبی ہو رہی تھی......لیکن اس کے ہاتھ ذرا سے ٹیڑھے ہو گئے تھے۔ بال لمبے اور الجھے ہوئے تھے— کپڑوں کا خیال تو وہ بالکل نہیں رکھتی تھی—

سب سے زیادہ رنج بانو کو تھا......اور بانو نے اس کا اظہار رقیہ سے کیا تھا۔

'اب یہاں کوئی نہیں آتا۔ دودھ والا، سبزی والا...... یہاں تک کہ ڈاکیہ— کسی بھی انجانی آواز یا انجانے آدمی سے یہ ڈر جاتی ہے اور پھر دورے کی شروعات ہو جاتی ہے۔ میں بھی کب تک سنبھالوں گی آپا— ہمت کر کے اب تک ہوں۔ کب تک ساتھ دوں گی، میں بھی نہیں جانتی......

اور پھر ایک دن یہ بھی سننے میں آیا کہ بانو چھوڑ کر چلی گئی۔ مجھے احساس تھا کہ وہ زیادہ دن تک اب کوٹھی میں رہ نہیں پائے گی۔ مگر مجھے بانو کے جانے کا افسوس تھا۔ اب ساری ذمہ داریاں نور محمد کے سر آ گئی تھیں۔ پہلے بانو، نگار کے سنبھالنے سے لے کر گھر کا سارا کام کر دیا کرتی تھی— مگر اب نور محمد کی دنیا اکیلی تھی......

نور محمد بہت حد تک بدل چکا تھا۔ اس کے چہرے پر ہر وقت ایک آسیبی کیفیت دیکھی جاسکتی تھی۔ نادرہ کے غم میں وہ ساری دنیا بھول گیا تھا۔ یا پھر اب اس کی واحد دنیا صرف اور صرف نگار تھی۔ شاید وہ نگار کے لیے ہی زندہ تھا......

●●

ہوا تیز ہوگئی ہے...... کھڑکی کے پٹ ایک دوسرے سے ٹکرا رہے ہیں۔ آگے بڑھ کر میں نے کھڑکی بند کردی۔ میز پر کاغذات بکھرے تھے...... قلم لے کر میں نے ان کاغذات پر آڑی ترچھی لکیریں کھینچنا شروع کردیا...... اور اچانک میں چونک گیا تھا۔ ایک بار ایسی ہی ایک تصویر نور محمد اپنے ساتھ لے گیا تھا...... اور یہی تصویر میں نے اس کے ڈرائنگ روم میں فریم کرا کے ٹنگی ہوئی دیکھی تھی—— اور—— مجھے یاد ہے...... میں اس تصویر کو دیکھ کر ڈر گیا تھا—— تب اتنے خوفناک واقعات سامنے نہیں آئے تھے لیکن شاید ان واقعات کے سامنے آنے کی پیشن گوئی ہوچکی تھی...... اور اب وہی آڑی ترچھی لکیریں...... مثال کے لیے میں آپ کو سمجھاتا ہوں کچھ اس طرح کی تصویریں......

میں ایک بار پھر چونک گیا تھا...... کاغذ پر جو آڑی ترچھی لکیریں میں نے کھینچی تھیں، وہ اب مجھے پھر سے پریشان کر رہی تھیں......

کیا یہ کوئی مچھلی تھی......؟

چھوٹی سی چکنی مچھلی......

اور مچھلی کی بناوٹ کے ساتھ نصف چاند کی بناوٹ کے ساتھ جو لکیریں نمایاں تھیں، وہ عورت کے سینے سے مشابہت رکھتی تھیں——

مچھلی سیکس کی علامت ہے...... اور...... وہ سینہ مصفّا...... وہ دو قبّہ نور...... یہ کیا ہے......؟

ذہن کے پردے پر سیٹیاں گونج رہی ہیں۔ یہ کچھ ہے......شاید جسے ابھی اس وقت سمجھنے سے میرا ذہن قاصر ہے......مگر یہ کچھ ہے...... عام نہیں...... کیا اس میں آنے والے وقت کے لیے کوئی علامت پوشیدہ ہے— کنواں، اوکھلی سانپ، مچھلی...... یہ سب جنسی ناآسودگی کی علامت ہیں...... کیا آنے والے وقت میں ایسا کچھ سنگین اور خوفناک واقعہ ہونے والا ہے، جسے میں ابھی سمجھ نہیں پا رہا ہوں......

میں نے ایک بار پھر ان کی آڑی ترچھی لکیروں کو غور سے دیکھا—

اس بار ان آدھی ادھوری لکیروں میں ہلچل ہوئی تھی—

اور جو کچھ میں دیکھ سکا، یقیناً اس نے مجھے خوفزدہ کر دیا تھا—

●●

اس دن نور محمد ملنے آیا تھا۔ اس نے بہت حد تک خود کو سنبھال لیا تھا۔ رقیہ نے چائے اور ناشتہ کے لیے پوچھا تو اس نے منع کر دیا۔ پھر اُداس بھرے لہجے میں بتایا—

'سب سے مشکل کہیں آنے جانے میں ہوتی ہے بھیّا— بانو تھی تو پریشانی نہیں تھی۔ اب اللہ کا نام لے کر نکلتا ہوتا ہے— نیند کی دوا کھلا کر آیا ہوں۔ کہیں نکلتا ہوں تو باہر تالہ لگا کر جاتا ہوں۔ زیادہ دیر تک اسے اکیلے بھی نہیں چھوڑ سکتا۔ تلاش میں ہوں کہ بانو جیسی کوئی عورت مل جائے۔ مگر مشکل یہ ہے کہ مل بھی گئی تو کیا نگار ایک انجانی عورت کو قبول کرے گی؟

پھر—؟

'یہی تو سمجھ میں نہیں آتا بھیّا— پھر کام بھی کرنا ہوتا ہے۔ دو پیسے بھی کمانے ہوتے ہیں۔ اب سب اللہ کے بھروسے ہے...... ایک بات کہنی تھی آپ سے......، وہ ذرا ٹھہر کر بولا— آپ وعدہ کیجئے۔ برا نہیں مانیں گے۔

'بالکل نہیں مانوں گا—'

’اب آپ بھی مت آیا کیجئے۔ کوئی آتا ہے تو نگار کو سنبھالنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس دن جب آپ لوگ آئے تھے، بڑی مشکل سے چپ ہوئی تھی۔ میں تو ڈر گیا تھا کہ اب یہ بھی گئی— بھیا، میں نگار کو نہیں کھو سکتا—‘

اس کا گلہ پسیج گیا تھا— ’نادرہ کی یادگار ہے— میرے لیے اب یہی میری زندگی ہے۔ میں ساری ساری رات اللہ کے حضور میں نگار کی زندگی کے لیے دعا مانگتا ہوں— میں جانتا ہوں، اس کی موجودگی، نہ ہونے کے برابر ہے۔ نہ وہ پڑھ سکتی ہے، نہ کسی کام کی ہے۔ میں یہ بھی نہیں جانتا کہ وہ بڑی ہوگی تو کیا ہوگا؟ شادی تو سوچ بھی نہیں سکتا۔ میں جانتا ہوں اس کی موجودگی کسی بیکار کل پرزے کی طرح ہے...... مگر آخر ہے تو انسان۔ گوشت پوست کی انسان۔ میری نادرہ کی نشانی— اب اس بیکار کل پرزے کو پھینک تو نہیں سکتا بھیّا—‘

’اس کی آنکھوں میں آنسو تھے—‘

’اب میں ہی اس کا سب کچھ ہوں۔ باپ بھی— ماں بھی— گائیڈ بھی...... دوست بھی، آیا بھی اور ڈاکٹر بھی......‘

اس نے مسکرانے کی کوشش کی— ’اور مجھے ان ذمہ داریوں کو ادا کرنے میں اوپر والے سے کوئی شکوہ یا گلہ نہیں ہے...... بس آپ دعا کیجئے بھیّا— میں اپنی ذمہ داریوں کو نبھانے میں کامیاب رہوں...... اچھا چلتا ہوں بھیا۔ نگار اکیلی ہے نا...... کیا پتہ، اٹھ جائے تو مجھے تلاش کرے—‘

نور محمد اٹھ کھڑا ہوا تھا—

●●

نور محمد کے جانے کے بعد میں گہرے سناٹے میں آ گیا تھا۔ اب نگار سے ملنے کی امید بھی جاتی رہی تھی— اور نگار کے بارے میں جاننے کے لیے بس نور محمد کا آسرا تھا— وہ اکثر آ جاتا

اور نگار کی خیریت دے کر چلا جاتا......

اب کوٹھی اور نور محمد سے بہت کم رابطہ رہ گیا تھا۔ پھر نور محمد نے بھی آنا جانا کم کردیا—اور میں بھی اپنی زندگی کے پیچ وخم میں الجھ گیا۔

(۴)

پھر وقت نے ایک لمبی اڑان بھری۔

انقلابات، ملک کی نئی اخلاقیات قلمبند کر رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے دس سال گزر گئے—وقت کے پرندے نے لمبی اڑان بھری تھی۔ میرا اسکول اب انتظامیہ کمیٹی نے سنبھال لیا تھا—اسکول میں بچوں کی تعداد میں خوشگوار حد تک اضافہ ہوا تھا—شان ایک خوبصورت اور ذہین نوجوان میں تبدیل ہو چکا تھا—وہ ایک کامیاب ڈاکٹر بن کر اپنی زندگی گزارنا چاہتا تھا اور یہ بھی سننے میں آیا تھا کہ وہ دل ہی دل میں کسی کے لیے نرم گوشہ بھی رکھنے لگا ہے—

انقلاب کی آہٹ تیز تھی—ترقی کے راستے اپنے ساتھ فرقہ وارانہ رنگ کو لے کر آئے تھے—ایک اخلاقیات غلامی تھی۔ ایک آزادی کی—ایک اخلاقیات کا تعلق ان جنگوں سے تھا جب ہندوستان پاکستان کے درمیان نفرت کے شعلے بھڑک اٹھے تھے۔ اور اب ملک کی ایک نئی اخلاقیات جمہوریت کو زخمی کر رہی تھی—

یہ رتھ یاتراؤں کی اخلاقیات تھی—

ملک ایک بار پھر تقسیم کے دہانے پر تھا—ہندو مسلمان کو لڑانے والی سیاسی جماعتوں کی سازش کام کر گئی تھی—آزادی اپنے ساتھ فساد کا خونی تحفہ لے کر آئی تھی۔ ۱۹۴۸ سے ہی بابری مسجد رام جنم بھومی تنازعہ نے زور پکڑنا شروع کیا۔ زبردست فساد برپا ہوا اور یہ معاملہ عدالت کو سونپ دیا گیا—وشو ہندو پریشد نے اجودھیا، متھرا اور وارانسی کے کاشی وشوناتھ مندر کو آزاد کرانے کا عہد کیا—حالات بھیانک تھے اور دنوں دن بگڑتے ہی جا رہے تھے—

ملک نفرت کی ایک نئی اخلاقیات لکھ رہا تھا اور کم وبیش یہ وہی اخلاقیات تھی جو غلامی کے بطن سے پیدا ہوئی تھی۔ دو ملک، دو قوم کے نظریے نے جسے پروان چڑھایا تھا۔ دراصل آزادی کے بعد کے برسوں میں نفرت کے اس لاوے کو فقط دبانے کی کوشش کی گئی تھی۔ مگر رتھ یاتراؤں نے نفرت کی ایسی آندھی چلائی کہ لوگ تقسیم وطن اور اس سے پیدا شدہ حالات سے اس کا تجزیہ کرنے لگے —

اور یہی وقت تھا جب کشمیر کو لے کر ہندستان اور پاکستان کے حالات اچانک بگڑنے لگے تھے — اننت ناگ اور راجوری میں دہشت پسند کارروائیاں اپنے سر اٹھانے لگی تھیں —

حالات بے قابو تھے — اور مسلمان اپنے اپنے گھروں میں خوفزدہ، اپنے مستقبل کی فکر کر رہا تھا۔

اور یہی وقت تھا جب نئی تہذیب اس المیہ سے گھبرا کر ایک نئی کہانی لکھنے کی شروعات کرنے والی تھی۔

ایک بیحد خوفزدہ کرنے والی کہانی —

نفرت اور ان بھیانک جنگوں سے الگ —

اسلحے، میزائل اور بم کے دھماکوں سے الگ......

پنجرہ ٹوٹ چکا ہے —

پرندہ اڑ گیا ہے......

سن ۱۹۹۱ کے بھیانک دنوں کی شروعات ہو چکی تھی۔ ایک طرف کشمیر کو لے کر پاکستان نے پراکسی وار کی شروعات کر دی تھی اور دوسری طرف بابری مسجد تنازعہ نے لوگوں کا جینا دوبھر کر رکھا تھا......شام ہوتے ہی ہم گھروں میں بند ہو جاتے۔ سامنے والے ہر چہرے میں ایک دہشت پسند نظر آتا —

بلند شہر میں کتنی ہی بار فضا گڑبڑائی — حالات بے قابو ہوئے۔ کئی موقعوں پر کرفیو بھی لگایا گیا — میں ان نفرت بھرے رنگوں کو دیکھ رہا تھا، جنہوں نے ایک بار پھر ہندو مسلمانوں کے درمیان

فرق کی ایک بڑی دیوار اٹھادی تھی—

سارا ملک جل رہا تھا۔

بارودی سرنگ میں محض دھماکہ ہونے کا انتظار تھا—

اورشاید کچھ ایسا انتظار قدرت کو بھی ہوتا ہے۔ کچھ ایسے کھیل تماشے قدرت بھی دکھاتی رہتی ہے۔

اور یہی وقت تھا جب انسانی تہذیب کسی بارودی سرنگ میں داخل ہوگئی تھی......

●●

نادرہ کے انتقال کے بعد میں بہت حد تک اپنی زندگی میں لوٹ آیا تھا—اسکول، بیوی اور بیٹا—اب یہی میری زندگی کا محور تھے—نور محمد نے بھی بہت حد تک وقت اور حالات سے سمجھوتہ کر لیا تھا— مگر نگار کے حالات بگڑتے جارہے تھے—

اب وہ جوانی کی دہلیز پر کھڑی تھی— لیکن ایسا کوئی بھی احساس اس کے اندر باقی نہیں تھا—اور جیسا کہ ڈاکٹر ابھیتوش نے بتایا تھا، وہی باتیں اب نور محمد کے منہ سے بھی سننے میں آتی تھیں۔ جیسے نگار کسی ضد کو ٹارگٹ کر لیتی ہے—اور وہ دیر تک اسی ضد میں ڈوبی رہتی ہے—

نور محمد پریشان تھا اور اس کی پریشانیوں کی بہت سی وجوہات تھیں...... جیسے اس نے بتایا......

'ہم ساتھ سوتے ہیں۔ اب وہ بڑی ہوگئی ہے۔ کبھی کبھی وہ میرے جسم سے لپٹ جاتی ہے۔ ایسے موقعوں پر کچھ عجیب سا لگتا ہے۔ ایسا بہت کچھ کرنا پڑتا ہے جو شاید عام باپ نہ کرپاتے ہوں......

'جیسے؟'

مثلاً اسے نہانا...... کپڑے تبدیل کرنا...... کبھی کبھی ٹوائلٹ لے کر جانا۔ وہ بستر گیلا کر دیتی

ہے۔ کبھی کبھی آنکھوں کو بند کرنا پڑتا ہے اور کبھی کبھی بے شرم بن کر خود کو سمجھانا پڑتا ہے کہ میں اس کا باپ ہوں...... مجھے اس کے کپڑے دھونے پڑتے ہیں۔ پیشاب اور پاخانے سے لتھ پتھ اس کی چادر دھونی پڑتی ہے...... کئی بار......

اس کی آنکھوں میں خوف کی آمیزش تھی—

’وہ سارے کپڑے اتار کر ننگی ہو جاتی ہے۔ اسکی طرف پلٹ کر دیکھنا اللہ کا بھیجا ہوا عذاب لگتا ہے۔ مگر کیا کروں۔ میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس کی گندگی صاف کرنا— نہانے کے لیے لے جانا...... باتھروم میں بھی وہ سارے کپڑے پھینک دیتی ہے۔ اسکے جسم پر آنکھیں موند کر صابن لگانا— آپ ایک مجبور باپ کی کیفیات کا اندازہ نہیں لگا سکتے—

نور محمد کی آنکھوں میں آنسو منڈرا رہے تھے۔ لیکن کیا کروں بھیّا— نادرہ سے وعدہ لیا ہے۔ اس کی ہر بات مانوں گا...... وہ جو بھی کہے گی کروں گا...... اور کر رہا ہوں بھیّا۔ روز دعا مانگتا ہوں۔ لیکن شاید کوئی بھیا نک گناہ ہوا ہے مجھ سے۔ میری دعا قبول ہی نہیں ہوتی۔ میں آج بھی اس امید پر زندہ ہوں کہ ایک دن...... میری بچی...... میری نگار بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔ ناامیدی کفر ہے بھیّا— اس کی ذات سے بالکل ناامید نہیں ہوتا— مگر ہاں کبھی کبھی اپنی بے چاری اور لاچاری پر پھوٹ پھوٹ کر رونے کی خواہش ہوتی ہے— یہ کوئی زندگی ہے بھیّا۔ سب اپنے دور چلے گئے— نگار ہے— لیکن بس کسی زندہ لاش کی طرح— نہ پڑھا سکا۔ نہ اس کے لیے کوئی خواب رکھ سکا۔ کئی بار خودکشی کرنے کی خواہش نے بھی زور مارا۔ جی چاہا تھوڑا زہر نگار کو دے دوں، تھوڑا خود کھا لوں...... مگر خودکشی حرام ہے...... اور نگار کی موت......؟ نہیں بھیّا— نگار کے بارے میں ایسا سوچنا بھی مجھے پاگل کرتا ہے—‘

رقیہ چائے لے کر آ گئی تھی۔

نور محمد کا ہر لفظ مجھے زخمی کر رہا تھا...... میری آنکھوں کے آگے دور تک اندھیرا اتر آیا تھا— جنگوں اور تباہیوں کے دور میں، میں یہ کیسی کہانی سن رہا ہوں۔ ایک ناقابلِ برداشت کہی جانے والی

کہانی......ایک مجبور باپ کی لاچاری کے وہ صفحے، جس کی طرف دیکھتے ہوئے بھی روح کانپ جاتی تھی—

ایک بھیانک سناٹا میری روح پر مسلط تھا—

کیسے کرتا ہوگا نور محمد یہ سب— نگار جوان ہوگئی ہے۔ ایک جوان بیٹی کا باپ کے ساتھ سونا— باپ کا اسے نہلانا۔ جسم میں صابن ملنا— باپ کے سامنے ایک معذور بیٹی کا ننگا ہو جانا...... اسے لے کر ٹوائلٹ جانا......اور اس کے جسم کے ہر حصے کا نمایاں ہونا......سانپ سرسرا رہے تھے۔

ہزاروں کی تعداد میں سانپ—

جسم سے ہزاروں کی تعداد میں چیونٹیاں لپٹ گئی تھیں۔ میں نے تو کبھی اس پہلو پر سوچا بھی نہیں تھا کہ نور محمد کو یہ سب بھی کرنا پڑ رہا ہوگا۔ بانو کے بعد اس گھر میں پھر کوئی عورت نہیں آئی۔ کوئی عورت آتی بھی تو شاید وہ بھی یہ سب کرنے سے انکار کر دیتی......مگر نور محمد...... مجھے پہلی بار نادرہ پر فخر ہوا تھا کہ اس نے ایک سچے اور محنت کش انسان سے شادی کی تھی—

نور محمد کا چہرہ جھکا ہوا تھا۔ آنکھیں گیلی تھیں۔ شاید ابھی بھی یادوں کی آندھی چل رہی تھی— اور وہ اس آندھی میں گھر گیا تھا......ایک لمحے کو اس نے میری طرف دیکھا...... پھر سر جھکا لیا......

'بھیّا......آپ ان لمحوں کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے— جو کچھ جی پر گزرتی ہے، میں جانتا ہوں— میں نے اپنے تمام احساس سلا دیئے ہیں مگر انسان ہوں نا......کبھی کبھی کوئی احساس سر نکالتا ہے، تو دیواروں سے سر ٹکراتا ہوں— خود کو زخمی کر لیتا ہوں......مگر کیا کروں بھیّا، میرے پاس کوئی اور راستہ بھی کیا ہے......؟

'ایک منٹ......' میں نے اسے روک دیا— تم نے ابھی کہا......تم اپنے احساس کو سلا دیتے ہو......ذرا اس جملے کی وضاحت کرو گے؟

یقینی طور پر میرے ذہن میں چلتی ہوئی آندھیاں تیز ہوگئی تھیں......'وہ......' اس نے سر کو

جھکا لیا۔ ایک بیحد صبر آزما لمحہ...... جب آپ کے سامنے آپ کی بیٹی، ننگی حالت میں ہو......

اس کے لفظ ٹوٹ رہے تھے...... بیٹی میں اچانک ایک لڑکی کا جسم آجاتا ہے بھیّا— ایک بیحد تکلیف دہ جنگ ہوتی ہے جو مجھے خود سے لڑنی پڑتی ہے—'

میں نے آنکھیں بند کرلیں—

'اس کی پشت پر صابن ملتے ہوئے کتنی بار میں نے اپنے جسم میں تھرتھراہٹ محسوس کی ہے— وہ جوان ہوگئی ہے بھیّا— جوانی کے تمام نقوش ابھر کر سامنے آچکے ہیں اور ایسی حالت میں اسے نگاہ اٹھا کر دیکھنا میرے لیے کسی عذاب سے کم نہیں ہوتا......'

دنیا کی تمام اخلاقیات اس وقت سو گئی تھی...... میرے چاروں طرف زہریلے کیڑے اکٹھے ہو گئے تھے جو اپنے ڈنک سے مجھے بار بار زخمی کیے جا رہے تھے......

اچھا......اس کے اندر ایسی کوئی فیلنگ ......؟'

نور محمد نے معنی خیز نگاہوں سے میری طرف دیکھا—

'میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ کیا اس طرح کے معذور بچوں میں کوئی احساس پیدا ہوتا ہے یا نہیں؟ کیا اتنی عمر میں کبھی بھی اس میں کوئی ایسی خاص بات پیدا ہوئی، جس نے تمہیں چونکایا......؟

نہیں بھیّا......

'کیا اسے احساس ہے کہ وہ بڑی ہوگئی ہے؟

نہیں بھیّا......

مثال کے لیے جب تم اسے نہلاتے ہو...... صابن لگاتے ہو...... کہیں کوئی سا بھی احساس......

'نہیں بھیّا— وہ ایک مردہ چھپکلی کی طرح ہے۔ جذبات اور احساس سے الگ— مجھے نہیں لگتا کہ اس میں ایسا کوئی احساس پیدا ہو سکتا ہے......اب اگر ایسا کوئی احساس پیدا ہوتا تو کیا وہ

لباس پھینک دیتی۔ بستر گیلا کرتی یا ان جگہوں پر جانے کے لیے میرا سہارا لیتی؟'

نور محمد کی آواز بیٹھ گئی تھی......

'لیکن ہاں بھیّا— اب سہنا مشکل ہو رہا ہے...... حالات کو قابو میں کرنا ناممکن ہوا جا رہا ہے...... جیسے اس دن......'

'اس دن......؟'

'میں باہر سے لوٹا تو پچھواڑے کی کھڑکی کھلی رہ گئی تھی— محلے کے کچھ نوجوان بدمعاش لڑکے میری کھڑکی سے اچک اچک کر کچھ دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی وہ لڑکے بھاگ کھڑے ہوئے......اور میں نے جو کچھ دیکھا......

نور محمد کی نظریں جھک گئیں— وہ اپنے کمرے میں ننگ دھڑنگ تھی۔ لباس کا اسے ہوش کہاں تھا؟ میری ذرا سی غفلت کی وجہ سے کھڑکی کھلی رہ گئی تھی۔ اس روز پہلی بار میں نے اس پر ہاتھ اٹھایا تھا......لیکن ہاتھ اٹھا کر بھی کیا کیا؟ اس کے پاس تو کوئی سا بھی احساس نہیں تھا۔ اس رات میں بہت رویا......'

'جب تم نے ہاتھ اٹھایا......کیا اس وقت اسے دورہ پڑا تھا؟'

نہیں بھیّا—

میں گہری سوچ میں تھا......

اب اس پر رونے کا دورہ ہفتہ میں ایک دو بار ہی پڑتا ہے۔ مگر جب پڑتا ہے تو قیامت آجاتی ہے۔ وہ سانس روک لیتی ہے۔ جب وہ چپ ہو جاتی ہے تو میں صرف یہ دیکھتا ہوں کہ آیا وہ زندہ بھی ہے یا نہیں......؟

رقیہ دوبارہ آ گئی تھی۔

بھائی صاحب......کچھ لیں گے آپ؟

نہیں بھابھی......

کچھ پکوڑیاں تل دوں......؟

ارے نہیں بھابھی......

اچھا— چائے یا کافی تو چل ہی سکتی ہے......

میں نے رقیہ کو اشارہ کیا— دو چائے بنا کر لے آؤ......

اچھا— رقیہ غور سے ہمیں دیکھتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی— ذرا ٹھہر کر اس نے پوچھا—

'شان کیا کر رہا ہے......؟'

'میڈیکل کی تیاری......'

'ہونہار بچہ ہے......' وہ آہستہ آہستہ بدبدا رہا تھا— بچے ایسے ہی ہوتے ہیں۔ سب کے اپنے اپنے نصیب ہوتے ہیں بھیّا۔ اب شان کو دیکھئے، کل ڈاکٹر بن جائے گا۔ ایک گھر ہوگا— ایک فیملی ہوگی— اور یہاں— نہ عید نہ بقرعید، نہ تیوہار کی خوشیاں۔— نہ نئے کپڑوں کی خوشی— نہ آنے والے کل کی فکر— نہ پڑھائی— نہ شادی......نہ بچے......'

وہ رو رہا تھا— یہاں کچھ بھی تو نہیں ہے بھیّا— حالات خراب ہیں— دنگے اور فساد کی خبریں آتی رہتی ہیں۔ جانے پہچانے چہرے بھی بدل چکے ہیں۔ تالہ بند کر کے گھر سے نکلتا ہوں تو نگار کی فکر ستانے لگتی ہے۔ اور جب سے کھڑکی کے باہر ان غنڈوں کو دیکھا، تب سے اور بھی ڈرستا تا رہتا ہے۔

اچانک ٹھہر کر اس نے پوچھا—

'کیا یہ لوگ بابری مسجد توڑ دیں گے؟'

میں اس سوال پر اچانک چونک گیا تھا......

'اب وہاں نماز پڑھی تو جاتی نہیں نور محمد۔ لیکن یہ مسئلہ اگر شانتی سے حل ہو تو زیادہ بہتر ہے—'

'ان رات‌ھ یاتراؤں نے ملک کا سکون درہم برہم کر دیا ہے—' وہ خلاء میں دیکھ رہا تھا۔

'حالات بد سے بدتر ہوتے جا رہے ہیں۔ ہاتھ میں اردو اخبار لے کر گھومتے ہوئے خوف محسوس ہوتا ہے— گھروں میں بھگوا جھنڈے جھول رہے ہیں۔ لوگ ترشول اور نفرت کی زبانیں بول رہے ہیں......اب ڈر لگتا ہے بھائی صاحب......'

'بچوں سے بھی ڈر لگتا ہے؟ ان کے سوالوں کے جواب نہیں ہوا کرتے۔ مذہب نے دلوں کی تقسیم کر دی ہے نور محمد—'

'آپ سچ کہتے ہیں بھیّا......'

نور محمد نے ٹھنڈی سانس لی۔ روز ہی نئے آندولن۔ نئی نئی باتیں— ریڈیو سے ٹی وی تک خوف کی بارش......کبھی کبھی سوچتا ہوں، یہ ملک کہاں جا رہا ہے؟ اور کہیں ہم نے یہاں رہ کر کوئی بھول تو نہیں کی؟'

'نہیں نور محمد—'

میں نے پلٹ کر نور محمد کے چہرے کا جائزہ لیا— 'ایسا سوچنا بھی نہیں۔ پاکستان کے حالات تو یہاں سے بھی بدتر ہیں— وہاں مسجدوں میں گولیاں چلتی ہیں اور دہشت پسندوں کے ہاتھوں میں ملک کی باگ ڈور ہے۔ یہ برا وقت بھی کٹ جائے گا۔ یہ بس چند سازشی لوگوں کی جماعت ہے اور اس تحریک میں پورا ملک شامل نہیں ہے نور محمد—'

میری آواز کمزور تھی— 'یا اسے یوں بھی کہہ سکتے ہو کہ ابھی جمہوریت باقی ہے یہاں......

'مگر کب تک؟'

'بس اس کا جواب نہیں دے سکتا— لیکن برا سوچنے والوں سے زیادہ بڑی جماعت ان لوگوں کی ہے جو بہتر سوچتے ہیں۔ عوام نہ دنگا چاہتی ہے اور نہ ہی مسجد مندر سے اس کا کوئی سروکار ہے—'

'لیکن ڈر کا کیا کریں بھیّا، دل ذرا سی بھگدڑ یا ہنگامے سے دہل جاتا ہے—'

'یہ مسلم رہنما بھی کم نہیں ہیں نور محمد۔ سب ایک ہی تھالی کے چٹّے بٹّے ہیں۔ وہ آگ لگا رہے ہیں تو یہ آگ بھڑکا رہے ہیں — وہ ایک ماچس کی تیلی جلاتے ہیں تو یہ اس پر مٹّی کا تیل چھڑک دیتے ہیں —' میں غصہ میں تھا — مگر سب ملے ہوئے — سب ایک ہی سیاست، ایک ہی کھیل کے علمبردار — کسی کو عام آدمی سے کوئی مطلب نہیں۔ سب کے سب اپنی سیاسی روٹیاں سینکتے ہیں اور دیکھ لینا نور محمد......'

میرے لفظوں میں آگ روشن تھی — 'تاریخ ان لوگوں کو کبھی معاف نہیں کرے گی۔ ان ملک دشمنوں کو — وہ چاہے مسلمان ہوں یا ہندو اگر کچھ برا ہوتا ہے تو اسمیں ان دونوں جماعتوں کا برابر کا رول ہوگا — اندر ہی اندر دونوں طبقے کے لوگ اس سازش کا حصہ بنے ہوئے ہیں......'

میں نے زور دیا — 'اگر کچھ برا ہوتا ہے تو یقیناً یہ ایک ڈیل ہوگی نور محمد۔ ایک سیاسی ڈیل اور اسے انجام دینے والے ہوں گے یہی مسلم رہنما، جو آج گکرمتّے کی طرح بیانات دیتے پھر رہے ہیں۔ خدانخواستہ کچھ ہوا تو پھر دیکھنا — یہ لوگ پورے منظر نامہ سے کس طرح غائب ہو جاتے ہیں —'

نور محمد نے جھرجھری لی......

'سیاسی ڈیل......؟'

میں معنی خیز انداز میں مسکرایا — ایسی ہی ایک ڈیل پارٹیشن کے وقت ہوئی تھی۔ اور ایسی ہی ایک ڈیل اب ہوگی اور اس میں دونوں فرقے کے لیڈران فائدہ اٹھائیں گے......

'آپ صحیح کہتے ہیں......' نور محمد نے اثبات میں سر ہلایا......'

لیکن میرے غصے کا لاوہ بھڑک چکا تھا — آزادی کے بعد تو یہ سب نہیں ہونا چاہئے تھا نور محمد — ایک کو پاکستان چاہئے تھا اور ایک کو ہندوستان — جاتے جاتے انگریزوں نے ایک ملک کے ٹکڑے کر دیئے — بن گیا پاکستان...... لے کے رہیں گے پاکستان' کے نعروں کو ٹھنڈک مل گئی۔ پاکستان — ایک اسلامی ملک۔ لیکن کیا ہوتا رہا اس اسلامی ملک میں؟ عامرانہ حکومت کی اصل باگ

ڈور تو ملاؤں کے ہاتھ میں رہی۔ اردو بولنے والے مہاجر کہلائے۔ زبان کے جھگڑے شروع ہو گئے— پنجابی، بلوچی، سندھی، بنگالی...... دنیا بھر کی زبانیں— اور پھر کیا ہوا نور محمد— ایک اور تقسیم— پاکستان سے ایک اور ملک نکل آیا۔ بنگلہ دیش— ایک اور اسلامی ملک...... یہ وہاں اسلام اسلام چیختے رہے تو کیا ہوا— اس کا خمیازہ پڑوسی ملک کو بھگتنا پڑا۔ اور اسی کے نتیجے میں وشو ہندو پریشد جیسی جماعتیں ہمارے سامنے آئیں۔ بھگوا چولوں کی الگ الگ جماعتیں— اور ان جماعتوں کے جنم داتا— مجھے پڑوسی ملکوں کے اسلامی نعرے ہی لگتے ہیں۔ اگر یہاں کے مٹھی بھر لوگ ایک ایسے ملک کا تصور کرتے ہیں، جہاں صرف ان کی چلے، جہاں صرف ان کی حکومت ہو تو آخر اس خیال کا جنم داتا کون ہے— ؟ دراصل یہ اسلامی ملک کے چیتھڑے، نعروں کے ردّعمل کے طور پر نکلی ہوئی پارٹیاں ہیں اور ایسا تو ہونا ہی تھا نور محمد— اور وہاں کیا ہو رہا ہے جہاں اسلام اسلام کی دھوم مچی ہے؟ لڑکیوں کو داسی بنایا جا رہا ہے۔ اسلام کو ۱۵ ویں صدی میں لے جانے کی تیاری مکمل ہے۔ اور آپ ڈھنگ سے ایک محبت بھی نہیں کر سکتے— '

رقیہ دوبارہ چائے لے کر آ گئی تھی۔

'بھابھی شکریہ، اتنا کہہ کر نور محمد نے چائے کی پیالی ہونٹوں سے لگائی— رقیہ ایک بار پھر واپس لوٹ گئی تھی—

میں ابھی بھی اس دوغلی سیاست میں گم تھا— 'نور محمد، ہزار گالیاں دے دو لیکن پھر بھی۔ یہاں جمہوریت ہے— مسلمانوں کو سہارا دینے والے ہزاروں ہاتھ— اس لیے ان دو ہاتھوں کی پرواہ نہ کرو جو نفرت کی کھیتیاں کر رہے ہیں۔ ہزاروں لاکھوں لوگ ایسے ہیں جو مسلمانوں کی حمایت میں کھل کر سامنے آ جاتے ہیں۔ اخبار سے میڈیا تک— اور یہ کوئی کم بات نہیں ہے نور محمد— ایسا صرف اسی ملک میں ممکن ہے— '

'آپ ٹھیک کہتے ہیں بھیّا......'

ایک بار پھر موضوع تبدیل ہو گیا تھا—

نور محمد بتا رہا تھا— مجھے رات اور رات کے احساس سے ڈر لگتا ہے بھیّا— جب وہ جسم کے کپڑے پھینک کر بیہوشی کے عالم میں اپنا جسم میرے جسم پر ڈال دیتی ہے...... میں اسے مشکل سے الگ کرتا ہوں۔ بالکنی میں آجاتا ہوں۔ ساری رات ٹہلتا رہتا ہوں...... آپ بتا سکتے ہیں بھیّا...... یہ کیا ہے۔ یہ کیسا امتحان ہے؟ اور یہ امتحان مجھ سے ہی کیوں لیا جارہا ہے......‘

’اب یہ سب سوچنا بند کرو نور محمد۔ جتنا سوچو گے، اتنا ہی ذہن پریشان ہوگا— بس یہ سوچو کہ اللہ نے ایک معذور بچی کی ذمہ داری تمہارے سپرد کی ہے اور تم یہ ذمہ داری نبھا رہے ہو......؟

اس نے سر جھکا لیا—

چائے کے کپ خالی پڑے تھے—

نور محمد نے اجازت مانگی— اب دیر ہو رہی ہے بھیّا۔ اب چلوں گا۔ وقت ملا تو جلد آنے کی کوشش کروں گا—‘

●●

(۵)

نور محمد کے جانے کے بعد رقیہ نے پوچھا— کیا بات ہے۔ آپ دونوں بیحد سنجیدہ لگ رہے تھے۔

میں نے رقیہ کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ لیکن نور محمد کو لے کر خیالوں کے نئے دروازے وا ہو رہے تھے۔ نادرہ کے انتقال کے بعد ہم نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ وہ شادی کرلے۔ اپنے لیے نہیں تو نگار کے لیے...... لیکن نور محمد کسی بھی صورت شادی کی بات سننا گوارہ نہیں کرتا تھا۔ وہ نادرہ کی محبت میں اب بھی پاگل پن کی حد تک گرفتار تھا اور اس لیے وہ نگار کو کسی بھی

طرح کی تکلیف دینے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

لیکن ایک سوال جو بار بار مجھے پریشان کر رہا تھا کہ کیا اسے کبھی کسی بھی طرح کی جنسی طلب پریشان نہیں کرتی ؟

اور اس سے بھی بڑا ایک سوال تھا۔ کیا اس عمر میں جنسی خواہش کا خیال بھی لانا کوئی گناہ ہے؟

کیا کوئی جوان آدمی اپنی جنسی خواہشات کا قتل کر کے زندگی گزار سکتا ہے؟

یہ سچ ہے کہ نگار کے لیے اس نے اپنی قربانی پیش کی تھی مگر آخر ہے تو وہ ایک انسان— ایک مرد— کیا وہ جنسی خواہش کے بغیر یہ پوری زندگی گزار سکتا ہے؟

نادرہ کا جب انتقال ہوا تب اس کی عمر ہی کیا تھی...... نگار صرف سات سال کی تھی— اور اس عمر میں تو جنسی طلب اپنے شباب پر ہوتی ہے— مجھے نور محمد سے ہمدردی تھی— اپنی جنسی طلب کو سلا کر بیٹی کے لیے پوری زندگی وقف کر دینا کوئی کھیل نہیں۔ لیکن نور محمد نے یہ کر دکھایا تھا—

اور یہ کوئی آسان کام نہیں تھا—

میں مسلسل جنسی اخلاق کے ہر پہلو کو لے کر غور وخوض کر رہا تھا— اسلامیات کے فلسفے میرے سامنے روشن تھے۔

'اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ھے کہ اس نے تمھارے لیے تمھارے جنس کی عورتیں بنائیں۔ تاکہ تم کو ان کے پاس آرام ملے اور میاں بیوی میں محبت بڑھے—'

اور اس لیے اسلام میں نکاح کو سنت کا درجہ دیا گیا ہے— اور تجرد فلسفے کے لوگوں کو گمراہ خیال کیا جاتا ہے۔ کتنی عجیب بات ہے جس چیز کے بغیر انسان رہ نہیں سکتا، زمانہ قدیم میں اسے فحش قرار دیا جاتا تھا— اور جنسی اختلاط کو انسانی زوال کا سبب کہا جاتا تھا۔ اس زمانے میں ایسا عقیدہ عام تھا کہ میاں بیوی بھی ایک دوسرے سے دور رہیں اور جسمانی طور پر کوئی رشتہ نہ رکھیں۔ ایسے لوگ

تو زمانہ قدیم کی پیداوار تھے۔لیکن اس نئے زمانے میں......

مجھے نور محمد کی یاد آ رہی تھی...... کیا جسمانی خواہشوں کو مردہ کر دینا آسان ہے......؟ اپنی معذور بیٹی کے لیے ہی سہی، اس نے اپنے سارے احساس کو مارڈالا تھا......

کیا معذور بیٹی کی موجودگی میں اس کے یہاں کوئی جنس مخالف نظریہ پیدا ہو گیا تھا—؟

مثال کے لیے اس نے خود کو سمجھایا ہو—زدوکوب کیا ہو کہ یہ راستہ اس کا نہیں—اور نفس کو مارتے ہوئے اس نے اپنے اندر کے اس انسان کا گلہ گھونٹ دیا ہو، جسے کسی لمحے جنسی طلب کی ضرورت محسوس ہو سکتی ہو—

مجھے یاد آیا، برٹرنڈ رسل نے بھی ایسے ہی نظریے کے بارے میں اپنی کتاب میں لکھا تھا— ایسے علاقے جہاں عیسائیت اور بدھ مت کے ماننے والے تھے— یہاں رہبانیت کی تعلیم دی جاتی— جنسی تعلقات کو گناہ تسلیم کیا جاتا—اور اسے انسانی تباہی کا موجب قرار دیا جاتا— تب ایسے کتنے ہی روحانی پیشوا تھے جو تجرد کی حمایت کرتے تھے۔عورتوں کے اس لیے اس زمانے میں Chestity جیسی چیزیں ایجاد ہوئیں— کیونکہ یہ سمجھا جاتا تھا کہ مرد جہاں اپنی خواہشات پر کنٹرول کر سکتے ہیں، عورتیں نہیں کر سکتی—

لیکن کیا آج کے مہذب دور میں اس طرح کی باتوں کے بارے میں سوچا بھی جا سکتا ہے؟ دنیا جیٹ رفتار سے اڑ رہی ہے۔معاشرے اور سماج میں نت نئی تبدیلیاں پیدا ہو رہی ہیں— عورتوں کے بارے میں حقارت آمیز نظریات کا چلن بند ہوا— عورتیں ریس میں مردوں سے زیادہ ترقی کرتی ہوئی آگے بڑھ رہی ہیں— جبکہ ایک زمانے میں عورتوں کو مکمل انسان تصور ہی نہیں کیا جاتا تھا—اور یہ بھی کہا جاتا تھا کہ عورت جنت میں داخل نہیں ہو سکتی—

لیکن اب......

مہذب وقت نے دونوں کو یکساں ایک مقام پر لا کھڑا کیا—اس لیے بھی کہ دونوں ایک دوسرے کی ضرورت تھے۔کیا کوئی اس ضرورت کے بغیر رہ سکتا ہے؟

مجھے بار بار نور محمد کا خیال آ رہا تھا......نور محمد کی باتیں دھماکے کی طرح ذہن میں گونج رہی تھیں......

کہیں تیز ہلچل تھی......

کہیں کچھ ٹوٹ رہا تھا......

کہیں کچھ نیا بر آمد ہونے والا تھا......

میں شکوک وشبہات کی اس دنیا میں جاتے ہوئے خوفزدہ تھا، جہاں میرے احساس برف کی طرح یخ ہو جاتے تھے—

نگار کا چہرہ آنکھوں کے پردے پر لرز رہا تھا......

اور مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ میں تہذیب واخلاق کی اس نئی کتاب کے اس صفحے کو کھول سکوں جہاں ایک جوان بیٹی، اپنے باپ کے ساتھ سونے کے لیے مجبور ہے......؟

ذہن میں مسلسل دھماکے ہو رہے تھے......

کیا کسی لمحے رشتوں کے یہ باریک دھاگے ٹوٹ سکتے ہیں......؟

شاید اس مقام سے آگے سوچنا میرے بس کی بات نہیں تھی—

●●

شہر کی فضا بگڑ گئی تھی—

صورتحال پچھلے کئی دنوں سے خراب چل رہی تھی۔ رام جنم بھومی کو لے کر وشو ہندو پریشد کے لوگوں نے ایک جلوس نکالا تھا۔ جلوس پر پتھراؤ کی خبر آئی تھی— اب یہ پتھر چلانے کی شرارت جس کسی نے بھی کی ہو، مگر شہر کی حالت نازک ہوگئی تھی—

دیکھتے ہی دیکھتے آس پاس کی ساری دکانیں بند ہوگئیں—

شٹر گر گئے—

کچھ مقامی لوگوں کی دکانیں بھی جلادی گئی تھیں۔

رات کے آٹھ بجے تک خبر آگئی کہ پولس نے صورت حال پر قابو پالیا ہے۔ یہ امید افزا خبر تھی—

رات کے ۸ بجے نور محمد کا فون آیا تھا—

'یہاں کے حالات اب بھی اچھے نہیں—'

'بہتر یہ ہے کہ افواہوں پر دھیان مت دو—'

'پولس گاڑیاں گشت کر رہی ہیں— آج میرا ایک بھتیجا آیا ہے— انوار— نوجوان ہے۔ کالج میں پڑھتا ہے۔اسے یہاں آنے میں بہت پریشانی ہوئی—

'لیکن تم نے تو کبھی اپنے اس بھتیجے کے بارے میں......؟

'دور کا رشتہ دار ہے۔ یہ لوگ گاؤں میں بس گئے تھے— ابھی دو چار دن یہیں رہے گا......'

'لیکن نگار......

'میں نے اسے سب بتا دیا ہے۔ سیڑھیوں کے اوپر والا ایک کمرہ اسے دیا ہے— اور خبردار کر دیا ہے کہ وہ بس اپنے کام سے کام رکھے۔ نیچے اترنے یا کچھ دیکھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے......'

مجھے کچھ جلنے کی بو آرہی تھی— میرا دل کہہ رہا تھا، یہ معاملہ اتنا سیدھا نہیں جتنا کہ نور محمد بتا رہا ہے......

'کیا تمہیں لگتا ہے؟' نگار اس کی موجودگی کو قبول کرلے گی؟ اگر اس پر ایک انجان آدمی کو دیکھ کر پھر سے دورہ پڑ گیا تو......؟

'کیا کروں بھیّا— سارے زمانے سے تو دشمنی مول لے لی ہے— نہ کوئی اپنا نہ کوئی غیر— کوئی رشتہ دار بھی میرے یہاں نہیں آتا— اب یہ گاؤں کے رشتے سے ہے۔ یہاں کوئی جاننے والا نہیں— یہاں سے اسے دلّی جانا ہے۔بس ایک ہفتہ کی بات ہے......'

'لیکن ایک ہفتہ تک کیا وہ کمرے میں بند رہے گا؟ نور محمد، مجھے لگتا ہے تم اسے روک کر کوئی خطرہ تو مول نہیں لے رہے.....'

'میں نے بھی اس بارے میں سوچا تھا بھیا— بڑی مشکل سے اسے سمجھایا ہے کہ وہ نیچے کسی بھی قیمت پر نہ اترے— کہیں جانا ہو تو میری موجودگی میں جائے— اور جب میں واپس آؤں، اسی وقت وہ بھی واپس آئے.....'

'ٹھیک ہے نور محمد— لیکن احتیاط لازمی ہے—'

نور محمد پھر شہر کا دکھڑا لے کر بیٹھ گیا تھا—

حالات اب بھی نازک تھے۔ پولس کی گشتی گاڑیاں سڑکوں پر ناچ رہی تھیں— شان اپنے کمرے میں اسٹڈی کر رہا تھا۔ اور رقیہ ایسے نازک وقت میں قرآن شریف لے کر بیٹھ جاتی— وہ کہتی تھی۔ اس سے ذہنی سکون ملتا ہے—

لیکن نور محمد سے گفتگو کرنے کے بعد مجھے اب نگار کی فکر ہو رہی تھی— مجھے نور محمد پر غصہ آ رہا تھا— سب کچھ جانتے ہوئے بھی آخر اس نے اپنے بھتیجے کو اپنے یہاں رکنے کی اجازت کیوں دی؟

مگر شاید میرے شبہات بے وجہ نہیں تھے۔ محض دو دن بعد ہی مجھے اپنے سوالوں کا جواب مل گیا تھا—

●●

شہر کی حالت اب بھی نازک بنی ہوئی تھی— ہندو اور مسلمانوں میں اس کا شدید ردّ عمل تھا— نتیجہ کے طور پر شہر افواہوں کا گڑھ بنا ہوا تھا— مجھے سب سے زیادہ فکر اس بات کی تھی کہ فساد کے اس نئے موسم کا سب سے زیادہ اثر نئی نسل کے لوگ قبول کر رہے تھے۔

اور اس واقعہ کے ٹھیک تیسرے دن صبح ہی صبح گھبرایا ہوا نور محمد میرے سامنے تھا—

صبح کے ۸ بج رہے تھے۔ دکانیں بند تھیں۔ سڑک پر گاڑیوں کا چلنا بھی ابھی شروع نہیں ہوا تھا— صبح ہی صبح نور محمد کو دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ ضرور کوئی نہ کوئی خاص بات ہوئی ہے۔ میرا دل

دھک دھک کرنے لگا تھا—

میں اسے لے کر ڈرائنگ روم میں آ گیا۔ اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں جیسے ساری رات بے خوابی میں گزاری ہو— بال بھی الجھے ہوئے تھے۔ وہ چہرے سے کافی پریشان نظر آ رہا تھا—

کیا بات ہے؟

'میں نے اسے بھگا دیا.....' وہ گھبرایا ہوا تھا—

'کسے؟'

'ارے وہی......انوار کو......میرا رشتہ دار؟

اب چونکنے کی باری میری تھی—

'لیکن تم نے تو کہا تھا کہ وہ ابھی ایک ہفتہ تک تمہارے گھر ہی رہے گا—'

'میں نے بھگا دیا— 'اس کی سانس پھول رہی تھی۔ انتہائی کمینہ نکلا وہ...... پتہ نہیں میری بھی کیا شامت آئی تھی۔ جو گاؤں کا رشتہ دار سمجھ کر اسے اپنے یہاں ٹھہرا دیا—

'مگر ہوا کیا...... پہلے اطمینان سے بیٹھ جاؤ— سانسیں درست کرو۔'

'میں نے اسے بھگا دیا—'

وہ بار بار یہ جملہ دہرا رہا تھا—

'آپ کو انسانوں کی زیادہ پرکھ ہے بھیّا— مجھے نہیں— آپ نے بھی سمجھایا تھا مجھے۔ بس یہ بات میری سمجھ میں ہی نہیں آئی۔ اس کی نوجوانی پر پسیج گیا کہ بیچارہ یہاں کہاں ٹھہرے گا— مگر یہ آجکل کے لونڈے......'

اس کے منہ سے جھاگ نکل رہی تھی۔

'میں نے اسے بھگا دیا اور سیدھا یہ خبر دینے آپ کے یہاں آیا ہوں۔ میں نے موضوع بدلنے کی کوشش کی۔

'اچھا بتاؤ— تم نے ناشتہ کیا؟'

'نہیں—'

'پھر سب سے پہلے ناشتہ کرلو—' میں رقیہ کو آواز دیتا ہوں......

'ٹھیک ہے بھیّا—'

وہ صوفے پر دھنس گیا۔ مگر اس کا چہرہ ابھی بھی غصہ سے سرخ ہو رہا تھا—وہ بار بار صوفے پر کروٹیں بدل رہا تھا۔ اور اس سے بھی اس کی بے چینی کا اندازہ لگایا جاسکتا تھا۔

●●

ناشتہ کے بعد میں اسے لے کر اپنے چھوٹے سے کمرے میں آگیا— میں دیر تک اس کے چہرے کا جائزہ لیتا رہا—

'سب خیریت تو ہے نا......نور محمد......'

'نہیں بھیا......'

'نگار کیسی ہے......'

میرے اس سوال پر اس کے آنسو نکل آئے۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا— میں نے گھبرا کر نور محمد کے کندھے پر ہاتھ رکھا—

'نہیں نور محمد—اس طرح نہیں روتے—بتاؤ تو سہی نگار کو کیا ہوا؟ کیسی ہے وہ......'

وہ اپنے آنسو پونچھ رہا تھا—اس کے چہرے پر تذبذب کے آثار تھے—

'اب میں آپ کو کیسے بتاؤں بھیّا—میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے—'

پہیلیاں مت بجھاؤ—اور جو بھی ہوا ہے مجھے صاف صاف بتاؤ' جانے کیوں میں اندر ہی اندر ڈر محسوس کر رہا تھا—

'ٹھیک ہے بھیّا—'

نور محمد تن کر کرسی پر بیٹھ گیا—

وہ انتہائی لاخیرا ثابت ہوا— میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ گاؤں کے لوگ اتنے گئے گزرے بھی ہوتے ہیں۔ پرانی رشتہ داری تھی۔ میں خود بھی بچپن میں کئی بار اس کے گاؤں جا چکا تھا— انتہائی شریف لوگ— خوب خاطر تواضع کرنے والے— اس کا باپ بھی انتہائی شریف آدمی تھا۔ پچھلے سال شہر آ رہا تھا تو ایک ٹرک نے کچل دیا— بڑا بھائی اب بھی کھیتی کرتا ہے اور یہ انوار...... یہ پڑھ لکھ کر شہر میں نوکری کرنا چاہتا ہے— مرنے سے پہلے تب نادرہ زندہ تھی، اس کا باپ ملنے آیا تھا— اس نے انوار کا ذکر چھیڑا تھا مجھ سے— یہ بھی کہا تھا کہ اگر ممکن ہو تو میں اس کی مدد کر دوں۔ میں نے تو یتیم بچہ سمجھ کر اپنے گھر میں جگہ دی تھی۔ مگر ایسے بچے نمک حرام ہی رہیں گے بھیا— ساری پڑھائی لکھائی ایک طرف— ان کے دل میں شیطان کا بسیرا ہے...... اس دن......

وہ صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا— وہ کمرے میں ٹہل رہا تھا— کسی لمحہ بھی اسے چین میسر نہیں تھا— آپ تو جانتے ہیں، میرے گھر میں کوئی نہیں ہے— اور مجھے کام بھی کرنا ہوتا ہے— پہلا دن ٹھیک ٹھاک گزر گیا— میں نے ناشتہ بنایا— اس کے کمرے میں جا کر ناشتہ دیا— پھر کہا، میں نکل رہا ہوں۔ اگر اسے بھی نکلنا ہے تو میرے ساتھ چلے— وہ دو منٹ میں تیار ہو گیا— نگار کو ناشتہ کرانے کے بعد میں خاموشی سے اسے لے کر باہر نکل گیا— اور یہ بھی کہہ دیا کہ میں شام ۷ بجے سے پہلے واپس نہیں لوٹوں گا— اس لیے بہتر ہے کہ اس وقت تک وہ بھی کہیں گھومے، سیر کرے اور اگر آ جائے تو گھر کے باہر ہی میرا انتظار کرے—'

نور محمد نے میری طرف دیکھا— اس بار وہ دوبارہ صوفے پر بیٹھ گیا— پہلا دن ٹھیک ٹھاک گزر گیا۔ جیسا میں نے کہا تھا، اس نے ویسا ہی کیا۔ میں ۷ بج کر دس منٹ پر گھر آیا تو وہ مجھے وہیں باہر انتظار کرتا ہوا مل گیا— میں خوش بھی تھا کہ گاؤں والوں میں اب بھی تہذیب اور اخلاق باقی ہے— پھر دروازہ کھول کر، میں خاموشی سے اس کو اس کے کمرے میں لے آیا— اور دوبارہ تنبیہ کی کہ اسے نیچے اترنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اور اس رات بھی اس نے وہی کیا— مگر اس کے ٹھیک دوسرے دن......

نور محمد نے گہری سانس لی۔ دوسرے دن اس نے بیماری کا بہانہ بنا دیا۔ مجھ سے بولا کہ وہ آج اپنے کمرے میں آرام کرے گا — اور اسے میری شرطیں معلوم ہیں۔ یعنی یہ کہ وہ کسی بھی قیمت پر نیچے نہیں اترے گا...... مجھے اس کی بات مناسب لگی اور دیکھا جائے تو اس سیدھی سادی معمولی سی بات میں کہیں بھی چھل یا کپٹ کا کوئی بھی پہلو نہیں تھا...... اس لیے میں نے کھانے کی کچھ ضروری چیزیں لا کر اس کے حوالے کیں — اور مطمئن ہو کر گھر سے باہر نکل گیا — جاتے ہوئے بھی میں نے رک کر اسے تنبیہ کی تھی — جتنا بھی ضروری کام ہو۔ کوئی دروازہ ہی کیوں نہ کھٹکھٹائے مگر اسے کسی بھی قیمت پر نیچے نہیں اترنا ہے — اور انوار نے اپنی رضا مندی دے دی تھی کہ وہ بالکل ایسا ہی کرے گا — اور میں مطمئن ہو کر اکیلے ہی گھر سے باہر نکل گیا — اور یہ اسی دن شام کا واقعہ ہے...... میں اس دن ذرا جلدی آ گیا تھا۔ چھ بجے ہوں گے جب میں نے دروازہ کھولا...... اندر قدم رکھتے ہی مجھے احساس ہو گیا کہ کچھ گڑبڑ ہے...... میں اپنے کمرے کی طرف بڑھا اور اچانک چونک گیا۔ دروازے کے باہر ہی نگار ننگ دھڑنگ گری ہوئی حالت میں پڑی تھی — بالکل برہنہ — جسم پر ایک بھی کپڑا نہیں۔ وہ بیہوش تھی۔ میں کافی دیر تک اسے ہلاتا ڈلاتا رہا۔ اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے اور کمرے سے چادر لانے گیا تو دماغ خراب ہو گیا۔ کمرے کی ساری چیزیں زمین پر پھیکی ہوئی تھیں — جیسے نگار کو کسی بات پر غصہ آیا ہو اور اس نے ایک ایک کر کے چیزوں کو توڑنا شروع کیا ہو...... شیشے کا گلاس — گلدستہ — فریم کرائی ہوئی تصویریں — زمین پر شیشے کی کرچیاں بکھری ہوئی تھیں۔ میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے کمرے کا منظر دیکھ رہا تھا — میرا دل کہہ رہا تھا۔ کچھ ہوا ہے — نگار کے ساتھ کچھ ہوا ہے۔ ورنہ ایسا اس نے کبھی نہیں کیا تھا — تو کیا انوار کمرے سے نیچے اترا۔ یا پھر اس نے نگار کے ساتھ کوئی بدتمیزی کرنے کی کوشش کی......؟ بھیّا، میرا دل دھک دھک کر رہا تھا — کچھ دیر میں نگار کو ہوش آ گیا۔ ہوش آتے ہی وہ پاگلوں کی طرح مجھ سے لپٹ گئی — کسی طرح میں اسے لے کر بستر پر آیا — اسے بستر پر لٹایا — دودھ گرم کیا اور دودھ میں نیند کی گولی ملا دی — نگار نے بڑی مشکل سے دودھ گلے کے نیچے اتارا — اسے لٹا کر میں غصے کی حالت میں

سیڑھیاں چڑھتا ہوا اس کے کمرے میں آیا تو وہ کمرے میں ٹہل رہا تھا......

'پھر......؟'

وہ مجھے دیکھ کر ڈر گیا تھا— مجھ پر جنون سوار تھا۔ سوال کرنے سے پہلے ہی میں نے اس پر لات جوتے برسانے شروع کر دیئے۔ میرے منہ سے بھدی بھدی گالیاں نکل رہی تھیں— وہ چیخ رہا تھا— میں نے کچھ نہیں کیا— کچھ نہیں کیا— مجھ پر جیسے اسے مارنے کا بھوت سوار تھا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے مجھے ہوش آ گیا— خدانخواستہ انجانے میں اسے کچھ ہو گیا تو نگار کا کیا ہوگا— بس بھیا، اس خیال کا آنا تھا کہ میں نے اسے پیٹنا بند کیا۔ میں نے غصہ میں پوچھا—

تم نیچے گئے تھے؟

'ہاں—'

کیوں گئے تھے؟ میں زور سے چلّایا—

'بھوک لگی تھی—'

میں نے کھانے کا سامان تو رکھ دیا تھا— پھر بھوک کیوں لگی— میں گلہ پھاڑ کر چلا رہا تھا۔

'غلطی ہوگئی—'

'غلطی نہیں— جرم کیا ہے تم نے— گناہ کیا ہے— کیا تم نے میری بیٹی کو دیکھا—؟'

'ہاں......' اس کا لہجہ ڈرا ڈرا تھا—

'تم نے اس کے ساتھ کوئی بدتمیزی کرنے کی کوشش تو نہیں کی؟'

'نہیں—' وہ رونے کا ناٹک کر رہا تھا۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔ بس نیچے اترنا میری غلطی تھی— میں نے کچھ نہیں کیا—

'لیکن نیچے کیوں اترے—'

مجھ پر ابھی بھی غصے کا بھوت سوار تھا—

وہ خوف سے کانپتا ہوا رو رہا تھا— اور کہہ رہا تھا۔ وہ صبح ہوتے ہی چلا جائے گا— یہ جگہ

چھوڑ دے گا—'

نور محمد نے گہری سانس لی— صبح ہوتے ہی اس نے گھر چھوڑ دیا۔ مگر بھیّا— میرا دل کہہ رہا ہے کہ اس نے نگار کے ساتھ کوئی نہ کوئی بدسلوکی ضرور کی ہے......

'تم یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کیسے کہہ سکتے ہو......؟

'وثوق کے ساتھ نہیں—' اس نے سہمے ہوئے انداز میں سر کو جنبش دی۔ مگر میرا اندازہ ہے۔ ہوش میں آنے کے بعد نگار مجھے کچھ بدلی بدلی سی لگ رہی ہے—

'بدلی بدلی سی...... سے تمہاری کیا مراد ہے......؟

'جیسے وہ گہرے سناٹے میں ہو...... جیسے اس کے اندر کچھ جاگ گیا ہو...... کچھ ایسا جواب تک نہیں جاگا تھا......'

وہ کہتے کہتے ٹھہر گیا—

'میں پہیلیاں نہیں سمجھتا نور محمد— اپنی بات کی وضاحت کرو—'

'مجھ سے یہ وضاحت نہیں ہو پائے گی بھیّا— ہر بات کی وضاحت ممکن نہیں ہے—'

وہ صوفے سے ایک بار پھر اٹھ کھڑا ہوا تھا—

'مگر......'

'مگر کیا......؟'

'میرا دل کہتا ہے، اس سور کے بچے نے اس کے ساتھ کچھ نہ کچھ زبردستی کرنے کی کوشش ضرور کی تھی۔

'ہو سکتا ہے تمہارا وہم ہو......'

'نہیں بھیّا—'

نور محمد کے چہرے پر سلوٹیں پڑ گئی تھیں— اٹھارہ سال میں پہلی بار اس کے اندر ایک تبدیلی دیکھی ہے۔ خاص کر اس کی آنکھوں میں— یہ آنکھیں ہمیشہ ایک سی رہتی تھیں— بے

رنگ — جیسے ان آنکھوں میں کہیں کوئی جذبات نہ ہو۔ مگر اس دن...... اس کی آنکھیں بے رنگ نہیں تھیں......

میرے دماغ میں ایک بار پھر دھماکے ہونے لگے تھے —

''تم جانتے بھی ہو، تم کیا کہہ رہے ہو نور محمد......؟ تمہارے ہوش و حواس تو سلامت ہیں نا — ارے جس بچی میں سمجھنے اور بوجھنے کی کوئی صلاحیت نہ ہو، اس میں کوئی بھی رنگ کیسے پیدا ہو سکتا ہے؟ بچپن سے معذور لڑکی، جس نے آج تک نظر اٹھا کر اپنے اطراف کا جائزہ بھی نہیں لیا، اس کے اندر کچھ بھی، کوئی بھی حرارت، کوئی بھی تپش، کوئی بھی جادو کیسے جاگ سکتا ہے — ؟ یہاں کے اچھے اچھے ڈاکٹروں سے لے کر جھاڑ پھونک، ملا مولویوں، تانترک، آستانے سے چوکھٹ تک تم اسے لے کر کہاں کہاں نہیں بھٹکے نور محمد — ؟ ایمان سے کہنا، کبھی زندگی کی کوئی لہر، کوئی ترنگ اسمیں پیدا ہوئی کیا؟ ارے اس کی پلکیں تک ٹھہری ہوئی تھیں۔ انسانی احساس و جذبات سے عاری — جس کا جسم عمر کی ان منزلوں تک صرف ایک گونگا بہرہ جسم رہا ہو، وہاں کوئی ہلچل، کسی جنبش، کوئی ترنگ یا کسی لہر کا تصور بھی کیسے کیا جا سکتا ہے نور محمد......؟'

'قدرت؟'

نور محمد میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں بھی یہی سوچتا تھا بھیّا — اور آپ سے کہیں زیادہ یہ سوچتا تھا۔ میں تو اس کے پل پل کا حساب رکھتا تھا۔ وہ کب جاگی ہے۔ کب سوئی ہے۔ ہگنے سے موتنے تک — جسم دھلانے سے لے کر ٹوائلٹ جانے تک — اس کے ساتھ کھیلنے سے لے کر اس کے لباس بدلنے تک — میں تو اس کے اک ایک جاگتے لمحے کو اپنی آنکھوں میں اتارتا رہتا تھا کہ کیا پتہ، کب اس کی پتلیوں میں ہلچل ہو۔ کب اس میں زندگی کی کوئی لہر، کوئی ترنگ جاگے — مگر — مردہ رہی وہ۔ بے حس — مردہ۔ اور اب مجھے اس لفظ کی ادائیگی میں کوئی دشواری نہیں ہے بھیّا — کیونکہ نگار کا یہی سچ ہے — پیدائش سے ۱۸ سال کی عمر تک ایک جیتی جاگتی لاش اور میں ہر لمحہ اس لاش میں چنگاری تلاش کرنے کی جستجو کرتا رہا — اور ہر بار ناامیدی ہاتھ لگتی رہی — دو خالی اور بے

حس آنکھیں—ان آنکھوں میں بے حسی کے سوا تھا ہی کیا—؟ کچھ بھی تو نہیں— مگر—

نور محمد سنجیدہ تھا— کچھ بدلا ہے بھیا— کچھ کچھ تبدیلی آئی ہے۔ اس کی بے رنگ آنکھوں میں ایک چمک دیکھی ہے میں نے—ایک تجسس—یہ تجسس اس میں آج تک جاگا ہی نہیں— لیکن انوار کی اچانک آمد اور اس کے جانے کے درمیان نگار میں ایک بدلاؤ آیا ہے—اور میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں...... کہ یہ پہلی بار ہوا ہے—اور یہ یقیناً یہ تبدیلی عام انسان کے بس کی بات نہیں ہے۔ نہ کسی ڈاکٹر کے، قدرت—

وہ سنجیدہ تھا—صرف اور صرف قدرت—یہ کارنامہ قدرت ہی دکھا سکتی ہے......'

کمرے میں خاموشی چھا گئی تھی...... مجھے اب بھی چین نہیں تھا۔ میری آنکھیں الجھ کر رہ گئی تھیں۔ نور محمد کی وہ بات اب بھی مجھے پریشان کر رہی تھی...... کہ ہر بات کی وضاحت ممکن نہیں ہے......اور یہاں اس کہانی میں صرف دو لوگ ہیں۔ ایک باپ اور دوسری اس کی بیٹی—اور یہ بیٹی کوئی غیر نہیں ہے— سگی بیٹی ہے۔ دراصل میں اندر ہی اندر نور محمد کے جنسی اخلاق کا تجزیہ کر رہا تھا— پیدا ہوتے ہی ہم عام انسانی اخلاق سے جنسی اخلاق تک کے پابند ہو جاتے ہیں۔ جیسے مخصوص اعضاء کو چھپانا، چھت پر نہیں جانا، عورتوں کے لیے ایک مخصوص شرم کا جاگنا، بیوی سے وفاداری، غیر عورتوں کی تاک جھانک سے بچنا— پیدا ہوتے ہی جہاں سماج، معاشرہ اور گھر اپنی تربیت میں ہمیں اس جنسی اخلاق کا پابند بناتا جاتا ہے— مگر آخر ہوتا کیا ہے؟ ایک دن یہ بت ڈھا جاتا ہے۔ ایک دن ہم اس جنسی اخلاق کے دائرے سے باہر نکل آتے ہیں۔ یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ بچپن سے میں ہی واحد انسان ہوں، نور محمد جس سے اپنا سب کچھ شیئر کرتا رہا ہے۔ شاید یہ انسانی مجبوری ہے کہ ہر شخص اس جہاں میں کم از کم ایک ایسا آدمی تلاش کر لیتا ہے، جس سے اپنا تمام دکھڑا بیان کر سکے—اور نور محمد نے یہی کیا— کچھ بھی نہیں چھپایا—میں نے نور محمد کو جنسی اخلاق کے اعلیٰ نمونہ کے طور پر دیکھا— مگر اس وقت......؟

کیا وہ کچھ چھپا رہا ہے—؟

مگر کیا چھپا رہا ہے......؟

اس کی آنکھوں میں الجھنوں کے اتنے سارے...... جالے کیوں ہیں؟

آخر ایسا کیا ہوا ہے، جو اسے کچھ چھپانے کی ضرور پڑ رہی ہے؟

میں ان سوالوں میں الجھا ہوا تھا۔

اور نور محمد ایک بار پھر بت کی مانند صوفے پر دھنس گیا تھا —

لیکن اب ان باتوں سے اس نے میرے اندر کے تجسس کو جگا دیا تھا۔ اور میں نے اس کے منہ سے سب کچھ سچ سچ اگلوانے کا فیصلہ کرلیا تھا —

اور شاید اسی لیے میں نے اپنا پہلا تیر اس کی جانب اچھالا —

'نور محمد — ادھر دیکھو — کیا تم آج پہلی بار مجھ سے کچھ چھپانے کی کوشش کر رہے ہو۔ اگر ایسا ہے تو میں یہ ضرور کہوں گا کہ مجھ سے ہمیشہ کی طرح کچھ بھی چھپانے کی ضرورت نہیں۔ کوئی بات کتنی بھی بری کیوں نہ ہو لیکن اگر آپ چھپاتے ہیں تو پھر اندر ہی اندر ٹوٹ جاتے ہیں — اور تمہیں فی الوقت ایسے بکھراؤ سے بچنے کی ضرورت ہے — یہ بھی ممکن ہے کہ اگر تم ایسا سوچتے ہو کہ سارے راستے بند ہیں تو ممکن ہے...... تمہاری گفتگو سننے کے بعد میں تمہیں بہتر راستے کے بارے میں بتا سکوں۔ صلاح و مشورے سے بند راستہ بھی کھل جایا کرتے ہیں نور محمد — لیکن یہ تم پر منحصر ہے کہ تم وہ بات مجھ سے شیئر کرتے ہو، یا چھپانا چاہتے ہو......'

'ٹھیک ہے......'

وہ ایک بار پھر صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ ٹہلتے ہوئے وہ میری میز کے پاس رکا — اور چونک کر اس نے ایک کاغذ اٹھا لیا — اور یہ وہی کاغذ تھا جس پر آڑی ترچھی لکیریں کھینچتا ہوا میں چونک گیا تھا — نور محمد گھما گھما کر آڑی ترچھی لکیروں کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا — لیکن اس بار ہونہہ، کہہ کر اس نے وہ کاغذ وہیں میز پر رکھ دیا —

اس نے آہستہ سے دریافت کیا — یہ کیا ہے......

میں نے آہستہ سے کہا — انسانی فطرت کو سمجھنے کی ایک ادنیٰ سی کوشش — اگر جنسی اخلاق کا سرچشمہ طبیعت اور فطرت ہے تو ایک دن قدرت بیحد سفاک بھی ہو سکتی ہے —'

وہ سر ہلا رہا تھا —

'زندگی ہر بار ایک پہیلی بن جاتی ہے بھیّا اور اس بار — ایک ایسی پہیلی کہ اس کے سارے سرے ہی الجھ گئے ہیں — میں قدرت کے فیصلے کے آگے بے بس اور لاچار ہوں اور سمجھ نہیں پا رہا کہ مجھے کون سا راستہ اختیار کرنا چاہئے۔ وہ جو قدرت نے میری آزمائش کے لیے تیار کیا ہے۔ یا وہ راستہ جو مخالف سمت میں جاتا ہے — شاید میں ٹھیک طرح سے ابھی آپ کو سمجھا نہیں پاؤں۔ یا پھر آپ میری حالت دیکھ کر کچھ کچھ اس سمت کی جانب بڑھ سکتے ہیں۔ لیکن جو کچھ ہو رہا ہے، وہ حیران کرنے والا ہے — اور قدرت کے اس جبر سے بڑھ کر کوئی دوسرا جبر ممکن ہی نہیں ہے —

اس کی آنکھیں گیلی تھیں اور وہ گہری سوچ میں گم ہو گیا تھا —

'آؤ — یہاں بیٹھو نور محمد — شاید تمہیں آسانی ہو۔ قدرت کا جبر ہر جگہ ہے۔ انسان سمجھتا ہے وہ قدرت سے کھیل رہا ہے جب کہ قدرت صرف تاک اور موقع کے انتظار میں رہتی ہے۔ سیلاب، زلزلہ...... موسم کی تبدیلی...... سب اس کے کرشمے ہیں اور یہی قدرت آہستہ آہستہ انسانی عادت و اطوار کو بھی بدلتی رہتی ہے...... میں اسے سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا — اس لیے غلط، صحیح، جائز، ناجائز کی کوئی تعریف انسانوں کے ہاتھ میں نہیں اور شاید اسی لیے انسانوں کو ایک اخلاقی دائرے میں رکھنے کے لیے قوانین بنائے گئے — اور یہی قوانین آہستہ آہستہ انسانی ضمیر کا ایک حصہ بن جاتا ہے — بعض موقعوں پر یہی ضمیر ہمیں کچوکے لگاتا ہے — لیکن یہ سماجی عادت و اطوار آج سے نہیں بلکہ ہمارے درمیان زمانۂ قدیم سے رائج ہیں — ان کے فائدے بھی ہیں لیکن ایک دن یہ ٹوٹ بھی جاتے ہیں نور محمد — اور جیسا کہ فرائیڈ نے کہا تھا، قدیم اخلاقی نظام کو بدلنے کی ضرورت ہے — اور اس کی جگہ نئے ماڈرن نظام کی ضرورت۔ اس کا اشارہ جنسی نظام کی طرف تھا، جسے سمجھنا آسان نہیں — اور جسے بندشوں میں، کسی قید میں نہیں رکھا جا سکتا۔ اور شاید اسی لیے سماج نے ہر بار

اس دائرے یا 'ٹابو' کی پیروی کی ہے، جس کے آگے ایک کھلا اظہار ہے اور جہاں تک جانے کی پابندی ناگزیر ہے — اور شاید اسی لیے کہا جاتا ہے کہ انسانی دماغ یا جسم کو سمجھنے میں ابھی برسوں لگیں گے یا یہ کہ — انسانی دماغ اور جسم کی بھول بھلیوں کو سمجھا ہی نہیں جاسکتا — جو چیز تمہارے دائرۂ اختیار سے باہر ہے، وہاں سوچو ہی مت۔ اس لیے جو کچھ بھی تمہارے اندر ہے، اسے بتاؤ — خود کو ہلکا کرنے کا موقع دو —'

'میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔ لیکن شاید اس وقت.....' وہ ٹھہر ٹھہر کر بول رہا تھا — مجھے ابھی اس پہلو کو اور سمجھنے کا موقع دیجیے — ابھی شاید میں نے خود کو اس بات کے لیے تیار نہیں کیا ہے — اور آپ بہتر طریقے سے میری نفسیات کا اندازہ لگا سکتے ہیں —'

نور محمد چلا گیا — میرے لیے ضروری تھا کہ میں اس موضوع پر سوچنے میں کسی طرح کی جلد بازی سے دور رہوں — اور اس لیے مجھے نور محمد کے دوبارہ آنے کا انتظار تھا —

(۶)

کبھی کبھی ہم مہلک ہتھیاروں سے زیادہ/
اپنے ضمیر سے مر جاتے ہیں،

اس بار وہ تین دنوں تک نہیں آیا — فون پر بھی کوئی رابطہ نہیں — اسکول کے کچھ مسائل تھے جس کے لیے میں نے بورڈ آف ڈائریکٹرس کی ایک میٹنگ بلائی تھی۔ اور اس کے علاوہ شان کا مسئلہ بھی تھا۔ شان کم گو تھا لیکن ایک لڑکی اس کی زندگی میں آچکی تھی۔ اور یہ بات کسی حد تک رقیہ کو ناگوار گزرتی تھیں۔ اس نے کئی بار اپنی ناراضگی کا کھلا اظہار کیا تھا — بچوں کے لیے یہ عمر پڑھنے کی ہوتی ہے۔

عشق کے لیے ساری زندگی پڑی ہے — اور میں اسے سمجھاتا تھا کہ عشق کرنے کی صحیح عمر یہی ہے — بعد میں عمر گزر جانے کے بعد عشق نہیں ہوتا — وہ جوان ہے — پڑھائی میں بھی سنجیدہ

ہے— اس لیے اس کی کسی بھی بات کو مسئلہ نہ بنائیے— اور میرا دل کہتا ہے، وہ کوئی غلط قدم اٹھا ہی نہیں سکتا۔

بابری مسجد اور رام جنم بھومی کا معاملہ کچھ زیادہ ہی ملک میں طوفان کھڑا کر رہا تھا۔ ملک ایک نئی سیاسی عبارت لکھنے میں مصروف تھا اور ادھر وقت کے تھپیڑے نور محمد کے ساتھ ایک نیا کھیل کھیلنے میں مصروف تھے—

شاید ایک عمر آتی ہے جب ہم سمٹ کر صرف ایک گھر تک محدود رہ جاتے ہیں— مجھے احساس ہے کہ میں آہستہ آہستہ نادرہ کو بھول رہا تھا— یا وقت گزرنے کے ساتھ اس کی یادیں بھی کمزور ہوتی جا رہی تھیں— جبکہ وہ سارے لمحے، جو اس کے ساتھ گزرے، وہ ابھی بھی مجھے پریشان کرتے تھے— مگر اب گھر کی ذمہ داریوں نے مجھے اپنا قیدی بنا لیا تھا—

مجھے تعجب تھا کہ وقت کے اتنے تھپیڑے سہنے کے بعد کوئی زندہ کیسے رہ سکتا ہے؟

مگر نور محمد زندہ تھا—

وقت کے سرد و گرم کو سہنے کی جو قوت میں نے اس میں دیکھی تھی، وہ کہیں اور نہیں دیکھی—

اور شاید اسی لیے مجھے اس کا انتظار بھی تھا—

لیکن میرے لیے سوچنے کی بات یہی تھی کہ آخر وہ کیا چھپانا چاہتا تھا— آخر ایسی کیا بات ہو سکتی ہے، جسے کہنے یا بتانے کے لیے اسے خود پر جبر کرنا پڑا—

لیکن کسی بھی نتیجے پر پہنچنے سے پہلے میں یہ سچ صرف اس کی زبان سے سننا چاہتا تھا—

تین دن تک اس کا کوئی فون نہیں آیا۔ ہاں چوتھے دن صبح سویرے ہی اس کا فون آ گیا—

’بھیا، کیا آپ گھر پر ہیں— میں آنا چاہتا ہوں۔‘

’آجاؤ—‘

میرے لیے اب اس سے ملنا بہت ضروری ہو گیا تھا—

●●

دس بجے وہ آ گیا— رقیہ کو چائے کے لیے کہہ کر میں اسے اپنے کمرے میں لے آیا— وہ دیر تک ریک میں رکھی میری کتابوں کو دیکھتا رہا۔ لیکن آج اس کے چہرے پر ایک خاص طرح کی طمانیت محسوس کی جاسکتی تھی— جیسے وہ کسی فیصلے پر پہنچ گیا ہو— ایسی باتیں دو صورتوں میں ممکن ہیں— ایک تو یہ کہ جب آپ کوئی صحیح سمت تلاش کرلیں۔ اور دوسرا یہ کہ جب آپ محسوس کریں کہ ایک طرف کھائی، دوسری طرف کنواں، اور آپ کو انہی دو میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہے، تب بھی، اس صورت میں فیصلے کی ایک نئی قوت پیدا ہو جاتی ہے—

چائے کے وقفے میں ہم اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ ملک کی صورتحال— لالو اور ملائم کی باتیں— اڈوانی کی رتھ یاترا سے لے کر اوما بھارتی، جوشی، ونئے کٹیار کی زہریلی باتوں تک— شاید وہ نگار تک آنے کا راستہ تلاش کر رہا تھا— اور یہ راستہ اسے میری بات نے مہیا کرایا تھا—

'نگار کیسی ہے؟ اس دن تمہاری باتیں کسی معمہ سے کم نہیں تھیں— تم کچھ بتانے والے تھے......؟

'جی—'

'یہ دنیا ہارنے والوں کے لیے نہیں ہے نور محمد— اور اسی لیے مجھے تم پر فخر ہوتا ہے— کیونکہ تم بری سے بری صورتحال میں بھی اپنے لیے راستہ تلاش کر لیتے ہو......'

'یہ بات نہیں جانتا—'

اس کی آواز درد میں ڈوبی تھی— میں اسے پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

'نہیں یہ سچائی ہے— ہیمنگ وے کے سمندر اور بوڑھے آدمی کی طرح...... وہ بوڑھا جو سمندر کی لہروں سے کشتی لڑ رہا ہے— انسان فاتح ہے اور اس لیے اسے دوسری مخلوقات سے زیادہ جینے کا حق حاصل ہے—

وہ خلاء میں دیکھ رہا تھا...... اس کی آنکھیں گہری فکر میں ڈوب گئی تھیں۔ اس دن...... جیسا

میں نے آپ کو بتایا......انوار کے بارے میں......'

وہ کہتے کہتے رک گیا تھا—اور جب دوسرے دن شام چھ بجے......میں نے تالہ کھولا اور میری بیٹی اپنے کمرے کے باہر برہنہ پڑی تھی—اور یقیناً یہ میرا شک نہیں تھا کہ اس نے کچھ تو بدسلوکی کی کوشش کی تھی— ممکن ہے وہ کسی بہانے نیچے آیا ہو—اور ممکن ہے اس نے میری بیٹی کو دیکھا ہو—اور ممکن ہے اس وقت بھی اسے کپڑوں کا کوئی ہوش نہ ہو—جیسا کہ عام طور پر وہ اپنے لباس سے بے ہوش ہی رہتی ہے......'

اس نے میری طرف دیکھا—میری غلطی یہ تھی کہ میں نے ایک نوجوان، ایک گرم خون پر بھروسہ کیا تھا، جو مجھے نہیں کرنا چاہئے تھا۔ خاص کر ایسے وقت میں جب پوری کوٹھی میں سوائے میری بیٹی کے کوئی نہیں تھا، مجھے اس پر بھروسہ کرنے کا حق ہی نہیں تھا۔ مگر—میں نے بھروسہ کیا اور ممکن ہے اس نے دست درازی کی کوشش کی ہو—دست درازی......'

وہ ایک لمحے کے لیے رکا— 'اور اپنے سامنے ایک انجان آدمی کو پاکر اس پر پھر سے دورہ پڑ گیا ہو—یا ممکن ہے اسکے باوجود......آپ سمجھ رہے ہیں نا بھیّا—ایک باپ کی لاچاری اور مجبوری کو سمجھئے......میں شاید اس سے زیادہ واضح الفاظ میں آپ کو نہ سمجھا پاؤں— مگر کچھ ہوا تھا—شاید اس کی چیخ سننے کے بعد بھی ممکن ہے......اس نے بیٹی کے ہاتھوں کو چھوا ہو—یا پھر......یہ بھی ممکن ہے کہ وہ بھاگ کھڑا ہوا ہو—لیکن اتنا طے ہے کہ......'

وہ ایک بار پھر خلاء میں دیکھ رہا تھا— 'اس نے کچھ اور نہیں کیا ہوگا—اس لیے کہ اس کے ڈرنے، خوفزدہ ہونے کے امکانات زیادہ مضبوط ہیں......مگر اس رات......اس پوری رات......اور اس کے جانے کے بعد کی یہ تین راتیں—وہ رکا......یہ سب بتانا آسان نہیں ہے۔ اور اس کے لیے پتھر کا کلیجہ چاہئے—

'جو تمہارے پاس ہے—'

'ہونہہ—'

’اس نے اثبات میں سر ہلایا— ’اور جیسا کہ میں نے بتایا تھا، پہلی بار میں نے بیٹی کی آنکھوں میں حرکت دیکھی تھی۔ ایک تجسس، جس کے بارے میں اب سوچ سکتا ہوں کہ فطرت کسی نہ کسی بہانے انسانی جسم سے اپنا رابطہ جوڑ لیتی ہے۔ چرند، پرند...... یہاں تک کہ پیڑ، پودے— ان کی نشو ونما...... یہ کہانیاں بچپن سے سنتا اور بڑا ہوتا آیا ہوں— جانوروں، پرندوں کو جنسی تعلقات کے بارے میں کون بتاتا ہے......

جنسی تعلقات......‘

وہ ٹھہرا تھا...... بھیّا، ممکن ہے تو ایک گلاس ٹھنڈا پانی منگائیے‘

’ہاں ہاں کیوں نہیں—‘

میں نے اسے پانی پیش کیا۔ ایک ہی سانس میں پانی پی کر اس نے اپنا گلہ تر کیا—

’انوار کو تھپڑ مارنے اور ڈانٹنے کے بعد میں نگار کے پاس پہنچا تو جیسے ایک دنیا بدل چکی تھی— اور جیسا کہ میں آپ کو بتا چکا ہوں— اس کی آنکھیں پہلے کی طرح بے رنگ نہیں تھیں۔

’ہاں— تم بتا چکے ہو—‘

’ان آنکھوں میں ایک تجسس تھا— لیکن کیا یہ تجسس جسم کو لے کر تھا...... مجھے یہی بات خوفزدہ کر رہی تھی......

ڈرم...... ڈرم...... ڈرم......

دماغ میں نگاڑے بجنے لگے تھے......

میری سانسیں رک گئی تھیں— میں نور محمد کا چہرہ دیکھ رہا تھا...... اس کے چہرے پر سکون تھا۔ جیسے وہ پچھلے کئی دنوں سے مسلسل سوچتا ہوا، کسی نتیجے تک پہنچ چکا ہو—

’جسم کو لے کر...... تجسس......؟‘ میرا لہجہ بھاری تھا۔ یعنی تم یہ کہنا چاہتے ہو نور محمد کہ نگار کے اندر سیکس جاگ گیا تھا—

’سیکس......‘

وہ ہانپ رہا تھا— جیسے دور سے دوڑتا ہوا چلا آ رہا ہو— 'یقیناً، آپ نے بات کو مجھ سے کہیں زیادہ صاف کر دیا۔ ۱۸ سال کی اس بچی میں، جسے کوئی شعور نہیں تھا، اچانک انوار کی آمد یا موجودگی نے اس کے اندر کے سیکس کو جگا دیا تھا—

'ناممکن......' میں خوفزدہ آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ تم جانتے بھی ہو تم کیا کہہ رہے ہو نور محمد— اپنی بیٹی کے بارے میں، اپنی سگی بیٹی کے بارے میں......'

وہ رو رہا تھا— اس کی سسکیاں گونج رہی تھیں...... 'وقت اور حالات مجھ سے جو کہانی لکھوا رہے ہیں، میں اس کے لیے قطعی تیار نہیں تھا بھیّا— لیکن اب...... مجھے بس نگار کی زندگی چاہیے— جب نادرہ کا انتقال ہوا تھا۔ آپ کو یاد ہے، میں نے آپ سے کیا کہا تھا...... وہ جو بھی کہے گی کروں گا...... اس کی ہر بات مانوں گا— مگر اسے مرنے نہیں دوں گا...... یاد ہے؟'

'ہاں......'

اس رات پہلی بار......

نور محمد نے نگاہیں پھیر لی تھیں— رات کے تین بجے کا وقت ہوگا— وہ دوا کھا کر سو گئی تھی— مجھے بھی نیند آ گئی تھی— اچانک تین بجے کے آس پاس میری نیند کھل گئی...... مجھے جسم میں چیونٹیاں سی رینگتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں...... اچانک مجھے احساس ہوا...... میں نیچے کچھ بھی نہیں پہنے ہوں...... کسی نے پائجامے کا ازار بند کھول لیا ہے...... میرا پائجامہ اتر چکا ہے...... اور اچانک میں نے دیکھا......

کیا— ؟ میں زور سے چلایا...... کیا دیکھا نور محمد......

'یہ نگار تھی...... جو میرے پاؤں کے پاس جھکی ہوئی تھی...... اور میرے ننگے جسم کو غور سے دیکھ رہی تھی...... اور فقط ان تین دنوں میں......'

وہ مجھ سے کہیں زیادہ زور سے چیخا— 'اس کے اندر سیکس کے مطالبے جاگ گئے ہیں۔

اس پر آشوب موسم میں باہر سے گولی چلنے کی آواز آئی تھی۔ دھماکہ ہوا تھا۔ مگر اس دھماکے

سے کہیں زیادہ تیز دھما کہ ابھی اس وقت اس کمرے میں ہوا تھا— میں نے شدت جذبات سے چیختے ہوئے اپنے دونوں کان بند کر لیے تھے۔

'بس کرو نور محمد......اس سے آگے نہیں—'

صوفے پر دھنسا ہوا وہ اب بھی روئے جا رہا تھا— لیکن اس کی آواز اندر ہونے والے دھماکوں کی آواز کے درمیان دب کر رہ گئی تھی۔

●●

میرا سارا جسم پسینے سے تر بتر تھا—

سارہ مجھے جگا رہی تھی—

'کیا بات ہے دڈّو— کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا کیا......؟

آنکھوں کے پردے پر چھک چھک کرتی ہوئی ریل ٹھہر گئی ہے— مسکرا کر کہتا ہوں۔

'سارا بیٹی......زندگی کبھی کبھی ڈراؤنے خواب سے بھی زیادہ ڈراؤنی لگتی ہے......'

وہ میرے چہرے کو غور سے دیکھ رہی تھی—

'تم چھپا رہے ہو۔تم نے ضرور کوئی برا خواب دیکھا ہے—'

'ہاں بیٹی—'

'آپ گھوڑے بیچ کر سوئے تھے دڈّو— ابو بابا دو بار کھانے کے لیے پوچھنے آئے تھے— کھانا لگواؤں دڈّو......؟'

'ہاں بیٹی—'

'ٹھیک ہے دڈّو— آپ جلدی فریش ہو کر نیچے آجاؤ—'

ذہن اب بھی سائیں سائیں کر رہا ہے۔

لیکن اس وقت اگر مجھے کوئی سکون پہنچا سکتا ہے، تو وہ ہیں پروفیسر نیلے— لیکن اب تو رات ہوگئی ہے—

میں نے صبح ہی صبح پروفیسر نیلے سے ملنے کا ارادہ کرلیا تھا......

(۷)

ایک بار پھر پہاڑ روشن تھے—یا پہاڑ جاگ گئے تھے— آج ہم Family Incest کے موضوع پر گفتگو کر رہے تھے— مرغزاروں کی ہری بھری گھاس نے دھند کا لباس پہن رکھا تھا— پروفیسر نیلے کے پاؤں میں کچھ تکلیف تھی۔ اس لیے آج وہ لاٹھی کے سہارے ٹہل رہے تھے— میں نے اُنہیں باہر نکلنے سے منع بھی کیا— لیکن انہوں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا— اس عمر میں آرام کرنے سے ہڈیاں کمزور ہوجاتی ہیں۔ ہم دیر تک جنسی اشتعال انگیزی اورشہوت انگیزی کے موضوع پر گفتگو کرتے رہے۔ بہرحال وہ ان باتوں سے ذرا بھی فکرمند نہیں تھے—

''تہذیبیں عام طور پر رنگ بدلتی رہتی ہیں۔ پہلے کیا اتنی ترقی تھی؟ اتنے میڈیا ز تھے؟ بچوں کی تربیت اور کردار سازی کے لیے کیا ہمارے پاس وقت ہے؟ اور تربیت ہم نہیں کرتے۔ نہ کردار سازی کرتے ہیں۔ ہم صرف اس غلط فہمی میں رہتے ہیں کہ ہم اپنے بچوں کی اچھی تربیت کر رہے ہیں— کچھ عرصہ پہلے تک ہمارا معاشرہ یہ ذمہ داریاں عورتوں پر ڈال کر اپنے حدود مقرر کرلیتا تھا— مگر اب......؟ مہذب دنیا میں ایسی کسی بھی تقسیم پر میں اعتراض درج کرتا ہوں جہاں بہانہ کوئی بھی ہو، مگر عورتوں کو مردوں سے کم تر سمجھا جاتا ہو......

وہ میری طرف مڑے......'ہاں، تم اس دنیا کے بارے میں جاننا چاہتے تھے، جہاں باپ اور بیٹی......؟ اور جیسا کہ تم نے بتایا......؟ تم ابھی بھی کانپ رہے ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ ہماری آج کی دنیا میں ایسے واقعات ہوتے رہتے ہیں۔ آسٹریلیا کے شہر Amstetten میں ایک شخص نے اپنی سگی بیٹی الزابتھ کے ساتھ 22 سال تک جنسی تعلقات بنائے......خود ہندستان میں اس قسم کے کتنے

واقعات ہوئے ہیں اور ہو رہے ہیں اور یہ مت بھولو کہ تمہاری اس کہانی میں ابھی صرف اس مانگ نے جنم لیا ہے—اور ایک باپ ڈر گیا ہے—ایک معذور بیٹی، جس نے 18 سال تک ہوش وحواس سے الگ کی دنیا میں پناہ لی، اب اس کے اندر ایک مانگ پیدا ہو رہی ہے— مگر بھیانک......'

پروفیسر نیلے معنی خیز انداز میں مسکرائے۔ ابھی اپنی اس کہانی سے باہر نکلو— میں تمہیں کچھ دکھانا چاہتا ہوں— کچھ بتانا چاہتا ہوں...... میں تمہیں ایک ایسی دنیا دکھانا چاہتا ہوں جو شاید تمہارے بچوں، یا بچوں کے بچوں نے دیکھی ہو، مگر تم نے نہیں دیکھی ہے— کیونکہ تم صرف لرز سکتے ہو۔ کانپ سکتے ہو۔ مگر زمانے کے بھیانک سچ کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر نہیں چل سکتے— ممکن ہے، ہمارے تمہارے بچوں نے اس سچ کو ہزار بار دیکھا ہو— پھر بھی ان کے اندر کوئی تبدیلی نہیں آئی ہو۔ کسی بھی طرح کوئی لہر، کوئی بغاوت پیدا نہیں ہوئی ہو۔ وہ ایک لمحے کے لیے بھی سنسکرتی، تہذیب اور اخلاق کو ہونٹوں پر نہ لائے ہوں، اور دیکھ کر بھی اس واقعہ سے ایسے گزر گئے ہوں، جیسے جنک فوڈ کھا رہے ہوں— برگر، پیپسی، یا پزا......'

پروفیسر نیلے مسکرائے— ڈرومت کاردار...... آؤ...... میرے ساتھ۔ تمہیں وہ دنیا دکھاؤں......شاید اب جسے دیکھنے کی زیادہ ضرورت ہے......

وہ ہنسے......لیکن کیا تم اس حیران کر دینے والی سچائی کو اسی طرح دیکھ سکو گے، جیسے تمہارے بچے...... جیسے تم بھی پزا یا برگر کھا رہے ہو؟

پروفیسر نیلے ہنس رہے تھے—پریشان مت ہو— چلو میرے ساتھ......

پہاڑوں کی ہلچل سے ہوتے ہوئے ہم ایک چھوٹے سے کمرے میں آ گئے— پروفیسر نیلے کمپیوٹر کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئے—ماؤس پر ان کے ہاتھ تیز تیز چل رہے تھے— نیٹ روشن تھا......وہ میری طرف مڑے۔

'کاردار...... یہ دیکھو — اس دنیا کو دیکھو — یہاں Google ہے......
Picasa, Smugmug, webshots, Zoom, Facebook ہے۔

Youtube, Vimeu اور Padora ہے— دنیا میں کچھ بھی تلاش کرنا چاہو تلاش کر سکتے ہو— ڈرومت— ادھر دیکھو Google کے اسکرین پر اپنی نظریں مرکوز کرو— دیکھو— یہاں میں نے لکھ دیا۔ Family incest اور اب دیکھو...... کلک کرتے ہی...... فیملی انسیسٹ کے ہزاروں خانے روشن تھے— باپ بیٹی میں سیکس— ماں بیٹے میں سیکس— خاندان کے ساتھ گروپ سیکس...... بھائی بہن میں سیکس...... سوتیلی بہن کے ساتھ...... ماں اور بیٹی کے ساتھ باپ کا دونوں کو Seduce کرنا......

پروفیسر نیلے کے ہاتھ سانپ بن گئے تھے— 'کھولتے جاؤ گے...... اور ہزاروں خانے کھلتے جائیں گے کاردار— یوٹیوب سے فیس بک اور گوگول تک— یہاں تم یہ فلمیں بھی دیکھ سکتے ہو— سگے رشتوں کی خوفناک فلمیں— ٹھہرو— یہ دیکھو......

انہوں نے Slutload, Video پر کلک کیا— گوگول پر کورنر میں ایک بلیک اسکرین کا ونڈو آہستہ آہستہ کھل رہا ہے۔ انگریزی میں لکھا ہوا آتا ہے Dad and Daughter are enjoying sex...... ایک خوفناک فلم شروع ہوتی ہے...... کپڑے اتر رہے ہیں— لیکن یہاں دو مقدس رشتے ہیں۔ جن سے تہذیب کی سلامتی کی باگ ڈور بندھی ہے۔ ایک باپ، دوسرا بیٹی...... یہاں رشتوں کا ہر تقدس پامال ہو رہا ہے......

میں چیختا ہوں— پروفیسر نیلے بند کیجئے— پلیز بند کیجئے......

'دیکھو کاردار......'

پروفیسر نیلے مجھ سے کہیں زیادہ زور سے چیخے— آنکھیں مت بند کرو۔ دیکھو— یہاں ہزاروں لاکھوں فلمیں ہیں— تم بس گوگول یا یوٹیوب یا کسی بھی سائٹ پر کچھ بھی لکھتے جاؤ۔ تم یہ لاکھوں کروڑوں قصے پڑھ بھی سکتے ہو اور اپنی ننگی آنکھوں سے دیکھ بھی سکتے ہو۔ اب میری سنو— کاردار— اگر یہ سچ نہیں ہے۔ تو یہ فلمیں کیوں ہیں؟ لوگ اگر انہیں پسند نہیں کرتے۔ دیکھنا نہیں چاہتے تو پھر یہ فلمیں بھی نہیں ہوتیں— آہ......

پروفیسر نیلے نے زبردست آہ کھینچی— کاردار، سچ بھیانک ہے— جب تم کاکروچ مارتے ہو......لوگ جنسی تلذذ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ جب تم اپنی چائے میں شکر گھولتے ہو...... ہزاروں، لاکھوں کی بھیڑ اس لمحے اسکرین پر اس بھیانک سچ سے گزر رہی ہوتی ہے...... جب تم نماز پڑھتے یا قرآنی آیات سے گزرتے ہو— تب بھی ایک بڑی آبادی، ایک بڑی دنیا سچ کے اس ننگے اور خوفناک بازار میں گم رہتی ہے۔ معاملہ سیکس سے رشتوں تک آ گیا ہے— یہاں ہزاروں فلمیں ہیں— جہاں رشتوں کے مقدس دھاگے ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر گئے ہیں— اب یہ دیکھو— یہاں میں لکھتا ہوں India, incest family یا پاکستان کا نام لکھو— اور یہ دیکھو— وہ دکھا رہے ہیں...... یہاں کوئی یوروپین نہیں ہے۔ امریکہ، برطانیہ یا آسٹریلیا کے جوڑے نہیں ہیں۔ تمہارے لوگ ہیں کاردار— پاکستان کے، ہندستان کے۔ اپنے سگے جو جنسی اشتعال انگیزی میں گم ہیں۔ تم کہہ سکتے ہو، ممکن ہے، یہ سگے نہ ہوں۔ محض فلمیں بنادی گئی ہوں۔ لیکن یہاں سگے رشتوں کا نام کیوں درج ہے کاردار؟ کیونکہ بازار سے مارے، گلوبلائزیشن سے بور ہو جانے والے اب دوسروں کے سیکس کا ڈرامہ دیکھ کر بور ہو چکے ہیں اور نتیجہ...... وہ سیکس کو آپسی رشتوں میں تلاش کر رہے ہیں۔

پروفیسر نیلے نے ہندستانی بھائی بہن کی ایک فلم چلادی— میں نے اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں۔

پروفیسر نیلے کا چہرہ جذبات کے ہر رنگ سے عاری تھا...... وہ دھیرے دھیرے کہہ رہے تھے......'دیکھو...... اس بھائی اور بہن کو دیکھو— 25 سے بھی کم عمر کے...... یہ وہی بھائی ہے نا، جو عام گھروں میں ہوتا ہے...... اسٹڈی کرتا ہوا، باپ سے پیسے مانگتا ہوا، پوجا کرتا ہوا یا نماز پڑھتا ہوا— ماں اور باپ کے ساتھ ٹھہاکے لگاتا ہوا...... کیوں کاردار...... اور یہ لڑکی...... ویسی ہی نا...... جیسی ہمارے گھروں میں ہوتی ہے۔ چائے بناتی ہوئی— عبادت کرتی ہوئی، کالج جاتی ہوئی، ماں کا ہاتھ بٹاتی ہوئی— کسی بات پر شرم سے سر جھکاتی ہوئی— لیکن یہاں......؟

پروفیسر نیلے زور زور سے بول رہے تھے...... دنیا کے پھیلتے بازار میں، اس

Consumer world میں زندگی سے بور ہونے والے لوگوں کے لیے کچھ نیا اور Different چاہئے۔ مختلف — تھکے ہوئے لوگوں کو جنسی سکون پہنچانے کے لیے — اور اسی لیے اب اس سیکس بازار میں رشتے آ گئے ہیں۔ مقدس رشتے — یہاں incest family کے خانے میں انڈیا یا پاکستان کی جگہ تم عرب، چین، نیپال، بنگلہ دیش، مصر یا کچھ بھی لکھ سکتے ہیں — تم دیکھتے دیکھتے تھک جاؤ گے لیکن یہ فلمیں کم نہیں ہوں گی — ہر طرح کا تھرل، ایڈونچر اور جنسی اشتعال انگیزی — آؤ تمہیں سوال جواب کی انوکھی دنیا میں لے چلتا ہوں — پروفیسر نیلے نے فلمیں بند کر دی تھیں۔ Father, Danghter incest

میں کچھ چہرے روشن تھے — جن کے سوالوں کے جواب دیئے جا رہے تھے۔

کاردار نے غور سے اسکرین کی طرف اپنی نظر مرکوز کر دی۔ ایک عورت کا سوال تھا۔

I need another perspective on a situation that has been bothering me. I am married, have a 16 year old daughter who does not live in our state (she's with her mother) but visits fairly regularly. She has always been very close to her dad--- they are both affectionate, touchy-feely people. Since reaching adolescence, the physical closeness hasn't tempered as I would have expected just recently she jumped on his back with her arms around his neck and hung onto him as he bent forward some. Playful, but to me, strange that a father would be comfortabe with his teen daughter pressed body to body with him, her breasts pushing into his back.

Other examples: she talked about her increased bra size to him during a holiday dinner, she complains to him about her "underdeveloped" derriere, and once she even walked past him in her PJ's, bent over, and wiggled that very part of her anatomy at him.

میں خود سے جنگ لڑ رہا تھا—

رشتوں کی مقدس دنیا میں سیکس کے جراثیم گھل گئے تھے— سوالوں کی یہ دنیا مجھے لہولہان کر رہی تھی......

میری آنکھیں اسکرین سے چپک کر رہ گئی تھیں۔

A recent holiday gift request.. that he fulfilled.. was a victoria's secret order for thongs, bras and bikinis. I'm all for a warm, close father-daughter relationship, but this freewheeling, anything goes thing between them is bothering me. to me, she's just too old to be climbing all over her dad, expecting him to buy her sexy underwear, or discussing her physical development with him. I think the only person he should be buying underwear for (of that kind) is his wife... let mom handle her underwear requests. Any thoughts? Am I out of line in my thinking or what? (By the way, I had a very close, wonderful relationship with my dad, absent this kind of interacting).

پروفیسر نیلے سنجیدہ تھے— بکنی اور برا سے Self تجربوں تک— یہاں باپ اور بیٹی دونوں ہیں— یہاں کوئی Identity crisis نہیں ہے— پتہ بھی ہے— نام بھی اور چہرہ بھی— اور یہ دیکھو— یہ بارہ سال کی لڑکی...... پروفیسر نیلے اسکرین پر چمکتے الفاظ کو پڑھ رہے تھے......

میں Maggit ہوں— عمر 12 سال— مجھے ممی اچھی نہیں لگتی۔ پاپا مجھے پسند ہیں۔ پاپا جب مجھے پیار کرتے ہیں تو میں سب بھول جاتی ہوں......خاص کر جب پاپا میرا لباس اتارتے ہیں اور......میرے اس حصے کو چومتے ہیں......

'بس......میری آنکھیں خوفزدہ تھیں۔ پروفیسر نیلے......آگے بڑھائیے......مجھ میں ہمت نہیں ہے......

'ابھی یہاں چھ سال کے بچے بھی ہیں......دیکھو گے؟'

'نہیں پروفیسر نیلے......'

'اور یہ دیکھو...... یہ ایک ایسے خاندان والوں کا چہرہ ہے، جہاں ہر کوئی ایک دوسرے کے جسم کے بارے میں سب کچھ جانتا ہے— ٹھہرو...... یہ دس سال کی بچی ہے— اور یہ اس کا باپ...... یہ اس کا بارہ سال کا بھائی اور یہ اس کی ماں......'

پروفیسر نیلے چیخ رہے تھے— گلوبل وارمنگ کے خطروں کی دہائیاں دینے والے کیا اس سچ سے واقف نہیں کہ تہذیبیں گم ہو چکی ہیں؟ کوپن ہیگن میں ماحولیات کی عالمی کانفرنس ناکام ہو جاتی ہے— اور یہاں ایک نئی ماحولیات کا جنم ہو رہا ہے......'

وہ ہنس رہے تھے— کہاں ہے تمہارا Sex edudation ؟ وہ یہاں ہے— معصوم بچوں کے ننگے جسم میں کراہتا ہوا اور سسکتا ہوا— یہاں ایک دنیا اور بھی ہے کاردار— نہ اسے تم دیکھ سکتے ہو اور نہ میں— بس تمہیں گوگول یا کسی بھی سائٹ پر جا کر بس یہ لکھنا ہے Little lupe چھوٹے معصوم بچے— سیکس کے سوداگروں نے معصوم بچوں کی عصمت بھی لوٹ لی—

چھوٹے چھوٹے معصوم بچے جن کی عمر پانچ سے ۱۲ سال تک ہے— اور ان کی وہ دنیا جس پر تمہارے سوشل .N.G.O بین لگانے کی مانگ کر سکتے ہیں۔ لیکن کیا بین لگانا کوئی حل ہے— لاکھوں، کروڑوں کی تعداد میں Child sex کی سیڑھیاں ہندستان سے عالمی بازار تک پھیلی ہوئی ہیں۔ خریدار ہیں تب تو یہ سیڑھیاں فروخت ہو رہی ہیں— لوگ تھک گئے ہیں۔ بور ہو گئے ہیں اور سیکس کے نئے تماشوں میں پناہ اور سکون تلاش کر رہے ہیں...... پروفیسر نیلے مسکرائے— اور یہ دیکھو۔

" I knew Rita was my sister. I didn't choose to fall in love with her, or expect to feel sexual desire. It just happened. Even in front of my wife, I made no attempt to hide my adoration, I just buzzed whenever she was around. It was as if no one else existed. The two biggest mistakes I made were deluding myself that. I could become all-important in her life, a brother and a surrogate lover, even though she didn't desire me, and then believing I could control and resolve the problem by myself."

پروفیسر نیلے سنجیدہ تھے— یقیناً تم نے اس دنیا کے بارے میں سنا ہوگا۔ لیکن شاید تم اس دنیا کے بارے میں اتنے قریب سے نہیں جانتے ہوگے۔ اور repeat I یہ دنیا تمہارے بچوں نے یقیناً دیکھی ہوگی— اور ٹھیک اسی طرح۔ جیسا میں نے پہلے کہا— پیپسی پیتے ہوئے یا پھر برگر اور پزا کا ذائقہ لیتے ہوئے— اور تمہاری طرح وہ تہذیب کے ختم ہونے کے پچڑے میں نہیں پڑے ہوں گے— اور ایک دلچسپ بات۔

وہ میری طرف مڑے۔

ایک بات پوچھوں......

ہاں......

'برا تو نہیں مانو گے—؟'

بالکل نہیں—

تم لیپ ٹاپ یا کمپیوٹر کا استعمال کرتے ہو......

ہاں......

کبھی Chatting کی ہے—

ہاں......

پروفیسر نیلے غور سے میرا چہرہ پڑھ رہے تھے۔ سچ بتانا......جھوٹ بالکل نہیں—

آپ پوچھئے تو سہی—

'تم نے کبھی Hot chat کیا ہے'

ہاٹ چیٹ؟ میں چونک گیا تھا۔

ہاں۔ ہاٹ چیٹ......سیکس چیٹ......؟

'سیکس چیٹ......؟' میرے دماغ میں جھناکا ہوا تھا— کیا بات کر رہے ہیں آپ پروفیسر نیلے......

'ہاں بھائی—ایک دن تمہاری اسی سو کالڈ تہذیب کے ورق پلٹنے کے لیے میں نے یہ بھی تجربہ کیا......اور......

'اور......؟'

پروفیسر نیلے ہنس رہے تھے—

'ہندستان ہو پاکستان یا نیپال......اسکول یا کالج میں پڑھنے والی لڑکی ہو یا گھر پر رہنے

والی اکیلی عورت— سب ہاٹ چیٹ کے مزے لینا چاہتے ہیں...... تمہیں ایک دلچسپ بات بتاؤں—

'جی......'

'سیکس یا ہاٹ چیٹنگ میں بھی لوگ عام سیکسی بات چیت سے بور ہو چکے ہیں۔ یہاں بھی سواد چاہئے— ذائقہ، نیا نیا ذائقہ— اس لیے اب لڑکیاں یا عورتیں آپ کے ساتھ Role play کرنا چاہتی ہیں۔ ہندستان اور پاکستان کی ایسی کچھ کم سن لڑکیاں مجھ سے ٹکرائیں جو Role-play کی خواہش مند تھیں۔ یہاں ذائقے کے لیے ایک ہاٹ کہانی Imagine کرنی ہوتی ہے اور پتہ ہے— جب میں نے ان لڑکیوں سے پوچھا کہ تمہیں کس طرح کی کہانیاں چاہئے تو جواب کیا تھا......؟

'فیملی انسیسٹ۔ وہ قریبی رشتے کی کہانیاں بتا کر سیکس چیٹ کی خواہش مند تھیں۔ ایک نے کہا، تم باپ بن جاؤ۔ ویسے بھی تم باپ کی عمر کے ہو......'

پروفیسر نیلے نے گہری سانس بھری— میں نے اس تجربے کو جاری نہیں رکھا۔ ویسے بھی اس عمر میں، میں ان چیزوں کا خواہشمند نہیں— تجربہ— صرف ایک تجربہ— لیکن اس تجربے نے مجھے بہت سکھایا کاردار......

وہ میری طرف دیکھ رہے تھے...... یہ ہمارا ہی ملک ہے جہاں کنڈوم کے لیے بنداس بول کا سہارا لیا جا رہا ہے— جہاں Sex tourism کو عام کیا جا رہا ہے۔ جہاں انڈیا ٹوڈے اور آؤٹ لک جیسی نیشنل نیوز میگزینس ہر سال Sex پر نئے سروے کرا رہی ہیں اور تعجب یہ کہ ہر سال اس سروے میں نئی نئی بات سامنے آ رہی ہے— نئی دنیا— نئی تہذیب...... نیا کنڈوم......

پروفیسر نیلے ہنس رہے تھے......

'سپر مارکیٹ، انڈیا شائننگ اور 2050 تک انڈیا کو سب سے بڑی طاقت کے طور پر پیشن گوئی کرنے والے بھی نہیں جانتے— کہ وہ اس پوئر انڈیا کو کہاں لے آئے ہیں۔ تمہارے

رنگ برنگے کھلونے جیسے کنڈوم تک — اسکول کے بچے برانڈیڈ انڈر ویر پہنتے ہیں — اور پینٹ اتنی نیچے باندھتے ہیں کہ ان کی گرل فرینڈ ان کی برانڈیڈ انڈرویر کو دیکھ کر خوش ہو سکے — پیٹ کے نیچے کی ساری تاریخ اور جغرافیہ زیادہ آزاد ہے دوست — کہاں ہے تمہارا Ethics، نیتی شاستر اور اخلاقیات کے واہیات صفحے — تمہارے کمرشیل ٹی وی شوز سیکس کی آزادی کا پیغام لے کر آ رہے ہیں — سچ کا سامنا، روڈیز شو اور ایموشنل اتیا چار جیسے پروگرام — یہ چھوٹے چھوٹے بچوں میں سیکس کی بھوک جگا رہے ہیں۔ کب تک روکو گے اپنی تہذیب کو تم — یہ تہذیب بلاسٹ کر چکی ہے — پرزے پرزے ٹوٹ چکے ہیں — اب کچھ بھی باقی نہیں ہے کاردار......

وہ ہنس رہے تھے — اور یقین مانو...... تہذیب کے یہ صفحے ہم یا تم نہیں لکھتے — وہ مسکرا رہے تھے...... یہ پہاڑ لکھتے ہیں — یہ وادیاں لکھتی ہیں، نیچر لکھتا ہے — چلو ایک بار پھر نیچر میں گم ہو جائیں...... پہاڑوں میں — ان حسین وادیوں میں...... نہ ختم ہونے والے پہاڑی سلسلوں میں اور شاید اسی لیے عمر کے اس آخری دور کے لیے میں نے ان پہاڑوں کا انتخاب کیا — اور تم نے بھی میرے دوست کاردار — تم بھی ان پہاڑوں کا حصہ بن گئے — ہے نا......'

پروفیسر نیلے اپنی لاٹھی نچا رہے تھے......

لیکن شاید اب میں کسی اور راستے پر نکل گیا تھا — میری آنکھوں میں ایک بار پھر نگار کا چہرہ روشن تھا — ساتھ ہی نور محمد کا گھبرایا چہرہ بھی...... جو اپنے ٹوٹتے لفظوں کے ساتھ خود کو سنبھالتے ہوئے چبا چبا کر کہہ رہا تھا — اب اسکے اندر مانگیں، جاگ گئی ہیں......

میں نے پروفیسر نیلے سے اجازت مانگی اور گھر کی طرف روانہ ہو گیا —

(۸)

کچن سے حلیمہ اور ابو بابا کے لڑنے کی آواز آ رہی تھی۔ میری اس لڑائی میں ذرا بھی دلچسپی نہیں تھی — سارہ کو تلاش کرتا ہوا میں اس کے کمرے میں آیا تو وہ نیٹ پر چیٹنگ میں مصروف تھی —

ایک لمحے کے لیے مجھے پروفیسر نیلے یاد آ گئے — پزّا، برگر اور پیپسی کی ہیبت ناک دنیا میری نگاہوں میں روشن ہوگئی —

سارہ نے پلٹ کر میری طرف دیکھا —

آ گئے ددّو —

'ہاں......'

وہ مسکرائی — 'میں ابھی اپنے دوست کے ساتھ چیٹنگ کر رہی ہوں۔ آپ کے لیے چائے بھجواؤں ددّو —؟'

'نہیں بیٹا......'

'ارے ہاں...... پاپا سے بات ہوئی تھی۔ وہ دونوں کے لیے یہاں آنے والے ہیں......

'اچھا —'

شان کے آنے کی خبر نے مجھے خوش کر دیا تھا — لیکن اس وقت میرا ذہن کہیں اور الجھا ہوا تھا — اس لیے شان کی خبر سننے کے بعد بھی میں اپنی خوشی کا اظہار نہیں کر سکا —

میں اپنے کمرے میں آ گیا۔ کھڑکی کھول دی۔ سامنے وادیاں جگمگا رہی تھیں — میں میز کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا —

آنکھیں بند تھیں —

اور دماغ میں ابھی بھی پٹاخے چھوٹ رہے تھے......

یادوں کی ریل چھک چھک کرتی ہوئی چل پڑی تھی۔

●●

سنہ 1992

اس سال سے وابستہ کتنی ہی کہانیاں تھیں——

شان کی زندگی میں سعدیہ آچکی تھی——شان کی پڑھائی ابھی مکمل نہیں ہوئی تھی لیکن سعدیہ کے گھر والے اس رشتے پر اب دونوں خاندان کی مہر لگانا چاہتے تھے۔ میرا خیال تھا کہ پہلے بیٹے شان کی پڑھائی مکمل ہو جائے——شادی تو کبھی بھی ہوسکتی ہے۔ مگر سعدیہ کے گھر والوں کو جلدی تھی——

یہ وہی سال تھا، جب جولائی میں رام مندر کی تعمیر کا کام شروع ہو چکا تھا—— ملک کی سیاست نے ہندو مسلمانوں کو ایک بارودی زمین پر لا کر کھڑا کر دیا تھا——مجھے رونا آتا تھا۔ اتنی نفرت تو تقسیم کے وقت بھی نہیں ہوگی——

ادھر کافی دنوں سے نور محمد سے بھی میری ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ نہ اس کا کوئی فون آیا تھا——حقیقت یہ بھی تھی کہ میں خود بھی اس کے دیدار یا فون سے بچنا چاہتا تھا۔

رقیہ نے کتنی ہی بار پوچھا——

'وہ نہیں آئے تو آپ ہی چلے جائیے——'

میں نے بہانہ بنایا——میں بھی مصروف ہوں۔ وہ بھی مصروف ہوگا——'

'یہ کیا بات ہوئی——خبر تو ملنی چاہئے——'

میں رقیہ کو کیا جواب دیتا——

کیا میں سچ مچ کسی خبر کی امید کر رہا تھا......؟

اگر ہاں تو کس طرح کے خبر کی——؟'

اور کیوں؟

●●

سعدیہ اور شان کی دھوم دھام سے شادی ہوگئی— مگر نور محمد نہیں آیا— اس بار اس کے نہیں آنے نے مجھے سچ مچ پریشان کر دیا تھا— فون پر اب بھی رابطہ نہیں ہو رہا تھا— کئی بار مجھے خیال آیا— نور محمد کے گھر جا کر دیکھنا چاہئے— پھر نگار کا خیال مجھے اس اقدام سے روک دیتا۔

میں نے اس کے گھر کے پتہ پر سعدیہ اور شان کی شادی کا کارڈ بھیج دیا تھا— مگر اس کا بھی کوئی جواب نہیں آیا۔ اب مجھے تشویش ہو رہی تھی—

کہیں نگار کو کچھ ہو تو نہیں گیا؟

یا پھر نور محمد کو؟

میں دل ہی دل میں دونوں کی درازی عمر کے لیے دعا کرتا— میرا ذہن یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ آخر اس کے نہ آنے کے پیچھے کیا مجبوری ہو سکتی ہے—؟

شان کی دنیا آباد ہوگئی تھی۔ شادی کے بعد وہ دوبارہ اپنے ہاسٹل چلا گیا تھا— اور یہاں تنہائی کی اپنی خاموش دنیا آباد تھی۔ ایک وقت آتا ہے— جب پرندے اڑ جاتے ہیں—

اور آپ پھر سے اکیلے ہو جاتے ہیں۔ رقیہ کمزور ہوگئی تھی۔ اب پہلے سے کہیں زیادہ عبادت میں مصروف—

لیکن ایک دن اچانک وہ آ گیا— وہی نور محمد—

پہلے سے کہیں زیادہ سہا ہوا— ڈرا ہوا— داڑھی بڑھی ہوئی— بال الجھے ہوئے اور بڑے بڑے— وہ ڈراؤنا لگ رہا تھا—

دوپہر دو بجے کا وقت ہوگا......

یہ نومبر کے ختم دنوں کی دوپہر تھی— ٹھنڈک شروع ہو چکی تھی— اس کا چہرہ زرد اور اڑا ہوا تھا— حواس باختہ—

دروازہ رقیہ نے کھولا تھا اور نور محمد کو اس حال میں دیکھ کر گھبرا گئی تھی۔

بھائی صاحب آپ — آیئے — اندر تشریف لیئے —

باورچی خانے کے سامنے ایک چھوٹا سا برامدہ تھا — میں نے اسے وہیں بلا لیا — سلام وعلیکم سلام کے تبادلے کے درمیان میں اس کے چہرے کے ہر رنگ کو جاننے اور سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا —

رقیہ دوڑ کر پانی کا گلاس لے آئی —

'یہ کیا حال بنا لیا ہے بھائی صاحب آپ نے......؟' اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا — سب خیریت ہے نا......؟

وہ خاموش رہا —

نگار کیسی ہے بھائی صاحب......

اس نے خاموش رہ کر بس ذرا سر ہلا دیا —

رقیہ نے موضوع بدل دیا —

آپ شان کی شادی میں بھی نہیں آئے۔ کارڈ تو ملا ہوگا؟

'ہاں......'

'پھر کیوں نہیں آئے — ؟'

وہ بت بنا ہمارے چہرے دیکھ رہا تھا — خاموشی، گھٹن بن گئی تھی — جیسے واقعات کے ستم سہتے سہتے اب اس نے رہا سہا ہوش بھی کھو دیا ہو —

میں نے رقیہ سے کہا — نور محمد کو لے کر میں اپنے کمرے میں جا رہا ہوں — چائے کی جلد بازی مت کرنا۔ ضرورت ہوگی تو ہم خود مانگ لیں گے — '

رقیہ میرا اشارہ سمجھ گئی تھی —

میں اسے لے کر اپنے کمرے میں آ گیا —

●●

وہ سہما ہوا کرسی پر بیٹھا تھا— میری بیقراری بڑھ چکی تھی— ہزاروں سوال تھے، جن کے درمیان اس وقت میں خود کو گھرا ہوا محسوس کر رہا تھا......

نور محمد خاموش تھا—

میں نے اس کو جھنجھوڑتے ہوئے کہا—

'خدا کے لیے، کچھ بتاؤ گے تم...... کیا ہوا......'

اس بار بھی وہ خاموش رہا—

نگار کیسی ہے......

اس کے ہونٹ لرز کر رہ گئے......

زندہ ہے نا......؟ اس بار میں زور سے چیخا—

'ہاں......' وہ تڑپ کر بولا—

'پھر کیا بات ہے؟ خدا کے لیے چپ مت رہو۔ بتاؤ مجھے......'

آنکھوں کے آگے وہ فلم روشن تھی— پچھلی ملاقات میں گھبرایا ہوا نور محمد......اور وہ کہہ رہا تھا— 'اب اس کے اندر طلب جاگ گئی ہے......'

میں نے آگے بڑھ کر کھڑکی کھول دی— دوبارہ نور محمد کے پاس آ کر کھڑا ہوا— اس بار میرا لہجہ ملائم تھا—

'دیکھو نور محمد— پہلے بھی تم سب بتا چکے ہو— ڈرو مت— جو بھی اندر ہے......اسے اللہ کے واسطے اپنے اندر سے نکالنے کی کوشش کرو— اس طرح گھٹ گھٹ کے مر جاؤ گے......'

وہ اب بھی خاموش تھا—

پچھلی بار تم نگار کا تذکرہ رہے تھے......انوار کے جانے کے بعد......' میرے لفظ ٹوٹ رہے تھے......اور تم نے بتایا تھا کہ......اس کی آنکھیں اب بے رنگ نہیں ہیں......'

ہاں......

'اور یہ......کہ......'تمہیں لفظوں کی ادائیگی میں پریشانی ہو رہی تھی......اور یہ کہ اس کے اندر تمہارے لیے......ایک طلب...... پیدا ہوئی ہے......'

'ہاں......'

اس نے لمبی سانس بھری اور دھماکہ کر دیا—

'میں نے طلب پوری کر دی...... پوری کر دی......'

چھت ناچ رہی ہے......آسمان گھوم رہا ہے......ساری دنیا اچانک ہلنے لگی ہے......

میں خوف زدہ ہو کر پیچھے ہٹتا ہوں—

کیا......؟

'اور کوئی راستہ نہیں تھا......'

وہ رو رہا تھا—Now she is pregnant......

میرے ہوش فاختہ تھے— لگا، اب گر پڑوں گا— دماغ میں نگاڑے زور زور سے بج رہے تھے......

میں زور سے چیخا— کیا......وہ تمہارے بچے کی......'

اس نے سر جھکا لیا—

بے چینی کے عالم میں، میں اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا— میں کیا کروں— کیا کہوں— میں سہمی ہوئی اخلاقیات کے درمیان اس پرندے کی طرح تھا جس کے پر نوچ لیے گئے ہوں—

میں شاید رو رہا تھا—

یا شاید میرے آنسو خشک ہو چکے تھے—

اور دوسرے ہی لمحے میں نے کانپتے ہاتھوں سے اسے تھام لیا—

’سنو نور محمد— جو میں کہہ رہا ہوں وہ کرو— تم سن رہے ہو نا......‘

’ہاں......‘

’تو میری بات مانو— اب یہ شہر چھوڑ دو— نگار کو لے کر کہیں بھی نکل جاؤ— کوٹھی کی اچھی قیمت مل جائے گی۔ مگر اب اس شہر میں مت رہو— یہاں کے لوگوں کے سوالوں کے جواب نہیں دے پاؤ گے۔ تم سن رہے ہو نا......‘

’ہاں—‘

وہ دھیرے سے بولا— میں خود ہی یہ شہر چھوڑ کر جا رہا ہوں— کہاں، مجھے خود نہیں معلوم......میرے لیے دعا کرنا بھائی—‘

وہ اچانک میرے گلے لگ گیا— وہ رو رہا تھا...... میں کسی بت یا پتھر میں تبدیل ہو چکا تھا— اچانک وہ الگ ہوا— آنکھیں خشک کیں— پھر آہستہ سے بولا—

اللہ حافظ—

اور اسی کے ساتھ وہ کمرے سے باہر نکل گیا—

جانے کے کچھ ہی دیر بعد دوڑی ہوئی رقیہ آئی— اس کے چہرے پر گھبراہٹ تھی—

بھائی صاحب چلے گئے—

ہاں......

اس طرح اچانک......؟

پتہ نہیں—

آپ نے روکا بھی نہیں...... چائے کے لیے بھی نہیں پوچھا......

میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا—

پرندے تھے، جو نامعلوم سمتوں میں پرواز کرتے ہوئے جا رہے تھے—

●●

اس کے کچھ ہی دنوں بعد ایک دھما کہ اور ہوا تھا—

6 دسمبر 1992 بابری مسجد شہید کر دی گئی—

●●

ابو بابا چائے رکھ گئے تھے—

میں یادوں کی سرنگ سے باہر آ گیا تھا— 18 سال گزر گئے— دروازہ کھول کر میں نے نور محمد کا خط نکال لیا—

'یہ کہانی آپ نے لکھی تھی— اور اس کا انجام بھی آپ کو لکھنا ہے......'

کیا ابھی تک انجام باقی ہے؟ کتنے ہی چہرے تھے، جو اک ایک کر کے آنکھوں کے پردے پر لہرا رہے تھے— میں پس و پیش میں تھا— کیا کروں اور کیا نہ کروں—

اب ایک تیسری نسل جوان ہونے کی تیاری کر رہی تھی— سارہ کی نسل...... میں فیصلہ لے چکا تھا—

نور محمد کا نیا پتہ میرے پاس تھا۔ ولاس پور...... میں نے پتہ کیا تھا— بارہ گھنٹہ کا راستہ تھا۔

اتنے برسوں بعد اس سے ہونے والی ملاقات نے میرے پورے وجود میں ایک عجیب سی سنسناہٹ بھر دی تھی—

اور آخر میں دعا

سب کچھ ختم ہوچکا ہے ⁄

یہاں پرانی نشانیاں تلاش کرنے والے لوگ بھی نہیں ⁄

●●

سب کچھ ختم ہوچکا ہے ⁄

ایک بھیانک سیلاب ⁄ یا ایک بھیانک تباہی ⁄

●●

یہاں سب کچھ، ہالی وڈ کی فنتاسی کی

دنیا سے کہیں زیادہ بھیانک ہے ⁄

قارئین—

تیز رفتار ترقی، نئی تکنالوجی اور نئی دنیا کو سلام کرتے ہوئے میں اس کہانی یا ناول کا آخری صفحہ قلمبند کرنے جا رہا ہوں— نئی الفی یا نئے ہزارہ کے ان دس برسوں کو گواہ بنا کر کہ اس سے زیادہ مہذب دنیا کا کوئی تصور نا رتھ بلاک میں ہاٹ سیٹ پر بیٹھے ہمارے پرائم منسٹر کے پاس بھی نہیں ہے— اور ایسے موقع پر جب نئی الفی کے دس برس گزرنے کا جشن پوری دنیا میں منایا جا رہا ہے، میں آپ کو ٹھہر کر، رک کر ان صفحات کو پڑھنے کی التجا کرتا ہوں...... ڈی۔ان۔اے، جینوم، کروموسوم اور جین، کے اس عہد میں جہاں تہذیب و تمدن کی نئے سرے سے شناخت کی جا رہی ہے کہ سب سے قدیم انڈین کون تھے؟ دراوڑ؟ یا انڈمان جزائر میں رہنے والے؟ یا پھر منگولیائی؟ جہاں کینسر، ایڈز، ڈائبٹیز اور ہارٹ اٹیک پر فتح پانے کے لیے سائنس اور میڈیکل سائنس کے نئے دروازے کھل رہے ہیں— جہاں کامن ویلتھ گیمس کے لیے ایک بڑی آبادی بھوکوں ماردی جاتی ہے— اور جہاں سوائن فلو جیسی بیماریوں کے لیے ہم ایک دوا تک تلاش کر پانے میں ناکام رہتے ہیں...... جہاں آئی پی ایل کے بلّے چمکتے ہیں اور نندی گرام میں کسانوں کو زندہ جلا دیا جاتا ہے......

قارئین— نئی الفی کے دس برس اور ایسے ہزار واقعات کو گواہ بنا کر، کہ ہندستان کے نقشے میں یوپی کے ایک چھوٹے سے گاؤں بلاس پور کو تلاش کرنے میں مجھے زیادہ دشواری پیش نہیں آئی— مجھے ایک جھٹکا لگا تھا کہ انڈیا شائننگ کے اس دور میں ہندستان کے بہت سے گاؤں ابھی بھی اندھیرے میں ڈوبے ہوئے ہیں— اور کسان ایک بدتر زندگی گزارنے پر مجبور ہیں—

آنے سے قبل میں نے پروفیسر نیلے سے ایک چھوٹی سی ملاقات کی تھی اور انہیں بلاس پور جانے کا فیصلہ سنا دیا تھا— انہوں نے واپس لوٹنے پر پوری تفصیل سنانے کے لیے کہا تھا اور میں نے وعدہ کر لیا تھا— پروفیسر نیلے نے کچھ چھوٹے موٹے سوال بھی پوچھے، جسکا اشارہ انہیں اس پوری گفتگو میں نہیں ملا تھا— مثلاً میں پہاڑ پر کب آیا— اور بسنے کے لیے پہاڑ کا ہی انتخاب کیوں

کیا—؟

میں نے اس کی وجہ مختصر میں بتائی تھی، جسے آپ تک پہنچانا بھی ضروری ہے۔ وہاں رہ کر میں اس خوفناک کہانی سے باہر نہیں نکل سکتا تھا— پھر یوں ہوا کہ میں خاموش رہنے لگا— شان کی شادی کے کچھ برس بعد رقیہ مجھے چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے چلی گئی— اب دل نہیں لگتا تھا— اسکول کے لیے تو پہلے ہی میں نے ٹرسٹ بنا دیا تھا— اور اب اس کا ٹرسٹی میں نے اپنے بیٹے شان کو بنا دیا تھا— رقیہ کے انتقال کے کچھ برس بعد شان مجھے لے کر پہلی بار ان پہاڑوں پر آئے تھے۔ شان کا خیال تھا کہ اس طرح یہاں رہ کر میرا دل بہل جائے گا— اور اس کا یہ خیال صحیح نکلا— پھر ایک دن دبے لفظوں میں اس نے مجھ سے اس بات کا ذکر کیا کہ اس کے ایک مریض کا ایک خالی کاٹج یہاں ہے— اب وہ لوگ مکمل طور پر دلّی بس گئے ہیں— میں نے کاٹج دیکھنے کا ارادہ ظاہر کیا— اور اس طرح میں بلند شہر کی یادوں سے نکل کر ان پہاڑوں پر آباد ہو گیا— لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہاں بھی بلند شہر کی یادوں نے میرا پیچھا نہیں چھوڑا—

●●

ولاس پور میں نور محمد کا پتہ تلاش کرنے میں مجھے زیادہ دشواری نہیں ہوئی— مقامی لوگوں کی مدد سے، میں آرام سے نور محمد کے گھر پہنچ گیا— یہ دو منزلہ عمارت تھی— عمارت سے ملحق دور تک لہلہاتے کھیت بھی تھے— گاؤں میں خوشحال کسانوں کے پاس ایسی پختہ عمارتوں کی کمی نہیں تھی— مجھے یقین تھا، نور محمد کو کوٹھی کے اچھے دام ملے ہوں گے— مگر اس نے گاؤں میں ہی بسنے کا ارادہ کیوں کیا؟ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی— ممکن ہے شہر اور شہر میں ہونے والے واقعات نے اسے ڈرا دیا ہو اور، اس نے اپنے لیے ایک معمولی اور آسان زندگی کا انتخاب کیا ہو— لیکن وہاں سے واپس لوٹنے کے بعد بھی میں اپنا شک دور نہیں کر سکا کہ آخر اس نے گاؤں کو ہی اپنا مسکن کیوں بنایا؟)

نور محمد کا گھر آ گیا تھا — ایک پختہ سی دومنزلہ عمارت — عمارت کے باہر ایک بڑا سا لوہے کا دروازہ — یہ دروازہ اس وقت کھلا تھا — دروازے کے ساتھ ہی ایک بڑا سا صحن — صحن میں ایک قطار سے پھولوں کے گملے سجے تھے — وہیں قریب میں ایک الگنی پر کچھ گیلے کپڑے تھے — تولیہ...... چادریں...... شلوار...... جمپر...... اور اسی کے ساتھ میرے ذہن میں تیزی کے ساتھ ایک نام کوندا...... نگار......

لوہے کے کھلے دروازے سے ہوتا ہوا میں صحن میں آ گیا — صحن پار کرتے ہی تین کمرے بنے ہوئے تھے — تین الگ الگ دروازے — ان دروازوں میں کسی میں بھی کال بیل نہیں تھی — کچھ دیر تک میں کھڑا کچھ سوچتا رہا — کس دروازے پر دستک دوں؟ کیا اس وقت نور محمد گھر میں ہوگا؟ میں نے اسے اپنے آنے کی اطلاع نہیں دی تھی — ممکن ہے وہ نہیں ہو — کہیں باہر گیا ہو — لیکن مجھے اپنے اس خیال سے تقویت مل رہی تھی کہ گاؤں کے لوگ شہر یا باہر ضرورت پڑنے پر ہی جاتے ہیں —

ٹھہر کر، تیز تیز چلتی ہوئی سانسوں کو برابر کرتے ہوئے میں نے دروازے پر دستک دی......

ایک......

دو......

تین...... چار......

میرے ہاتھ کانپ رہے تھے...... ایک دو بار دستک دینے کے بعد بھی دروازہ نہیں کھلا — میں نے تھوڑا انتظار کیا — اور اس کے بعد پھر سے دروازہ کھٹکھٹانا شروع کیا......

دل میں ہزار طرح کے شک اور وسوسے پیدا ہو رہے تھے......

دو تین بار دستک دینے کے بعد کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی پڑی — سانسوں کے چلنے کی رفتار تیز ہو گئی تھی —

کوئی دروازہ کھولنے کی کوشش کر رہا تھا——

پھر دروازہ کھل گیا——

میرے سامنے سارہ کی عمر کی ایک خوبصورت سی لڑکی کھڑی تھی—— شلوار جمپر پہنے ہوئے——سلیقے سے سینے پر آنچل رکھے——اس نے آنچل برابر کیا اور حیرت سے دریافت کیا——

میں کون ہوں اور کس سے ملنے آیا ہوں......؟

'نور محمد......' میرے لفظ گلے میں اٹک گئے تھے——

اسنے غور سے میرا جائزہ لیا——پھر کہا——

'آپ ذرا انتظار کیجئے——میں ابھی آتی ہوں——'

لڑکی کی آواز میں ایک ٹھہراؤ تھا——لباس میں ایک سلیقہ——اور اس کے نین نقش بھی تیکھے تھے——

کون ہوسکتی ہے یہ؟

یہ سوال مجھے پریشان کر رہا تھا...... مجھے لڑکی کے باہر آنے اور جواب کا انتظار تھا—— کچھ لمحے بعد ہی وہ واپس آگئی——اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی——

'اندر آجایئے......'

میں اس کے ساتھ اندر کمرے کی طرف چل پڑا—— یہاں سے ایک سیڑھی اوپر چھت کی جانب گئی تھی——لڑکی نے اشارہ کیا——

'چھت پر ایک ہی کمرہ ہے—— آپ مل لیجئے——میں آپ کے لیے تب تک لسّی تیار کرتی ہوں۔

سیڑھیاں چڑھتا ہوا میں چھت پر آ گیا—— یہاں بہت سی لکڑیاں پڑی تھیں——ایک چھوٹا سا کمرہ تھا، جس میں کوئی دروازہ نہیں تھا۔ چھت پر ٹین کی چھت تھی——اندر ایک چارپائی بچھی ہوئی تھی——ساتھ میں بیٹھنے کے لیے دو کرسیاں بھی پڑی ہوئی تھیں......

اٹھارہ برسوں میں یہ دنیا کتنی بدل گئی تھی۔ زمین کے کنارے ایک طرف چٹائی بچی تھی، جس پر تہہ کیا ہوا جانماز رکھا تھا— پہلے نور محمد نماز کا پابند نہیں تھا لیکن اب شاید نماز کا پابند ہو گیا تھا......اچانک باہر سے کسی پرندے کی منحوس آواز سنائی پڑی......

میں نے پلٹ کر دیکھا—

چھت سے ہو کر بجلی کے تار دور کھمبے تک چلے گئے تھے— میں چونک کر بولا......ارے یہ تو گدھ ہے......

اس وقت بجلی کے تار پر ایک گدھ بیٹھا ہوا تھا— ٹھیک اسی وقت وہ لڑکی ایک ٹرے میں، بڑے سے گلاس میں لسّی لے کر آ گئی......میری آواز شاید اس نے سن لی تھی—

وہ مسکرائی— یہاں بہت گدھ ہیں۔ اکثر دکھائی دیتے ہیں......

اتنا کہہ کر وہ سیڑھیوں سے نیچے اتر گئی—

●●

اچانک میں چونک جاتا ہوں

یہاں بستر پر ایک جسم ہے جو سویا ہوا ہے— میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس بیمار جسم کو دیکھتا ہوں— کیا یہ نور محمد ہے؟ سر کے بال اڑ گئے ہیں۔ داڑھی بڑھی ہوئی۔ منہ کھلا ہوا— آدھے جسم پر چادر پڑی ہے— اور جو چہرہ سامنے ہے اس چہرے میں ۱۸ برسوں کی خوفناک داستان پوشیدہ ہے......لیکن میں اس سے کیا جاننے آیا ہوں—؟

ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے— یہاں سے گاؤں کا سارا منظر دیکھ رہا ہوں— آگے دور پر ایک ندی ہے......ندی کے دونوں طرف چڑھائی والے چھوٹے چھوٹے پہاڑ— دور تک زرخیز اور سپاٹ زمینیں— ندی کے اس طرف لکڑی کا ایک چھوٹا سا پل— لہلہاتی ہوئی فصلیں— ایک بیحد روشن دنیا میرے سامنے ہے......

لیکن یہاں......ایک بیمار جسم پڑا ہے......آنکھوں کے آگے ایک ساتھ کتنی ہی پرچھائیاں گھوم گئیں۔ نادرہ اور نگار کے وجود کے ساتھ ایک سہما سا چہرہ— جو بلند شہر کی کوٹھی چھوڑ کر جا رہا تھا......

وہ جا رہا ہے کوئی شب غم گزار کے......

لیکن یہ غم کی رات بھی کتنی انوکھی تھی— نادرہ کا سہما سا چہرہ آنکھوں میں ابھرتا ہے...... کیوں نہیں چھینا مجھے......؟ جبکہ تم آسانی سے چھین سکتے تھے مجھے......' پھر معصوم سی نگار کی طرف اشارہ......تم اس کا خیال رکھو گے......رکھو گے نا......؟'

نادرہ کا آخری سفر......اور نگار کا اپنے آنسوؤں کے ساتھ بڑا ہونا......

مجھے سب کچھ یاد آ رہا تھا۔ ۱۸ سال پہلے کی اک ایک باتیں زندہ ہوگئی تھیں— پہاڑ گم تھے— اور میں بلند شہر کی یادوں میں کھو گیا تھا— پھر وہ گھبرایا سا نور محمد کا چہرہ......'اب اس میں ایک طلب جاگ گئی ہے؟'

میرے اندر ایک جھنا کا ہوا تھا— تب بھی، اور اس وقت بھی جب میں ان یادوں کو دوبارہ کریدنے کی کوشش کر رہا ہوں— اُس وقت بھی میرے چہرے پر گہرا سناٹا حاوی تھا اور اس وقت بھی چہرہ جیسے ایک بت میں تبدیل ہو گیا ہے......کیا میں نے نگار کا خیال رکھا؟ یا بس اس 'ہونی' کو تسلیم کرتا رہا، جس کی کہانی بے رحم وقت نے تحریر کرنی شروع کی تھی— کیا میں سچ مچ اتنا اپاہج تھا کہ کسی بھی قسم کی کوئی مداخلت نہیں کر سکتا تھا— یا میں سچ مچ نادرہ کو پیار کرتا تھا؟ یا پھر یہ پیار جسم کے حصے میں جاگتی بھوک سے زیادہ نہ تھا۔ اس لیے کہ اگر یہ پیار ہوتا تو نادرہ کے آخری لفظوں کی حرمت برقرار رکھتا— نور محمد کے منع کرنے کے باوجود میں نگار کی خبر رکھتا— قدرت نے اچانک ایک بے حس وجود میں ایک طلب جگا دی تھی— لیکن میں اسے روک تو سکتا تھا؟

اندر ایک بے رحم بارش کی شروعات ہوگئی ہے......عبدالرحمٰن کاردار، تم نے کبھی نگار کو اپنا سمجھا ہی نہیں— تم صرف نادرہ، نادرہ کرتے رہے...... وہ اسی نادرہ کی بیٹی تھی۔ بیمار تھی تو کیا

ہوا— نور محمد بھی تو تھا۔

لیکن نور محمد ایک باپ تھا—!

اور تم......؟

اندر آتش بازیاں چھوٹ رہی ہیں— تم صرف سہل پسندی کے راستے پر چلے کاردار— جہاں محبت ملی وہاں سر جھکایا۔ محبت کی ذمہ داریاں لینے کو تیار نہیں تھے تم۔ یہ کیسی محبت تھی کاردار......؟ تم نے تو کبھی محبت کی ہی نہیں۔ محبت تو نور محمد نے کی— اور ایسی کی کہ نگار کے بے حس وجود میں جاگتی طلب کے لیے بھی ہتھیار ڈال دیے تھے۔ وہ بھیانک چہرہ— جب وہ میرے گھر آیا تھا اور لمبی لمبی سانسیں لے رہا تھا— ہاں، میں نے اس کی طلب پوری کردی—

اور تب— مجھے...... میرے پورے جسم میں ایک بجلی بھر گئی تھی۔ ایک پل کو احساس ہوا، نور محمد کا خون کردوں— میں رشتوں میں الجھ گیا تھا۔ اس وقت بھی نگار سے زیادہ نادرہ ہی میری پلکوں پر حاوی تھی— آسمان جیسے اچانک زردی مائل ہو اٹھا تھا— جسم میں خون کا ایک قطرہ بھی نہیں— جائز، ناجائز اور اخلاقیات کی ساری کہانیاں ایک لمحہ میں کھو گئیں— نور محمد کا برسوں پرانا چہرہ میری آنکھوں کے آگے لہرایا— بھیّا، کوئی راستہ نہیں تھا۔ میں بس اُسے زندہ دیکھنا چاہتا تھا، یہ نہیں ہوتا تو وہ مر جاتی— میں اس کا مرنا برداشت نہیں کرسکتا تھا۔

اخلاقیات کے سارے بت ایک ہی لمحہ چور چور ہو گئے— میں تہذیب کی اس عمارت سے قطعی طور پر نا آشنا تھا۔ کیا قدرت کے انتقام ایسے ہوتے ہیں؟ کیا قدرت ہر بار ہم سے نئے طریقے سے انتقام لیتی ہے۔ اور شاید اسی لیے نور محمد کے بلند شہر سے چلے جانے کے بعد میں نے بھی قدرتی آشیانے یعنی پہاڑوں میں پناہ تلاش کی تھی۔

میں بت میں تبدیل ہو چکا ہوں اور مجھ سے ذرا سے فاصلے پر وہ کھڑا ہے...... وہ...... نور محمد...... وہ اٹھ گیا ہے...... بستر سے اٹھ کر کب وہ میرے قریب آ کر کھڑا ہو گیا، مجھے پتہ بھی نہیں چلا— وہ جھک گیا ہے— اور اس وقت برسوں کا بیمار نظر آ رہا ہے...... اس کے تھرتھراتے ہاتھ مجھے

چھونے کی کوشش کر رہے ہیں...... پھر اس کی آنکھوں میں ایک ہلکی سی چمک نمودار ہوئی......

'بھیّا......'

وہ مجھے چھوکر دیکھنے کی کوشش کر رہا ہے کہ یہ کوئی خواب تو نہیں...... ایک عجیب سی چمک اس کی آنکھوں میں لہرائی ہے۔

ایک ساتھ بہت سے پرندے آسمان پر اُڑتے چلے گئے ہیں......

●●

میں خیالوں کے گہرے سمندر میں ہوں جہاں لہریں مجھے فنا تو کر سکتی ہیں، میری زندگی مجھے واپس نہیں کر سکتیں......

وہ کھانس رہا ہے......

کھوں......کھوں......آنکھیں عجب طرح سے پھیل گئی ہیں۔

کھوں......کھوں......آنکھوں سے پانی کے قطرے گرتے ہیں— مجھے کوئی پرانا قول یاد آتا ہے......سارے انسان برابر ہیں۔ اللہ نے سب کو ایک جیسے حقوق دیئے۔ ایک جیسی زندگی، ایک جیسی خوشی، اور ایک جیسی زندگی......

سانسیں الجھ گئی ہیں— میں اس کا چہرہ دیکھ رہا ہوں۔ عجیب سی الجھن...... جیسے کوئی بات اندر اٹک گئی ہو، جسے نکالنے کے لیے وہ بے چین ہو......اس درمیان وہ لڑکی دو تین بار آئی۔ کبھی پانی دینے کے لیے۔ کبھی چائے کے لیے— ہر بار اسے دیکھتے ہوئے ذہن میں جھناکے ہوتے رہے۔

کون ہے یہ......؟

آنکھوں میں بیمار نگار کا عکس گھوم رہا تھا— میں شدت سے اپنے ہی احساس سے الجھ رہا تھا کہ یقیناً نور محمد نے نگار کا ابارشن تو کرا ہی لیا ہوگا۔ کیونکہ جو کچھ ہوا تھا، میری باتیں اس سچ کی تہہ تک جاتی ہوئی زبردست کشمکش یا اذیت کا شکار ہو جاتی تھیں— اگر نگار کا ابارشن ہو گیا تھا تو پھر یہ

لڑکی......اور یقیناً یہ لڑکی ۱۷۔۱۸ سال کی ایک خوبرو لڑکی تھی۔ تین نقش تیکھے۔ لانبی—اور کہیں سے بھی وہ ایک گاؤں والی نہیں معلوم ہورہی تھی۔ بلکہ اس لڑکی میں ایک رکھ رکھاؤ تھا۔ قرینہ تھا۔

ذہن میں بہت کچھ ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر رہا تھا— میں گہرے صدمے میں تھا۔ جیسے ہر بار قدرت ایک تماشہ دیکھتی ہے اور ہر بار خاموشی سے اپنی تباہیاں بھیج دیتی ہے۔ ہر بار یہ دنیا نئی ہوجاتی ہے۔ یا ہر بار یہ دنیا بدل جاتی ہے۔ خاص کر 9/11 کے حادثے کے بعد تو بالکل ایک نئی دنیا سامنے تھی— شاید ایک صلیبی جنگ تھی— جہاں کارٹون بنائے جارہے تھے— دہشت پسندی کے ہر الزام کے پیچھے مسلمان تھے— اور تہذیبیں اندھیری سرنگ میں گم ہوگئی تھیں—

نور محمد میری طرف دیکھ رہا تھا— اس درمیان وہ اپنی ترنگ میں آنے کی کوشش کررہا تھا—

'بہت بیمار ہوں......' اس کے لہجے کی برف پگھل رہی تھی— اچھا ہوا، آپ آ گئے بھیّا— شاید سانسیں بہت کم بچی ہیں— دیکھ رہے ہیں نا آپ......مر رہا ہوں......'

اس کی آنکھوں میں آنسو تھے......

'نہیں نور محمد— رونا نہیں— تم ہمیشہ سے مضبوط رہے ہو—'

کھوں......کھوں......

اس پر پھر کھانسی کا حملہ ہوا تھا— اس نے اس درمیان خود کو سمیٹ لیا تھا—

'وقت......وقت کو کبھی سمجھ نہیں پایا بھیّا— اور خدا کی حکومت کو— لوگ کیسے کیسے گناہ اور جرم کرتے ہیں اور شان سے جیتے ہیں۔ میرا جرم کیا تھا؟ یا گناہ......؟'

وہ میری طرف دیکھ رہا تھا— اور میری آنکھوں میں البیئر کامو کے مشہور زمانہ ناول دپلیگ کا کردار ڈاکٹر ریو اتر رہا تھا— جو ہیضہ کے پھیلنے کے بعد ایک نومود بچی کو بچانے میں ناکام ہوکر خدا سے پوچھتا ہے۔ اس کا گناہ کیا ہے؟

'کوٹھی کا گھنا اندھیرا— امی پر جنات کا سایہ— ایک محبت بھی راس نہیں آئی مجھے—

کہاں ہے آپ کا خدا بھیّا؟ اگر مرنے کے بعد اس سے ملا تو ضرور پوچھوں گا، بے گناہوں کو ملنے والی سزا کے پیچھے اس کی کیا مصلحت ہوتی ہے......'

اس نے آنسو پوچھے— مسکرانے کی کوشش کی— 'یہ کہانی آپ ہی کی شروع کی ہوئی تھی بھیّا— یاد ہے، اسکول کے زمانے میں ہی آپ مل گئے— پھر زندگی کے ہر چھوٹے بڑے مشورے آپ ہی سے کیے— لیکن آپ......'

اس کا لہجہ بدل گیا تھا— وہ چلاّ رہا تھا— 'آپ نے ایک بار بھی سخت ہوکر یہ کیوں نہیں کہا کہ میں نگار کو مار دوں۔ دنیا کو ایک بیمار وجود سے خالی کردوں— آپ حکم دے سکتے تھے۔ زور دے سکتے تھے۔ یہ گناہ ہوتا مگر میری زندگی...... میں جس عذاب سے گزرتا رہا، وہ دن تو نہیں آتا...... لیکن......نادرہ کا قرض تھا مجھ پر— کیسے مارتا...... مار ہی نہیں سکتا تھا......'

اس نے آنسو پوچھے—

'جس نے کوٹھی خریدی وہ ایک زمانے میں اسی گاؤں اور اسی مکان میں رہتا تھا۔ وہ اپنے خاندان کے ساتھ گاؤں چھوڑ کر شہر میں روزگار کرنا چاہتا تھا۔ اس کے بچے بڑے ہوگئے تھے۔ پڑھ رہے تھے اور گاؤں میں نہیں رہنا چاہتے تھے— اور میں اس حادثہ کے بعد......'

میرے ہونٹ کانپے......'جب نگار حاملہ تھی......'

'ہاں—' نور محمد نے گہری سانس کھینچی— اور میں اس حادثہ کے بعد شہر میں نہیں رہنا چاہتا تھا۔ کسی ایسی جگہ جانا چاہتا تھا۔ جہاں مجھے کوئی نہیں پہچانتا ہو...... پھر میں نے یہ کوٹھی اسے بیچ دی۔ اور گاؤں والی زمین اور یہ گھر خرید لیا— یہ سب اتنی آسانی سے ہوجائے گا، مجھے اس کی امید نہیں تھی۔ لیکن میرے ساتھ شاید قدم قدم پر یہی ہو رہا تھا۔ تقدیر کے ساتھ ساتھ تدبیر کی ضرورت کبھی پیش نہیں آتی تھی۔ ہر جگہ، ہر موڑ پر تقدیر خود ہی ایک نئی راہ سمجھا دیتی تھی۔ بس میں گاؤں آ گیا۔ اور یہاں آنے کے کچھ دنوں بعد— نگار کا ایک نیا چہرہ سامنے تھا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری طرف دیکھتی تھی۔ جیسے مجھ سے باتیں کرنا چاہتی ہو......مگر وہ کیا باتیں کرتی۔ یہاں بھی اس پر لگاتار

دورے پڑتے رہے — وہ حاملہ تھی، اور طبیعت رہ رہ کر خراب ہو جاتی — شروعات میں، میں نے گاؤں والوں سے ہر بات چھپانے کی کوشش کی۔ پھر گاؤں میں خود ہی یہ بات آناً فاناً پھیل گئی کہ میری بیوی پر بھوت کا سایہ ہے......‘

’بیوی؟‘

میں زور سے اچھلا تھا —

’نگار حاملہ تھی — اور کچھ دنوں بعد یہ بات سارے گاؤں والوں کو معلوم ہونی ہی تھی۔ میرے پاس اور کوئی راستہ نہ تھا کہ قدرت کی اس بے رحمی اور سفاکی کے آگے خاموش رہ جاؤں۔ اور میں یہی کر رہا تھا —‘

وہ رو رہا تھا — ’ایک بیٹی، ایک بیوی بن گئی تھی۔ میں کیا کرتا بھیّا — کیسے برداشت کیا ہوگا یہ سب — آپ سوچ سکتے ہیں — آپ نہیں سوچ سکتے۔ یہ عذاب ہے۔ قدرت کا عذاب — اور قدرت نے اس عذاب کے لیے میرا انتخاب کیوں کیا۔ میں بس یہ نہیں جانتا —‘

اس کی آنکھیں خلاء میں دیکھ رہی تھیں۔ کیا کبھی ایسا سوچنا بھی آسان تھا کہ مقدس رشتے یوں تارتار ہو سکتے ہیں؟ اور وہ بھی اس طرح — ایک بیمار نظام — وہ بولتے بولتے ٹھہر گیا تھا — ایک بیمار گھر — کوٹھی کی بے روغن دیواریں — لیکن ایک تہذیب یہاں بھی روشن تھی بھیّا — بلکہ برسوں سے — صدیوں سے — اور ایسی تہذیب کہاں نہیں تھی — تب سوچنے اور سمجھنے کا موقع بھی نہیں ملا کہ میرے ساتھ یہ کیا ہو رہا ہے؟ یا میں کیا کر رہا ہوں — یا جو کر رہا ہوں وہ کس حد تک جائز ہے۔ یا ناجائز — یا جیسے میں سوچنے سمجھنے کی تمام صلاحیت سے باہر نکل آیا تھا۔ ایک کٹھ پتلی — جسے وقت کا فرمان ماننا تھا — اور جو کچھ ہو رہا تھا، اسے آنکھیں بند کر کے تسلیم کرنا تھا — اور میں یہی کرتا رہا — کیونکہ آنے والے وقت کے جبر سے آگاہ نہیں تھا —‘

اس درمیان وہ لڑکی پھر کسی کام سے آ گئی تھی۔ ہمیں گفتگو کرتا ہوا دیکھ کر وہ خاموشی سے لوٹ گئی تھی —

’وقت ایک جابر شہنشاہ کی طرح جب آپ پر چابک برساتا ہے تو آپ کو ہوش آجاتا ہے—اور یقیناً مجھے بھی اچانک ہوش آیا تھا.....‘

نور محمد کی آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں— آپ ابھی تو آئے ہیں— آپ آرام کیجئے بھیّا— اور ہاں کچھ مانگنا ہو تو جینی سے مانگ لیجئے گا— کسی بھی چیز کی ضرورت ہو۔ آج آپ آرام کر لیجئے—‘

نور محمد نے جینی کو آواز دی تھی اور مہمان خانے کی صفائی کرنے کی تاکید بھی— جینی سر ہلا کر واپس لوٹ گئی تھی۔

(۲)

جینی کا تصور مجھے پریشان کر رہا تھا۔ میں چاہتا تو بہت آرام سے نور محمد سے اس کے بارے میں دریافت کر سکتا تھا۔ مگر نہیں جانتا وہ کیا بات تھی، جواب تک مجھے اس کے بارے میں کوئی بھی بات کرنے سے روکے ہوئی تھی۔ کمرے میں آنے کے بعد اور بستر پر لیٹنے تک ایک نئی دنیا کے دروازے میرے لیے کھل گئے تھے۔ ساری دنیا اچانک ایک نئی تبدیلی کی ریس میں شامل ہو گئی تھی۔ یہاں نئے انسان بن رہے تھے۔ امریکہ میں بیٹھا ہوا ڈاکٹر ہندستانی مریض کا وہیں سے علاج کر رہا تھا— سائنس نئے انسان کی تلاش کے بعد اب موت پر فتح پانے کی تیاری کر رہا تھا اور ادھر نئی تکنالوجی، ڈیجیٹل ویڈیو، لیپ ٹاپ میں ایک ولولہ انگیز دنیا نئے نتائج سے دوچار ہو رہی تھی— کیا تہذیب محض مذہب اور جنگ کے درمیان کی چیز ہے—؟ جس کی بنیاد میں مذہب اس پر کنٹرول رکھنے کا کام کرتا ہے—؟ لیکن مذہب انسانی جسم پر کتنا کنٹرول رکھ پاتا ہے؟ تہذیبوں کی تشکیل نو کے ساتھ اس وقت پوری دنیا میرے سامنے تھی اور میں قطعی طور پر یہ ماننے کو تیار نہیں تھا کہ مغرب زدہ سانچے ہماری تہذیبوں کا معیار بھی بدل رہے ہیں۔ دراصل تہذیب جیسی کوئی چیز کبھی تھی ہی نہیں۔ ہاں مذہب کے خوف نے الگ الگ تہذیبی سرنگوں کی بنیادیں ڈال دی تھیں۔ ادھر خوف

کے بادل ہٹے اور ادھر تہذیبوں کے پل ٹوٹنے شروع۔

مذہب کے احترام کے باوجود نور محمد ایک ایسے راستے پر چلا جہاں اس کی کوئی غلطی نہیں تھی۔ مجبوری تھی— مگر جیسے برسوں سے، صدیوں سے قدرت اس بیمار نظام کو دیکھ رہی تھی۔ اس لیے ہر بار قدرت انتقام کے طور پر ایک تہذیبی دنیا کو تباہ کر ڈالتی ہے اور پھر ایک نئی تہذیب کی شروعات ہو جاتی ہے۔

مگر— جینی کون ہے؟

کاردار، کیا تم جینی کو جانتے ہو؟

افسوس— تم ڈر رہے ہو کاردار...... تم پوچھو تو سہی۔ جینی ہے کون— ممکن ہے تم جو بھی سوچ رہے ہو، تمہارا وہم ہو— جینی کوئی اور ہو...... تم اس سے ڈر رہے ہو کاردار...... تم اس سے بچنے کی کوشش کر رہے ہو۔ یہاں تک کہ نگاہیں ملانے سے بھی گھبرا رہے ہو۔ اگر ایسا ہے تو اسی سے پوچھ کیوں نہیں لیتے اس کی اصلیت۔

ایک بار پھر وہی نگاڑے زور زور سے ذہن میں بجنے شروع ہو گئے۔

مجھے پروفیسر نیلے یاد آ رہے تھے۔ جو کہا کرتے تھے— مختلف جہتوں میں سفر کرتی ہوئی یہ دنیا اب بڑی دنیا اور چھوٹی دنیا کے تصور سے آزاد ہو چکی ہے۔ اب مستقبل کی بات بیکار ہے۔ کیونکہ مستقبل ایک گہرے اندھیرے یا اندیشے میں چھپ گیا ہے۔ یہ ان کے لیے بھی نہیں جو اس کا تحفظ چاہتے ہیں۔ ان کے لیے بھی نہیں جو اسے برباد کر رہے ہیں۔

ایک گہری دھند مجھے گھیر رہی تھی—

اور سچ یہ ہے کہ مجھے آنے والی صبح کا انتظار تھا۔ میں نور محمد کے ہونٹوں سے ان سچائیوں کو جاننے کا خواہشمند تھا جو پچھلے اٹھارہ برسوں سے مجھے مسلسل پریشان کیے جا رہے تھے۔

●●

علی الصباح نیند کھلی تو جینی چائے رکھ کر جا چکی تھی۔ چائے لے کر میں چھت پر آیا تو نور محمد کو بے چینی کے عالم میں ٹہلتا ہوا پایا— جینی بھی میرے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی چھت پر آ گئی تھی۔

'کھیت پر نہیں چلنا کیا؟'

'نہیں— تم جاؤ— اور ہاں چندو کو بولو— وہ جانوروں کو چارہ کھلا دے گا—'

'جیسے چارہ وہی بناتا اور کھلاتا ہے— میں کھلا دوں گی بس—'

اس کے بولنے اور ہنسنے کے انداز پر میں ایک دم سے چونک گیا تھا— نور محمد نے مجھے دیکھ لیا تھا— باہر ایک کرسی پڑی تھی— اندر والے کمرے سے وہ ایک اور کرسی لے آیا۔ کھیت، چارہ یہ سب میرے لیے نئے جملے تھے۔ میں نور محمد کو اس نئے رنگ میں دیکھنا چاہتا تھا— مگر جیسے ایک رات میں اس کے چہرے کی جھرّیوں میں اضافہ ہو گیا تھا۔ چہرہ گمبھیر— اور وہ ذرا سا لنگڑا بھی رہا تھا— اس نے اشارے میں بتایا، کل گر گیا تھا— ذرا سی چوٹ آ گئی ہے—

صبح ہو گئی تھی— کھیتوں کی کیاریوں کے بیچ بھاگتی ہوئی جینی مجھے دکھائی دے رہی تھی......مگر میری آنکھیں مسلسل نور محمد کے چہرے کا تعاقب کر رہی تھیں— ایسا لگ رہا تھا، جیسے یہ آنکھیں کہہ رہی ہوں— ایک دن ہماری یہ تہذیب بھی قصہ پارینہ بن جائے گی— چاروں طرف سرد جنگیں ہیں۔ تنازعات ہیں— ثقافتیں اور مذہب دھند میں اتر گئے— اور میں بھی اُتر گیا بھیّا— گہری دھند ہے۔

تم نے کچھ کیا—؟ میں ایک دم سے چونکا—

اس کی آنکھیں اب بھی خلاء میں دیکھ رہی تھیں— مجھے محسوس ہوا، وہ آنکھیں جھکائے مجھ سے مخاطب ہو— 'اس سرمایہ دارانہ نظام یا Free market economy میں کچھ نہیں بچا— میں بچا ہوں۔ اس تہذیب کا آخری آدمی— جو اس وقت ایک آزاد بازار میں بہت سے لوگوں کے ساتھ ننگا کھڑا ہے—'

ہوا تیز ہو گئی تھی۔

نور محمد کو کھانسی کا شدید دورہ پڑا تھا—

کھوں......کھوں......کھوں—

چہرہ لال بھبوکا ہو گیا تھا۔

کھوں......کھوں......

اس نے مجھے اشارہ کیا کہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ کرتے کی جیب سے رومال نکال کر اس نے چہرہ صاف کیا— پھر میری طرف مڑا—

'اب ٹھیک ہے بھیّا—' یہ کہتے ہوئے ایک بار پھر وہ ماضی کی سرنگ میں اترنے کے لیے تیار تھا— اس کی آنکھیں پھیل گئی تھیں...... اس طرح کہ مجھے وہ بند بند دکھائی دیں— اُس کے ہونٹ لرز رہے تھے......

'میں گاؤں آ گیا۔ یہاں دنیا دوسری تھی— شہر سے بالکل بدلی ہوئی دنیا— میں نے سب سوچ لیا تھا— گاؤں آتے ہی مجھے گاؤں والوں کا ساتھ بھی ملنے لگا— لیکن ضروری تھا تو نگار کو بچا کے رکھنا۔ نگار کو گاؤں والوں کی نگاہ سے چھپا کے رکھنا آسان کام نہیں تھا— مجھے اس میں دشواری پیش آئی۔ کچھ سختی سے بھی کام لینا پڑا— پھر نگار کو لے کر افواہوں کا بازار بھی گرم ہوا کہ اس پر سایہ ہے— ایک بار گاؤں کی ایک عورت زبردستی اندر آ گئی تھی— اور نگار اسے دیکھ کر اس قدر زور زور سے رونے لگی کہ وہ الٹے پاؤں بھاگی۔ نگار پر اب بھی رہ رہ کر دورے پڑتے تھے— مگر اس عورت کے آنے کے بعد جانے کیسے یہ بات مشہور ہو گئی کہ ملاّ جی نے ایک غریب بیمار لڑکی کو آسرا دیا ہے— عمر میں چھوٹی ہے تو کیا، ایسی لڑکی سے بھلا شادی کون کرے گا......

نور محمد کی آنکھوں میں آنسو تھے— 'میں کس کے پاس جاتا...... کسے سمجھاتا کہ یہ میری نادرہ کی معصوم سی جان ہے— یہ آوازیں مجھے پاگل کرتی ہیں۔ سارے بدن میں زہر اُتر جاتا۔ مگر آہستہ آہستہ جیسے ان خبروں کا میں عادی ہو گیا— میں ملاّ جی تھا— اور کب مذہب کے دروازے میرے لیے کھل گئے پتہ بھی نہیں چلا۔ اکثر رات گئے نگار کی طلب بڑھ جاتی۔ میں غصے میں دھکّا

دیتا تو وہ پاگلوں کی طرح مجھ پر جھپٹ پڑتی۔ میں روتا — ہاتھ جوڑتا — تو وہ جنون کی حالت میں کپڑے پھینک کر مجھے وہ سب کرنے پر مجبور کرتی، جسے احساس گناہ اور احساسِ جرم کے ساتھ میں نے صرف اس کی زندگی کے لیے قبول کر لیا تھا —

نور محمد رو رہا تھا — 'میں مذہب، اخلاقیات اور نفسیات کی کتابوں سے واقف نہیں — لیکن میں اس اخلاقیات سے ضرور واقف تھا جو رشتوں اور رشتوں کی اہمیت کو لے کر بچپن سے، سلیقے کے ساتھ ہمارے جسم میں رکھ دیئے جاتے ہیں۔ بھائی، بہن، ماں...... بیوی — محبوبہ — ہر رشتے کی اپنی اہمیت — مگر یہاں۔ رات گئے جیسے سانپ کے پھنکارنے کی آواز ہوتی تھی اور نگار کی خطرناک طلب — اور ایسے میں — شاید اس لمحے میرے لیے یہ بھول جانا ہوتا تھا کہ یہ جسم نگار کا ہے — میں آنکھیں بند کر لیتا۔ اور نادرہ کو محسوس کرتا — اور نادرہ کے احساس کے ساتھ ہی میرے جسم میں انگارے جمع ہو جانا شروع ہو جاتے — اور یقیناً سرد ہوتے ہوئے، سانپ سے خرگوش بنتے ہی وہی احساسِ گناہ مجھ پر حاوی ہو جاتا — میں پاگلوں کی طرح کمرے میں ٹہلتا...... دعائیں مانگتا — گڑگڑاتا — یہاں سے کچھ دور پر ایک مسجد ہے۔ زیادہ پریشان ہوتا تو کئی کئی بار رات میں اٹھ کر مسجد چلا جاتا — مگر......

کھوں...... کھوں...... کھوں......

اُس پر ایک بار پھر کھانسی کا شاید حملہ ہوا تھا — ابھی بھی بہت سی باتیں ایسی تھیں جو جاننے سے رہ گئی تھیں۔ لیکن اس وقت اُسے آرام کی ضرورت تھی —

اس درمیان جینی کھیت سے لوٹ آئی تھی —

(۳)

یہ پہلا موقع تھا جب میں نے چندو میاں کو دیکھا تھا، وہ نور محمد سے ٹیوب ویل کے کام نہ کرنے کی شکایت کرنے آئے تھے — لمبا قد، گندمی رنگ۔ نور محمد سے پانچ سال ہی عمر میں کم ہوں

گے مگر جسم سے مضبوط— جینی، چندو میاں سے گھلی ملی تھی اور میں نے چندو میاں کو ایک شفیق بزرگ کی طرح جینی کو سمجھاتے ہوئے پایا تھا۔

نہیں بیٹا— ایسے نہیں دوڑتے—

یا پھر— 'میں کھیت پر ہوں— تب تک آپ کچھ پڑھ لکھ لیجئے۔'

نور محمد چندو میاں کو ہدایت دینے کے بعد مجھے لے کر دالان والے کمرے میں آ گئے— ہم کرسیوں پر بیٹھ گئے— اس نے کرتا اور لنگی پہن رکھی تھی۔ داڑھی بڑھی ہوئی— اور چہرے سے برسوں کا بیمار نظر آ رہا تھا۔ اس درمیان کھانسی کا حملہ کئی بار ہوا اور جب بھی کھانسی آتی اس کا چہرہ لال سرخ ہو جاتا......

کرسی پر بیٹھنے کے بعد وہ دیر تک نظر نیچی کیے کچھ سوچتا رہا—

'چندو میاں، جینی کو بیٹی کی طرح مانتے ہیں۔ مگر ہیں تو پرائے— یہاں کوئی اپنا نہیں— اور میں......قبر میں پاؤں پھیلائے......اس نے مجھے اشارے سے روک دیا تھا...... میں جانتا ہوں میرے پاس بہت کم عمر بچی ہے۔ مرنے کا غم نہیں ہے مجھے مگر جینی کی فکر کھائے جا رہی ہے۔ جینی کا کیا ہوگا میرے بعد......؟

اس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا— 'گاؤں کی ہوا راس آ گئی ہے— لیکن ہے تو اکیلی— میں اس بے رحم زندگی کی جنگ میں اسے اکیلا نہیں چھوڑنا چاہتا— اُس نے اچانک جھک کر میرے ہاتھوں کو تھام لیا تھا—

بھیّا— بس اسی لیے آپ کو خط لکھا— کون ہے آپ کے سوا میرا— اور میں......؟ کس امید پر بلند شہر کے رشتہ داروں سے ملنے جاتا— انہیں کیا بتاتا— جینی کو بھی کچھ نہیں معلوم...... آپ سمجھ رہے ہیں نا بھیّا—

میرے اندر نگاڑوں کی گونج شروع ہو گئی تھی......

ڈرم......ڈرم......

'تو جینی......؟' میری سانس ٹوٹ رہی تھیں— 'تمہاری بیٹی ہے......؟' نگار کی......؟

'ہاں.....' اُس پر کھانسی کا دورہ پڑا تھا— 'بے رحم حقیقت— لیکن اسے تسلیم کرنا ہی ہے بھائی— میری بیٹی— لیکن قدرت کا ظلم کہ اس کی ماں بھی میری بیٹی تھی.....' وہ رو رہا تھا...... قدرت کا انتقام......اور یہی تو جاننا ہے مجھے کہ اس انتقام کے لیے خدا نے میرا انتخاب ہی کیوں کیا.....کھوں......کھوں......'

میں شاید پہلی بار ہی دروازے پر جینی کو دیکھ کر جان گیا تھا کہ ہو نہ ہو جینی نگار کی بیٹی ہے— مگر جان بوجھ کر خود کو اس بے رحم سوال سے دور رکھتا آیا تھا— مگر اب حقیقت صاف ہوگئی تھی اور میرے جسم میں ایک ساتھ ہزاروں کی تعداد میں پٹاخے چھوٹنے لگے تھے۔

'کیا جینی اس سچائی کو جانتی ہے؟'

'نہیں— وہ یہ جانتی ہے کہ اس کی ماں ایک بیمار عورت تھی اور وہ اُسے پیدا کرنے کے دو سال بعد ہی انتقال کرگئی—'

'کیا وہ ماں کے بارے میں کچھ بھی جاننے کی کوشش نہیں کرتی؟'

'کرتی ہے— پہلے تو پاگلوں کی طرح اصرار کرتی تھی۔ مگر میں اسے کیا بتاتا بھیّا......کس طرح بتاتا— یہ نام نگار......میرے جسم کو پتھر کر دیتا ہے— ہوش ہی نہیں رہتا— میں اس نام سے دور بھاگنا چاہتا ہوں— سننا ہی نہیں چاہتا— اس نام کے ساتھ ہی میرے پورے وجود میں ایک زلزلہ آجاتا ہے......کھوں......کھوں......

وہ ایک بار پھر ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کر کھانس رہا تھا— آنکھیں باہر نکل آئی تھیں......اس نے لڑکھڑاتے ہوئے میرے ہاتھوں کو تھام لیا—

'مجھے کچھ ہوگیا تو میری جینی کی حفاظت کروگے نا بھیّا— بس مجھے ہاں کہہ دو— پھر میں آرام سے مرسکوں گا......'

'ہاں'— میں نے مضبوطی سے نور محمد کے ہاتھوں پر ہاتھ رکھا— میری آنکھوں میں نادرہ کا

چہرہ ابھر رہا تھا — کہیں ایک قرض تھا مجھ پر — ایک محبت کا قرض — شاید پہاڑ میرے لیے فرار کا ایک راستہ تھا۔ یہ قرض مجھے پریشان کر رہا تھا۔

اور اب جینی کو ساتھ رکھ کر میں اس قرض کو کسی حد تک کم کر سکتا تھا۔ میری آنکھوں میں آنسو تھے۔ آواز لرز رہی تھی۔

’نور محمد — کچھ بے رحم سچائیوں نے ہم دونوں کو ایک ہی راستہ کا مسافر بنا دیا تھا — تم پیار نبھاتے ہوئے جرم کا احساس کرتے رہے اور میں نہ نبھاتے ہوئے جرم کے احساس میں شامل رہا — ‘ میں نے پلٹ کر نور محمد کی طرف دیکھا — لیکن نگار...... اُس کی موت کیسے ہوئی — ؟‘

نور محمد کی آنکھیں گہری دھند میں اُتر گئی تھیں — ’نگار زندہ بھی رہے گی، یہ کون کہہ سکتا تھا مگر اللہ کا کرشمہ — جس نے ایک بے جان بت میں قدرتی طلب بھی پیدا کر دی اور وہ ایک بچی کی ماں بھی بن گئی — وہ منظر اب بھی آنکھوں میں ہے جب ہم اسے اسپتال لے گئے تھے — اور یہی سب وہ باتیں ہوتی ہیں جب ہم اس کے معجزے کے آگے سر جھکا دیتے ہیں — ‘

’اس کی آنکھیں جھکی تھیں — ’پھر جینی آ گئی — وہ اپنی بچی کو ایک ٹک دیکھا کرتی تھی...... کبھی کبھی ہاتھوں سے میری طرف اشارہ کرتی — کبھی کبھی دوبارہ چیخ کر رونا شروع کر دیتی۔ مجھے اس بات کا بھی ڈر تھا کہ کہیں انجانے میں وہ جینی کو اپنے پاگل پن کا شکار نہ بنا دے — اور ایک بار...... میں نے اسے جینی کو دودھ پلاتے ہوئے بھی دیکھا تھا — وہ خوش تھی...... ایک پاگل لڑکی میں قدرت ایسے معجزے کیسے رکھ دیتی ہے بھیّا؟ اسے کون بتاتا ہے کہ یہاں سینے میں جو دودھ اتر رہا ہے وہ اسی بچے کے لیے ہے؟ — قدرت — جو سفاک بھی ہے اور رحم دل بھی...... پھر وہ وہ بیمار رہنے لگی — یا اس پر دورے کچھ زیادہ ہی پڑنے لگے...... کھوں...... کھوں......‘

نور محمد نے اشارے سے مجھے روکا...... کچھ لمحے کے لیے ٹھہرے — جانے کیوں مجھے محسوس ہوتا تھا کہ قدرت نے چپکے سے جینی کو لے کر ہماری سچائی بھی اس سے بیان کر دی ہے — ممکن ہے میں غلط ثابت ہو جاؤں مگر میرا قیاس ہے کہ جینی کی پیدائش کے کچھ ہی دنوں بعد وہ مجھ سے

نفرت کرنے لگی تھی— مجھے دیکھتے ہی وہ مجھے مارنے کو آگے بڑھتی یا جو بھی چیز سامنے نظر آتی اسے اٹھا کر مجھ پر پھینک دیتی— یہ کیا تھا؟ اگر یہ نفرت تھی تو کیوں تھی—؟ اور اس نفرت کو کس نے اس کے اندر پیدا کیا تھا۔

اس نے سر جھکا لیا— 'بس، اس کے بعد کہانی زیادہ نہیں ہے۔ جینی کی پیدائش کے دو سال کے اندر ہی وہ نادرہ کے پاس چلی گئی اور مجھے ایک نئی آزمائش میں ڈال گئی— ویسے بھی وہ زندہ رہتی تب بھی جینی کی ذمہ داری تو مجھے ہی ادا کرنی ہوتی...... وہ رو رہا تھا— جینی کیا لگتی ہے میری۔ بیٹی......؟ تو پھر نگار کیا تھی......؟ نگار اگر نادرہ کی بیٹی تھی تو......

'بس نور محمد......' میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا— کچھ رشتے انجانے ہوتے ہیں۔ زیادہ کریدو گے تو ہاتھ جل جائیں گے— بس سوچنا بند کرو— دنیا کے سارے رشتے اپنے ہیں اور ہر رشتے میں ایک احساس سانس لے رہا ہے۔ کچھ رشتوں کی تعریف ہم انسانوں نے ہی گڑھی ہے اور کبھی قدرت اس تعریف کو ایک تجربے کے تحت اُلٹ دیتی ہے—'

میں نے اس کے ہاتھوں پر اپنا ہاتھ رکھا— 'سوچو مت— تمہارا سارا خوف اسی سوچ کو لے کر ہے۔ تہذیبیں اپنی عمارت کا بوجھ خود اٹھاتی ہیں نور محمد— اور ہاں......اب دیکھنا تم بہت جلد اچھے ہو جاؤ گے......'

اس درمیان کسی کے دوڑنے کی آواز آئی تھی۔

نور محمد کے ساتھ میں نے بھی پلٹ کے دیکھا—

جینی دوڑتی اور ہانپتی ہوئی یہ خبر لے کر آئی تھی کہ کھیت والے کنویں میں ایک بچہ گر گیا ہے اور چندو میاں بالٹی لے کر کنویں میں اُتر گئے ہیں۔

میری آنکھوں کے آگے سناٹا چھا چکا تھا—

جینی جا چکی ہے۔ کچھ سوچتا ہوا میں نور محمد کی طرف دیکھتا ہوں۔

یہاں گاؤں میں ڈاکٹر ہوتے ہیں—؟

’ہاں بھیّا— کیوں......؟‘

’کیونکہ تمہیں ڈاکٹر کو دکھانا ہے— تمہیں اور کوئی مرض نہیں ہے۔ کھانسی ٹھیک ہو جائے گی تو تم بھی ٹھیک ہو جاؤ گے—‘ میں اس کے ہاتھوں پر پیار سے اپنا ہاتھ رکھتا ہوں— ’اور ہاں— جینی میری پوتی سارہ کی طرح ہے۔ اسے جب بھی میرے پاس بھیجنا چاہو، بھیج سکتے ہو— مگر سب سے پہلے تمہارا علاج ضروری ہے۔

●●

ایک بے رحم اور سفاک کہانی نے اپنے پنکھ سمیٹ لیے تھے— اسی دن دوپہر میں، میں اسے لے کر گاؤں کے ڈاکٹر سے ملا۔ وہ ایک شہری نوجوان ڈاکٹر تھا۔ ڈاکٹر نے کچھ ٹیسٹ کرانے کے لیے کہے...... دراصل مسلسل کھانسی کی وجہ سے ڈاکٹر کو اس بات کا بھی شک تھا کہ نور محمد کو ٹی بی ہو سکتی ہے— اگر ایسا ہے تب بھی گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ کیوں کہ اب باقاعدہ علاج ہے اور دوائیاں ہیں— نور محمد کے ساتھ میں بھی ڈاکٹر سے مل کر مطمئن تھا اور یہ وہ لمحہ تھا، جب اچانک وہ مجھے بدلا ہوا نظر آیا— شاید ۱۸ برسوں کے واقعات کی کینچلی اتار کر وہ خود کو بہت ہلکا کر چکا تھا—

مگر شاید میں یونہی چلا جاتا تو مجھے افسوس ہوتا۔ کیونکہ ابھی ایک ایسا منظر باقی تھا جو شاید میں خواب میں بھی نہیں سوچ سکتا تھا۔

صدیوں میں بنتی اور لمحوں میں اجڑتی تہذیب کیا ہمیشہ اپنے لیے کوئی نیا راستہ تلاش کر لیتی ہے—؟

یا اجڑتے، تباہ ہوتے ہوئے ہر بار نئے سرے سے بسنے کی کوشش کرتی ہے—؟

اس کا جواب مجھے دوسرے دن صبح ہی صبح مل گیا تھا۔ نور محمد کی طبیعت ٹھیک تھی اور وہ صبح ہی صبح جینی کے ساتھ کھیت پر چلا گیا تھا۔

(۴)

جینی......جینی۔

آواز ہوا میں لہراتی ہوئی گونج رہی تھی......

'جینی کہاں ہو......ٹیوب ویل سے پانی کیوں نہیں آرہا ہے......؟

'آئے گا کیسے......؟ ایک نقرئی، کھنکتی ہوئی ہنسی مجھے سنائی دی...... چارا کاٹنے والی مشین کے پاس جینی کھڑی تھی۔ گھاس کے چھوٹے چھوٹے حصے بنا کر بھینس کو کھلاتی ہوئی—

علی الصباح گاؤں کی خوبصورتی دیکھنے کے لائق ہوتی ہے۔ جب میں سوکر اٹھا تو جینی اور نور محمد دونوں غائب تھے۔ میں ان دونوں کے تعاقب میں نیچے آ گیا۔ جانے سے قبل ان کی نئی زندگی کے حال اپنی آنکھوں سے دیکھنے کا خواہشمند تھا۔ برامدے سے ملحق کھیت میں فصلیں لہلہا رہی تھیں— اور یہیں دائیں طرف چارہ کاٹنے کی مشین کے ساتھ دو تین بھینسیں اور گائیں بندھی تھیں...... میں نے نور محمد کے چلانے کی آواز بھی سنی اور جینی کے ہنسنے کی آواز بھی— اس لمحے نادرہ اور نگار کہیں دور کھو گئے تھے—

بھینس کے آگے چارہ رکھنے کے بعد میں نے جینی کے الہڑ، گاؤں کے حسن کو قریب سے محسوس کیا تھا۔ وہ لہراتی ہوئی ٹیوب ویل چلانے کے لیے بھاگ کھڑی ہوئی۔ اس درمیان میں اس نے صرف ایک بار میری طرف دیکھا—

'بابا بھی نا...... پریشان کر دیتے ہیں اب......'

کھیت میں فصلوں کے درمیان مریٹھا باندھے نور محمد کو دیکھنا میرے لیے ایک انکشاف تھا۔ اس چہرے سے تو میں واقف ہی نہیں تھا...... اور شاید کل کے نور محمد کو دیکھنے کے بعد میں چلا گیا ہوتا تو میرے اب تک کے سارے اندازے غلط ثابت ہوتے—

ولاس پور کے آسمان پر سورج طلوع ہو چکا تھا— نیلے آسمان میں پرندوں کے جھنڈ کے جھنڈ پرواز کرتے ہوئے ایک جگہ سے دوسری جگہ جا رہے تھے— لہلہاتی فصلوں کے درمیان میں

نے بجوکا کو بھی دیکھا — اور احساس ہوا، یہ کل والا نور محمد ہے — حیران پریشان، سہما ہوا۔ ہر بار دکھ کی ایک نئی فصل کے ساتھ میرے سامنے — لیکن یہ نور محمد......

مولانا روم کی بانسری کی آواز میرے کانوں میں آہستہ آہستہ گونج رہی تھی۔

ہر نفس نو می شود دنیا و ما......

ہر آن ایک نئی دنیا تعمیر ہو رہی ہے...... ہر آن ایک دنیا بن رہی ہے۔ نور محمد نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ وہ زور زور سے ہاتھ ہلاتا ہوا، جینی پر برس رہا تھا۔

'آج پھر تم نے اٹھنے میں دیر کی......؟ جانور کو چارہ کھلا دیا؟ اور......؟'

وہ مسکرا کر گردن ہلا کر میری طرف دیکھ رہی تھی۔ پہلے ٹیوب ویل کھولو...... اور اب چارہ کھلا دیا......؟ بابا تو بھلکڑ ہیں۔ ایک کام دے کر دوسرا کام ہی بھول جاتے ہیں۔'

آج پہلی بار وہ اس قدر کھل کر مجھ سے بات کر رہی تھی۔

'مجھے بابا نے سب بتا دیا — بابا آپ کو بھیّا کہتے تھے۔ ابھی آپ رہیں گے نا انکل......؟

نٹ کھٹ سی نادرہ میری آنکھوں کے سامنے تھی۔ بلند حویلی میں ادھر اُدھر ناچتی ہوئی...... چھوٹے چھوٹے ننھے منے پاؤں سے سیڑھیاں چڑھتی ہوئی......

'نہیں بیٹا مجھے واپس لوٹنا ہے...... آج ہی لوٹ جاؤں گا۔ مگر ہاں تمہارے بابا سے بہت ساری باتیں کرنی ہیں......'

صبح کے تازہ تازہ لسّی کے گلاس کے بعد...... نور محمد پھر میرے سامنے تھا۔ اس بار مریٹھا سر سے نکال کر اس نے کندھے پر رکھ لیا تھا — اس کی آنکھوں میں سوال تھے......

'چاہتا تھا کہ میری یہ زندگی بھی آپ دیکھیں — ۱۸ سال — ۱۸ سال میں ایک دنیا بدل جاتی ہے بھیّا۔ شہر کا آدمی گاؤں آ گیا — اور میری پوری دنیا بدل گئی — تہذیب بھی......'

وہ نظریں چرا رہا تھا......

اکثر خیال آتا ہے جینی کو سب کچھ سچ سچ بتا دوں۔ پھر ڈر جاتا ہوں۔ کیا بتاؤں گا اسے۔ نادرہ......نگار...... مجھ سے وابستہ یہ خوفناک کہانی...... یہ خوفناک حقیقت—— آج اتنے برسوں بعد سوچتا ہوں تو یقین نہیں آتا کہ یہ سب میرے ساتھ گزر چکا ہے......'

میں آہستہ آہستہ اس کے کندھے تھپتھپاتا ہوں—— بجو کا کے سر کے پاس سے اڑتا ہوا، کاؤں کاؤں کرتا ایک کوّا گزر گیا ہے۔

'دیکھو...... آج تم ہلکے لگ رہے ہو۔ کہیں سے بھی بیمار نظر نہیں آ رہے۔ ہر نفس...... نومی شودد نیاو ما......' میں اس کی آنکھوں میں جھانکتا ہوں—— اتیت یا ماضی یاد رکھنے کے لیے نہیں ہوتا نور محمد—— سب بھول جاؤ—— بلند شہر اور وہاں کی یادوں سے دور نکل کر تم اپنی ایک نئی بستی، نئی دنیا، ایک نئی تہذیب آباد کر چکے ہو...... اس تہذیب میں پرانی تہذیب گھولنے کی حماقت بھی نہ کرنا...... یہ جینی تمہاری بیٹی ہے...... بس—— اتنا ہی یاد رکھنا...... جنگوں کے بعد اکثر ایک نئی تہذیب کی شروعات ہوتی ہے۔ اور ایسی ہی ایک شروعات تمہارے ساتھ بھی ہوئی ہے......

میں جینی کی طرف مڑتا ہوں......

یہ تمہارے بابا کو اتنی گھنی داڑھی رکھنے کے لیے کس نے کہا جینی......؟

وہ زور سے ہنس پڑی—— آپ ہی سمجھائیے انکل—— اس داڑھی میں میرے بابا نہیں دادا لگتے ہیں۔

'اس کے بال اور داڑھی آج ذرا سلیقے سے صاف کرو......'

نور محمد مسکراتی آنکھوں سے میری طرف دیکھ رہا ہے......

میں اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتا ہوں۔

'پریشان مت ہونا—— اب سب ٹھیک ہے...... میں نے دوبارہ اس لفظ کو دہرایا—— سمجھے۔ اب سب ٹھیک ہے—— اور ہاں۔ ڈاکٹر کے پاس چلے جانا۔ دوا ضرور کھانا...... ایک بات اور...... تم پہاڑوں پر آ سکتے ہو۔ وہاں تمہیں کوئی نہیں جانتا اور آنا تو...... جینی کو بھی لے کر آنا......

بڈھے...... ابھی مجھ سے زیادہ زندہ رہو گے تم...... اور اگر کبھی ایسی ضرورت پڑی تو...... جینی کو میرے پاس بھیج دینا۔

ایک لمحے کے لیے میری آنکھیں نم ہوگئی تھیں۔ مجھے نادرہ کی یاد آگئی تھی — اور اس یاد میں جنگلی اسٹرابیری کی خوشبو موجود تھی۔

سورج کا گولا آگ برسا رہا تھا —

دوپہر ہوگئی تھا —

میں نے دونوں سے اجازت مانگ لی......

کھیت کی میڑوں سے نکل کر آگے بڑھتے ہوئے میں پلٹ کر دیکھتا ہوں۔ نور محمد اور جینی دونوں اب تک ہاتھ ہلا رہے ہیں......

میں مسکرا رہا تھا — تہذیبیں ہر بار اپنے بھیس بدل دیتی ہیں...... کبھی بھیانک سطح پر اور کبھی......

هر نفس نومی شود دنیا و ما......

هر آن ایك نئی دنیا تعمیر هو رهی هے —!

●●

اردودوست لائبریری

اردودوست ڈاٹ کوم
www.urdudost.com

یہ کتاب اپنے کسی دوست یار رشتے دار کو
ای میل کیجئے